یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔



منجانب۔

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

۷۸۶

۹۲-۱۱۰

یا صاحب الزماں ادرکنیؑ

یا عباسؑ

DvD Version

لبیک یا حُسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس

رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

Knowledge for All
SABIL-E-SAKINA

SABIL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com

نور ولایت

مرتبہ

حجۃ الاسلام مولانا محمد علی فاضل



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نورِ ولایت

حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ محمد علی فاضل مدظلہ
پرنسپل: جامعہ امام جعفر صادق علیہ السلام (رجسٹرڈ) راجن پور

ناشر
فاضل برادرز پبلی کیشنز
پوسٹ بکس نمبر 5179 ماڈل ٹاؤن لاہور پاکستان، فون: 0333-4754975

تعارف کتاب

نام کتاب : نورِ ولایت

مصنفین : ا۔حضرت آیۃ اللہ مصباح یزدی دامت برکاتہ

: ۲۔جارج جرداق لبنانی

: ۳۔عباس علی کامرانیان

: ۴۔شیخ محمد محمدیان

مرتبہ : حجۃ الاسلام علامہ شیخ محمد علی فاضل مدظلہ

کمپوزنگ : شیخ علی رضا فاضل: 0333-4754975

ملنے کا پتہ : ا:فاضل برادرز پوسٹ بکس نمبر **5179** ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: 0333-4754975

۲:افتخار بکڈ پو مین بازار اسلام پورہ لاہور

۳:خراسان بک سنٹر سنیعہ آرکیڈ سولجر بازار کراچی

ہدیہ : -/200 روپے

ناشر

فاضل برادرز پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر 5179 ماڈل ٹاؤن لاہور پاکستان، فون: 0333-4754975

حسن ترتیب

○ ۵۔ سیکولرازم کا نقطہ آغاز

○ ۷۔ حضرت علی علیہ السلام سے مخالفت کے اسباب

○ ۸۔ علی علیہ السلام کا طرز حکومت

علی علیہ السلام کی مخالفت کے تین عناصر

۱

ولایت امیر المومنین علی علیہ السلام

حضرت امیر علیہ السلام کے مختلف فضائل

اگر چہ علی بن ابی طالب علیہ السلام جیسی عظیم المرتبت شخصیت کے بارے میں گفتگو نہایت ہی دشوار کام ہے، لیکن ہم اپنی بساط کے مطابق "خلیفۃ اللہ" کے نمونہ کامل کی زندگی کے بعض گوشوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں گے تاکہ اس طرح سے ہم خود اپنی معلومات میں اضافہ کرسکیں۔ آنجناب ؑ کے اس قدر فضائل ومناقب ہیں کہ جب کسی بزرگوار شخصیت سے اس بارے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"میں اس شخص کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں کہ جس کے فضائل حسد اور کینہ کی وجہ سے دشمنوں نے اور اپنی جان کے خوف کی بنا پر دوستوں نے چھپائے، لیکن پھر بھی اس قدر زیادہ فضائل ہیں کہ یہ دنیا ان کیلئے ناکافی ہے"۔

اس قول کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ: "یا علیؑ!

کتاب فضل تورا آب بحر کافی نیست | کہ ترکنم سرانگشت وصفحہ بشمارم

آپ کی فضیلت کی کتاب کیلئے سمندر کا پانی بھی ناکافی ہے کہ اس کے صفحے شمار کرنے کیلئے میں انگلی کو تر کروں اور صفحوں کو شمار کروں۔

آنجناب ؑ کے فضائل اس قدر ہیں کہ صرف آپ کے ماننے والوں یعنی شیعوں ہی نے ان کے بارے میں بحث وتفصیل سے کام نہیں لیا بلکہ مختلف ادیان ومذاہب کے پیروکاروں نے بھی دل کھول کر اس بارے میں بحث کی ہے اور اپنی اپنی علمی بساط کے مطابق ہزاروں کتابیں تحریر

کی ہیں، زیبا قصائد اور غزلیں پیش کی ہیں، تاریخ بشریت میں ہمیں ایسی کوئی ہستی نظر نہیں آتی جو مختلف ادیان، ملل اور اقوام میں اس قدر محبوبیت کی حامل ہو جتنا آپ کی ذات ہے۔

حضرت امیر علیہ السلام کے فضائل اور مناقب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ غیر اکتسابی فضائل۔

2۔ اکتسابی فضائل۔

شخصیت علوی کے غیر اکتسابی فضائل کی اہمیت

غیر اکتسابی فضائل سے مراد آپؑ کے وہ فضائل ہیں جن کے حصول میں آپؑ کی ذات والا صفات کا کوئی عمل دخل نہیں، بلکہ یہ فضائل مکمل طور پر غیر اختیاری ہیں اگرچہ یہ فضائل آپ کی ذات کیلئے باعث شرف و افتخار ہیں لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انہی فضائل کی وجہ سے آپ کی شخصیت اجاگر ہوتی ہے، ایسے فضائل کا ایک واضح نمونہ آپؑ کی کعبہ معظّمہ میں ولادت باسعادت ہے، ابتدائے تخلیق آدمؑ سے لے کر قیام قیامت تک آپ کو کوئی ایسا انسان نہیں ملے گا جو اس طرح کی فضیلت کا حامل ہو، اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت صرف اور صرف آپؑ ہی کی ذات والا صفات کو عطا فرمائی ہے۔

اس بے نظیر واقعہ کی اہمیت کو کم کرنے، اس میں شک و تردید پیدا کرنے اور اس کے آثار کو مٹانے کیلئے دشمن نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا، لیکن۔

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے ○ ○ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

کے مصداق دوست اور دشمن نے اس بے مثال اور بے نظیر واقعہ کو اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، تاریخ کی ناقابل تردید اور حتمی شہادت کے مطابق علی بن ابی طالب علیہ السلام کے علاوہ

کائنات میں کوئی دوسرا شخص ''مولود کعبہ'' کے عنوان سے متعارف نہیں اور یہ فضیلت صرف آپؑ ہی کی ذات کے ساتھ خاص ہے اور اس میں نہ تو کوئی نبی، نہ کوئی ولی، نہ امام حتی کہ ذات پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شریک نہیں ہے اور نہ اس فضیلت کے حامل ہیں۔

البتہ اس فضیلت کے حصول میں حضرت امیرؑ کا کوئی ذاتی عمل دخل نہیں ہے بلکہ، یہ آپ کو ذات کردگار کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور یہ ایسی فضیلت نہیں ہے جس کی کوئی تقلید کر سکے یا توقع رکھے کہ اسے یا اس کی اولاد کو نصیب ہوگی۔

اگر چہ یہ مخصوص فضیلت آپ کیلئے خداوند عالم کی طرف سے ایک خصوصی عطیہ ہے، لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے تمام انبیاء و مرسلین اور اولیاء و صالحین میں سے صرف آپؑ کو ہی کیوں عطا فرمائی؟ ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جناب رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام، جناب علی بن ابی طالب علیہ السلام سے کہیں بالاتر ہے مگر ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت حضور رسالتمآبؐ کو نہیں بلکہ ولایت مآبؑ کو کیوں عطا فرمائی ہے؟ یہ خود خدا ہی بہتر جانتا ہے!!۔

یہاں پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اصولی طور پر اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے جو بعض کرامتیں اپنے بعض اولیاء کو عطا فرمائی ہیں یقیناً وہ کسی خاص مصلحت ہی کی بنا پر عطا فرمائی ہیں جس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ صاحب کرامت انسان باقی تمام انسانوں پر برتری کا حامل ہوتا ہے، مثلاً حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے پیدا ہوتے ہی گہوارے میں بولنا شروع کر دیا تھا، جبکہ لوگ ان کی ولادت کے بعد ان کی والدہ گرامی کے گرد اکٹھے ہو کر انہیں ناروا نسبتوں سے منسوب کرنے لگے اور کہنے لگے: ''مَا کَانَ اَبُوکِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا کَانَتْ اُمُّکِ بَغِیًّا'' (مریم/28) تمہارے خاندان میں ایسا کوئی شخص نہیں گزرا جس نے تمہارے جیسا نا

پسندیدہ کام انجام دیا ہو، یہ کیسے ہو گیا کہ تم نے شادی کے بغیر اس بچے کو جنم دیا؟ یہ سن کی حضرت مریمؑ نے امرالٰہی کے مطابق بچے کے گھوارے کی طرف اشارہ کیا، گویا وہ زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ: "اس بچے سے سب کچھ پوچھ لو!" تو وہ لوگ تعجب کر کے کہنے لگے: "كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيّاً" (مریم/29) جو بچہ ابھی پیدا ہوا ہے ہم اس سے کس طرح بات کریں؟

اسی اثناء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام گھوارے میں قدرت خدا سے گویا ہوئے: "اِنِّي عَبْدُاللّٰه آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا" (مریم/30) میں خدا کا بندہ ہوں، خدا نے مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے کتاب عطا کی ہے۔

یہ فضیلت تمام انبیاء علیہم السلام میں سے صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہی حاصل ہے حتیٰ کہ اسلام کے گرامی قدر پیغمبر بھی اس کے حامل نہیں ہیں چونکہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ فضیلت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی میں ظاہر ہو۔

حضرت امیر علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ آنجنابؑ کا خانہ کعبہ میں پیدا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپؑ، حضرت رسول گرامیؐ سے افضل ہیں بلکہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ ولادت سے پہلے ہی آپ کی فضیلت ثابت ہو جائے تا کہ تمام لوگوں کی توجہ اسی طرف مبذول ہو جائے اور آپؑ کا مقام دنیا میں تا قیامت بلند و بالا رہے آپ کیلئے ایسی فضیلت کا اظہار اس لئے بھی ہے تا کہ اگر کوئی شخص حق کا متلاشی ہو تو اسے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور وہ اس مقام رفیع کے حامل کے دروازے پر چلا آئے۔

چونکہ سرکار رسالتمآبؐ کے بعد، آپؐ کا یہ بوجھ حضرت علی علیہ السلام نے اٹھانا تھا اور حکومت اسلامی کا نمونہ پیش کرنا تھا لہٰذا حکمت الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ آپؑ ابتدائے ولادت ہی سے ایسی صفات کے حامل ہوں کہ لوگوں کی توجہ آپ کی طرف ہو اور دنیا کو معلوم ہو کہ وہ مردِ مافوق

انسان آپ ہیں۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے بارے میں روایات میں آیا ہے: ''آپؑ کی مثال لوگوں میں ایسی ہے جیسے ''یعسوب'' یعنی شہد کی ملکہ مکھی کی ہوتی ہے دوسری مکھیوں کی نسبت، جو اگرچہ ایک جنس کی ہوتی ہیں لیکن ملکہ کو دوسری مکھیوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے، تمام مکھیاں، اسی یعسوب (ملکہ) کے طفیل وجود کا جامہ پہنتی ہیں اور اس کی خدمت گزار ہوتی ہیں''۔

بہر حال امیر المومنین علیہ السلام کے بعض فضائل بطور کامل خداوند متعال کی جانب سے آپ کو بطور عطیہ ملے ہیں اور ان میں سے کچھ ایسے فضائل ہیں جو صرف اور صرف آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں اور ابتدائے عالم سے لے کر قیام قیامت تک ان میں آپ کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اس طرح کے مطالب کو ہمارے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے تا کہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ خلاق عالم نے اس کائنات کیلئے کیسا گراں بہا گوہر خلق فرمایا ہے اور یہ بلند مرتبہ شخصیت کس حد تک خداوند عالم کو عزیز و محبوب ہے!! تا کہ اس طرح سے ہمیں اس بات کا پتہ چلے کہ عالم انسانیت کیلئے اس کی رہبری اور قیادت کس قدر اہمیت کی حامل ہے خدا نے اس کی ولادت گاہ کو بھی دوسروں سے جداگانہ قرار دیا ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے لوگ حتی کہ وہ لوگ بھی جو ان کے ہم عصر اور ہم زماں تھے اور ان کے فضائل خود رسول خداؐ کی زبانی سن چکے تھے مگر ان کی فضیلت اور دوسروں پر برتری کو درک نہیں کر سکے، کیونکہ ان کے دل نورِ معرفت سے خالی تھے انہوں نے آپ کو دوسرے عام آدمیوں کی طرح سمجھا ہوا تھا اور آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں، ہاں البتہ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو آپؑ کی تھوڑی بہت فضیلت کے قائل ہیں، ایسے لوگوں کی آنکھیں حق و حقیقت کے آفتاب عالمتاب کی روشنی کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

''فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِي فِي الصُّدُوْرِ ''(حج/46)
درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہیں وہ دل اندھے ہیں جو سینوں میں موجود ہیں۔

یہ بات بھی نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ دورِ حاضر میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو خود کو آنجنابؐ کا پیروکار بھی سمجھتے ہیں لیکن اپنی طرف سے بے سمجھے، نادانی اور حماقت کا ثبوت اپنی بے معرفتی کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور امیر المومنینؑ اور دوسرے عام لوگوں کے درمیان کسی قسم کے درمیان فرق کے قائل نہیں یا یوں کہئے کہ انہیں اپنے جیسا ایک عام انسان سمجھتے ہیں۔

ہمارے اس دور میں جبکہ مختلف شیطانی شکوک وشبہات عام رائج ہو چکے ہیں ہماری بعض مجالس، حتیٰ کہ مدرسوں، سکولوں، کالجوں یونیورسٹیوں اور عوامی خطابات میں بعض اوقات کچھ لوگ بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ یہاں تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ: ''پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ علیہم السلام کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے درحقیقت ایک انسان سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں اور ان میں واقعیت کا عنصر ذرہ بھر بھی موجود نہیں''۔ وہ کہتے ہیں: ''وہ بھی دوسرے عام انسانوں کی طرح تھے'' حتیٰ کہ بعض اوقات وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ''ان کے نام پر صلوات کیوں پڑھتے ہو؟'' انہیں سلام کیوں کہتے ہو؟'' ان میں سے کسی شخصیت کے نام پر احتراماً کھڑے کیوں ہو جاتے ہو؟'' وغیرہ

ایسے لوگوں کے لئے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی جواب نہیں: ''وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ''(نور/40) جسے اللہ نے نور عطا نہیں فرمایا اس کیلئے کوئی بھی نور نہیں ہے۔

جی ہاں! ''فَمَنْ يَهْدِي مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ''(روم/29) جسے خدا گمراہی میں چھوڑ دے اسے کون ہدایت کر سکتا ہے؟ البتہ ہر صورت میں ایسے شکوک وشبہات کی طرف متوجہ رہنا چاہئے

اور اپنے بعض نوجوانوں اور جوانوں کو گمراہی سے بچانے کیلئے ایسے شبہات کا جواب ضرور بتانا چاہیئے۔

2۔ غیر اکتسابی فضائل:

غیر اکتسابی فضائل کی ایک دوسری قسم باوجودیکہ ان میں منشاء الٰہی کارفرما ہے پھر بھی وہ آپ کی ذات، صفات، سیرت، کردار، رفتار اور گفتار میں بہت اثر انداز ہیں۔

خانہ کعبہ میں ولادت نے آپ کی شخصیت میں تبدیلی پیدا نہیں کی بلکہ یہ ایک عطیہ الٰہی اور کرامت ربی ہے تا کہ دنیا کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ علیؑ اور دوسرے تمام عام انسانوں میں بڑا فرق ہے، لیکن کچھ غیر اکتسابی اور خداداد فضائل جو امیر المومنین علیہ السلام اور دوسرے انبیاء و اولیاء کو عطا ہوئے ہیں وہ ان کی تشکیل سیرت و کردار اور شخصیت کے سدھارنے میں بڑی حد تک کارفرما ہیں اور وہ ہیں درک وفہم، بیدارِ دل اور باصفا روح۔

البتہ ہم یہ نہیں جانتے کہ اس قسم کے عطیوں اور عنایتوں کی حقیقت کیا ہے؟ ہم تو صرف ان کے آثار کا ادراک کر سکتے ہیں ہم ان کے دل کی نورانیت اور باطن کی پاکیزگی کا ادراک نہیں کر سکتے لیکن جو قرائن و آثار ان کے مقدس وجود سے نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں ہم ان کی تعبیر صرف ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ یہ آثار نتیجہ ہیں ان کے قلب کی نورانیت اور روح کی پاکیزگی اور صاف ہونے کا اور ان بزرگواروں کا وجود ''نورانی وجود'' ہے اور یہ تعبیر قرآن پاک اور بے شمار روایات سنی و شیعہ میں ذکر ہوئی ہے۔

روایات کی رو سے حضور پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اہل بیت علیہم السلام نورانی وجود کے حامل ہیں اور قبل اس کے کہ وہ اس دنیا میں جسمانی وجود کی صورت میں ظاہر ہوں خداوند عالم نے

ان کے نور کو خلق فرمایا۔ بطور نمونہ ملاحظہ ہو: بحار الانوار جلد ۲۴ باب ۲۳ روایت ۱۳، جلد ۲۶ باب ۸ روایت ۱۸ اور جلد ۳۵ باب اول روایت ۲۵۔

البتہ ہم ان تعبیرات کی حقیقت کو درک کرنے سے قاصر ہیں اور یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ آیا وہ اس نور کی جنس سے ہیں جسے ہماری آنکھیں مشاہدہ کرتی ہیں؟ یا کوئی اور نور ہے؟ ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان بزرگوار ہستیوں کی حقیقت ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، باشرف اور مقدس ہے، ان کی ہستیوں کے تعارف کیلئے ہمارے پاس ''نور'' سے زیادہ پاکیزہ اور زیادہ قیمتی کوئی اور عنوان نہیں ہے، جو ان کیلئے استعمال کر سکیں، جیسا کہ ہم خداوند تعالیٰ کے بارے میں کہتے ہیں: ''اَللّٰـهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض '' (سورہ نور/35) اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس سے زیادہ مناسب لفظ ہمارے پاس کوئی اور نہیں جسے ہم استعمال کر سکیں اور بتا سکیں کہ خداوند عالم کا عالم ہستی کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' جبکہ روایات میں آیا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ایک نور کو خلق فرمایا جسے آدمؑ کی تخلیق کے بعد ان کی صلب میں قرار دیا''۔ (بحار الانوار جلد ۳۵ باب ۳ روایت ۳۳) اب اس مقام پر ہم ایک مرتبہ پھر اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ صلب آدمؑ میں نور کے مقرر ہونے کا کیا مفہوم ہے؟ البتہ بہت زیادہ مقدار میں روایات کی تعبیر کو نقل کیا گیا ہے جن میں سے بیشتر تعداد کی روایات اہل سنت کی ہیں جس میں اس قسم کی تعبیرات کو نقل کیا گے ہے کہ: ''نور ایک صلب سے دوسرے صلب میں منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ حضرت عبد المطلب کی صلب تک پہنچ گیا اور اس مرحلہ تک پہنچنے کے بعد اس کے دو حصے کیئے گئے ایک حصہ صلب عبد اللہ میں رکھا گیا جس سے پیغمبر اکرمؐ پیدا ہوئے اور ایک حصہ صلب ابوطالب میں قرار پایا جس سے حضرت علی علیہ السلام کی ولادت ہوئی

''بالفاظ دیگر حضرت عبدالمطلب کی صلب تک یہ نور اتحاد کا حامل تھا اور ''نورِ واحد'' تھا۔
(بحارالانوار جلد۲۴ باب ۶۷ روایت ۵۹)

ہم بلکہ ہم سے بزرگ تر افراد اس نور کی حقیقت کے ادراک سے عاجز ہیں اور ہم اس کی مکمل توصیف و تعریف کرنے سے قاصر ہیں اس نور کا خصوصی تعلق سرکار رسالتمآب حضرت امیرؑ، جناب فاطمہ زہراؑ اور ان کی اولاد امجاد میں سے ائمہ طاہرین علیہم السلام کے ساتھ ہے۔

یہ نورانی حقیقت کچھ اس طرح کی ہے کہ جب یہ بزرگوار ہستیاں اپنی ماؤں کے پیٹ میں تھیں اس وقت بھی کمال عقل، قدرت، ادراک اور فہم کے لحاظ سے دنیا کے دوسرے لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھیں۔

ہوسکتا ہے کچھ لوگ ہماری ان باتوں پر تعجب کریں لیکن یہاں پر تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کی باتیں ان بزرگواروں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے بھی دیکھنے میں آجاتی ہیں، مثلاً عمومی حالات میں کس قدر عرصہ درکار ہوتا ہے کہ ایک صحیح و سالم شخص زبردست اور ماہر استاد کی زیر سرپرستی ریاضی کی اعلیٰ تعلیمات حاصل کرسکتا ہے، چنانچہ اگر آپ سے کہا جائے کہ ''فلاں ملک میں ایک تین سالہ بچہ ریاضی کی اعلیٰ معلومات سے بہرہ مند ہے'' تو اس وقت آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟ کیا ایسا ہونا محال ہے؟ ہرگز نہیں یہ اور بات ہے کہ ایسا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، تو اگر ایک تین سالہ بچے کیلئے ایسا امر ممکن ہے کہ جہاں پر بیس سال کی عمر تین سال کی حد تک آسکتی ہے، تو دو سال تک بھی اس کا آنا ممکن ہے اگر دو سال کے بچے کیلئے ایسا ہونا ممکن ہے تو ایک سال کے بچے کیلئے بھی تو ممکن ہوسکتا ہے اور اگر ایک سال کے بچے کیلئے ممکن ہوسکتا ہے تو پھر یہ کیونکر ناممکن ہے کہ ایک معصوم بچہ اپنے وقت ولادت سے ایسی استعداد کا مالک ہو!! پس بنابریں یہ بات قطعاً محال نہیں ہے، لیکن چونکہ ہمارے معاشرے میں ایسی مثالیں عمومی طور پر ناپید ہیں لہٰذا

اس بارے میں ایسا باور کرانا کسی حد تک مشکل ہوتا ہے لیکن جب ہم اس قسم کے چھوٹے چھوٹے نمونے اور وہ بھی نچلی سطح پر دیکھتے ہیں جو محدود ہوتے ہیں تو پھر متوجہ ہوتے ہیں اس سے برتر، بالا تر اور اعلیٰ تر نمونوں کا ہونا بھی ممکن ہے۔

(جیسا کہ ہمارے آج کے دور میں مکمل قرآن اور نہج البلاغہ کے حافظ، سید محمد حسین طباطبائی اور وزیری برادران جن کی محیر العقول اور خارق العادہ استعداد زبان زدِ ہر خاص و عام ہے) بنا بریں پیغمبر اکرمؐ ہوں یا امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام، سیدہ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہوں یا حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام، یہ وہ ہستیاں ہیں جو اپنی ولادت سے پہلے اور شکم مادر میں ہی دنیا کے جیّد اور مسلّم فلاسفہ و نوابغ سے زیادہ مطالب کے اخذ و درک کرنے پر قادر تھے یہ بزرگوار ہستیاں اپنی ولادت سے پہلے خداوند سبحان کی تسبیح کیا کرتی تھیں اور جونہی شکم مادر سے باہر آتیں اس دنیا میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے اپنے خالق و مالک کا سجدہ بجالاتیں۔ جبکہ اس عالم میں دوسرے عام لوگوں کا اس حقیقت سے آشنا ہونا قطعاً ناممکن ہے۔

فضائل نبیؐ و علیؑ بزبان مولا علی علیہ السلام

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں تصور کریں کہ وہ عام دنیا کے بچوں کی مانند ایک بچے تھے، تو بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی بھی تحقیق کر لی جائے اور خود آنجنابؑ کے کلام کی طرف مراجعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ خود اپنے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ آپ کبھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے اور بے جا بات نہیں کرتے۔

نہج البلاغہ کے معروف ترین خطبات میں سے ایک خطبہ بنام ''خطبہ قاصعہ'' میں سب

سے پہلے حضرت رسول کریمؐ کی شخصیت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور حضور کریمؐ کے بارے میں ہونے والے سوالات میں سے ایک ایسے سوال کو پیش فرماتے ہیں جو آپؐ کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ "آنحضرتؐ چالیس سال پہلے اور مبعوث برسالت ہونے سے قبل کس دین پر کاربند تھے؟" یہ سوال مختلف کتابوں میں درج ہے اور اس بارے میں کئی فصول وابواب لکھے جا چکے ہیں اور پھر اس کے گونا گوں جوابات دیئے جا چکے ہیں، کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ آنحضرت اس دوران دین مسیحی کے پابند تھے کیونکہ اس زمانے میں دین برحق وہی دین مسیحی تھا، بعض نے کہا کہ دین ابراہیمی کے پیروکار تھے، بعض دوسرے لوگوں نے کئی دوسرے نظریات پیش کیے ہیں، لیکن مولا علی علیہ السلام اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "وَلَقَدْ قَرَنَ اللّٰهُ بِه'ص' مِنْ لَّدُنْ اَنْ كَانَ فِطِيْمًا اَعْظَمَ مَلَكٍ مِنْ مَّلَائِكَتِهٖ يَسْلُكُ بِه طَرِيْقَ الْمَكَارِمِ" (نہج البلاغہ خطبہ قاصعہ نمبر ۲۳۴) ہنوز آپ شیر خوار تھے کہ خداوند تعالیٰ نے ایک عظیم ترین فرشتے کو آپ کے ساتھ ملا دیا تھا اور وہ آپؐ کو بہترین اور عمدہ امور کی طرف رہنمائی کرتا تھا۔

یعنی جس زمانے میں پیغمبر گرامی قدرؐ میں برحسب ظاہر اور عمومی حالات کے پیش نظر مسائل کے درک کرنے کی قدرت پیدا ہوئی اور بولنے چالنے اور گفتگو کرنے کا موقع آیا تو اللہ کے ایک عظیم ترین فرشتے یعنی اعظم مَلَک کی رہنمائی حاصل ہوئی البتہ یہاں پر یہ نہ سمجھا جائے کہ آپؐ کو اسی روز ہی رسالت پر مامور کر دیا گیا تھا بلکہ احادیث کی رو سے آپ چالیس سال کی عمر میں مبعوث برسالت ہوئے اور ان دونوں باتوں میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے، کیونکہ اس طرح

کی کرامت سے اللہ تعالیٰ نے دوسری برگزیدہ ہستیوں کو بھی نوازا ہے۔ جس طرح کہ حضرت مریمؑ نبی نہیں تھیں لیکن انہوں نے فرشتوں سے باتیں کی ہیں، قرآن مجید فرماتا ہے: "قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا" (مریم/19) حضرت مریم نے فرشتے کو دیکھا جوان سے کہہ رہا تھا: "میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تمہیں پاکیزہ عطا کروں"۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پیغمبر نہیں تھیں لیکن جب انہوں نے اپنے فرزند (موسیٰ علیہ السلام) کو دریا میں پھینکنے کا ارادہ کیا تو ازخود یہ کام انجام نہیں دیا بلکہ الہام الٰہی سے یہ قدم اٹھایا، جیسا کہ خدا فرماتا ہے: "فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ" (قصص/7) اللہ نے انہیں الہام کیا کہ: اپنے بیٹے کو دریا میں ڈال دو ڈرو نہیں غم نہ کرو ہم اسے دوبارہ تمہاری طرف پلٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں سے قرار دیں گے۔

یہ خوشخبری اس وقت ملی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام شیر خوار تھے اور فرعون والوں کے ڈر سے انہیں دریا میں ڈال دیا گیا تھا۔

بنابریں ممکن ہے اگر کوئی پیغمبر یا حتی کہ امام نہ ہو لیکن خدا کا شائستہ بندہ ہو تو خداوند عالم فرشتوں کے ذریعہ اس کی رہنمائی کرتے ہوئے اپنے مطالب ان کی طرف الہام کرتا ہے لہٰذا یاد رہے کہ مَلَک کا الہام، نبوت کی وحی کے برابر نہیں ہوتا۔ یعنی ضروری نہیں ہے کہ انسان نبی ہو تو اسے الہام ہو۔ یا اس کی طرف وحی کی جائے۔ کیونکہ "وحی نبوت" ایک علیحدہ چیز ہے جو صرف اور صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے اور الہام نبی اور غیر نبی دونوں کی طرف ہوتا ہے چنانچہ اسلامی امہ میں حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا وہ خاتون ہیں کہ جو نہ تو نبی تھیں اور نہ ہی امام لیکن آپ کے پاس جبرائیل نازل ہوا کرتے تھے باتیں کیا کرتے تھے اور کئی مطالب انہیں

الہام کیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے انہی الہامات کی بنیاد پر "مصحف فاطمہ" کو تحریر کیا گیا ہے۔

بہر حال حضرت پیغمبر اسلام مبعوث برسالت ہونے سے پہلے بھی خدا کے عظیم ترین فرشتے کی رہنمائی سے بہرہ مند تھے، حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک عظیم فرشتے کو آپ کا ساتھی اور ہم نشین قرار دیا" حضرت امیر علیہ السلام کے بقول سرکار رسالت مآب اپنے شیر خوارگی کے دور سے ہی ایک عظیم آسمانی فرشتے کی تربیت اور نگرانی میں آگئے تھے یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ اپنی بعثت سے قبل ہی سہو و نسیان اور خطا و عصیان سے محفوظ تھے حتیٰ کہ ایک لمحہ بھر تک کیلئے بھی شرک کے مرتکب نہیں ہوئے اور یاد خدا سے غفلت کا شکار نہیں ہوئے اس زمانے میں اسلامی شریعت نازل نہیں ہوئی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا جو شرعی فریضہ انجام دینا ہوتا فرشتہ ان پر خدا کی طرف سے الہام کر دیتا تھا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس خطبے میں ایسی باتوں کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ اور کس مناسبت کے تحت انہیں ذکر کیا گیا؟ لیکن اگر اس خطبہ میں غور کیا جائے تو مناسبت خود بخود معلوم ہو جائے گی۔ امیر المومنین علیہ السلام خطبے کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جب میں پیدا ہوا تو آنحضرتؐ نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا
اور اپنے سینے سے لگایا، اپنے دہن مبارک میں غذا کو چبا چبا کر
مجھے کھلانا شروع کر دیا اور میرے منہ میں ڈال دیا کرتے تھے
تاکہ میں انسے تناول کروں ...."۔

یعنی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی الٰہی کے پروردہ تھے اور میں حضرت رسالتمآبؐ کا پروردہ تھا، میرا گوشت و پوست پیغمبرؐ کے لعاب مبارک سے وجود میں آیا، چنانچہ حضرت علی علیہ

السلام نے اس خطبہ میں بہت سی عجیب وغریب تعبیرات کو پیش فرمایا ہے منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ:

''میں اپنے ایام طفلی میں پیغمبر اکرمؐ کے جسم مبارک کی خوشبو کو سونگھتا اور اس سے لذت محسوس کرتا تھا، آپؐ مجھے اپنے سینے سے اس قدر مضبوطی سے لگاتے تھے کہ میں آپ کی سانسوں تک کو محسوس کرتا تھا اور آپ کے بدن کی خوشبو سے لذت محسوس کرتا تھا انہی ابتدائی دنوں ہی سے آنحضرتؐ نے میری تربیت کیلئے کمر ہمت کس لی تھی''۔

چنانچہ جو علوم آنحضرتؐ، خدا کی طرف سے فرشتوں سے حاصل کرتے تھے وہی حضرت علی علیہ السلام کو دے دیا کرتے تھے۔

اسی خطبہ کے ایک اور جملہ میں فرماتے ہیں:

''آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے سے دس سال پہلے ہی سے میں نے خدا کی عبادت شروع کردی تھی''

چنانچہ ان کی دس سال کی عمر تھی کہ پیغمبرؐ مبعوث برسالت ہوئے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت علی علیہ السلام اپنے شیر خوارگی کے عرصہ سے ہی خدا پرست اور خدا شناس تھے۔

اس کے بعد اضافہ فرماتے ہیں:

''حتی کہ جب پیغمبر پر وحی نازل ہوئی تو میں نے ایک عجیب آواز کو سنا جو ایک سوز ناک طریقہ سے بلند ہوئی تھی میں نے حضورؐ سرور کائنات کی خدمت میں عرض کیا: ''یا رسول اللہؐ یہ کیسی

آواز ہے؟'' آپؐ نے فرمایا: ''یہ شیطان کے چیخنے کی آواز ہے
جو میری بعثت کے بعد، اب وہ خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے سے
ناامید ہو گیا ہے''۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ساتھ ہی سرکار رسالتؐ نے فرمایا: ''یا علیؑ! یقیناً تم وہی کچھ سنتے ہو جو میں سنتا ہوں اور وہی کچھ دیکھتے ہو جو میں دیکھتا ہوں فرق صرف یہ ہے کہ تم نبی نہیں ہو''۔

حضرت علی علیہ السلام اسی خطبہ کے اسی حصے اور مندرجہ بالا جملہ سے قدرے پہلے فرماتے ہیں: ''میں پیغمبر اکرمؐ کے چہرۂ مبارک میں نبوت کا نور دیکھتا اور وحی کی آواز سنتا تھا''۔

البتہ یہ وحی پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوتی تھی اور اس کا مخاطب حضور اکرمؐ کی ذات ہی تھی لیکن حضرت علی علیہ السلام صرف اس طرح جس طرح کوئی ایک شخص کسی دوسرے آدمی کے ساتھ براہ راست بات کرتا ہے جبکہ ایک تیسرا شخص ان کے ایک طرف ہو کر باتوں کو سن رہا ہوتا ہے۔ جبرائیلؑ حضرت علی علیہ السلام پر وحی کے الفاظ نہیں لاتے تھے کیونکہ وہ پیغمبر نہیں تھے لیکن حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ ہونے والی جبرائیلؑ کی گفتگو کو سنتے ضرور تھے، اسی لئے تو حضور پاکؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: ''انک تسمع ما اسمع وتری ماری الاانک لست بنبی ''تم بھی وہی کچھ سنتے ہو جو میں سنتا ہوں اور وہی دیکھتے ہو جو میں دیکھتا ہوں، مگر تم نبی نہیں ہو۔

اللہ تعالیٰ کا حضرت علی علیہ السلام کو یہ ایک اور عطیہ تھا اور ایک نورانیت تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سرفراز فرمایا اور اس کے کسب کرنے میں ان کا اپنا کوئی عمل دخل نہیں تھا، آیا یہ ممکن ہے کہ ایک انسان اپنی رضاعت کے دورانیے میں اس طرح کی کرامت اور عظمت کو کسب کر سکے؟ اور اس پر فضیلت کا تعلق ان عطیات الٰہی سے ہے جو ہیں تو غیر کسبی لیکن حضرت امیر

علیہ السلام کی شخصیت، سیرت، رفتار اور کردار میں بڑی حد تک موثر ہیں۔

☆......حضرت علی علیہ السلام کے اکتسابی فضائل......☆

حضرت علی علیہ السلام کے فضائل کی تیسری قسم کا تعلق خود آنجنابؑ کی ذات سے ہے اور جنہیں آپؑ نے خود ہی حاصل کیا ہے وہ ہیں آپ کی عبادات انسانیت کی خدمت، مسلم امہ کے امور کی تدبیر، ناگوار حوادثات پر خونِ دل کا بہنا، مصائب و آلام پر صبر دین اسلام کی حفاظت کیلئے میدان جنگ میں جان پر کھیل جانا، امت مسلمہ کے اتحاد کو برقرار رکھنے اور اسلام کے تحفظ کیلئے پچیس سال تک خاموش رہنا، بارگاہ رب العزت میں نالہ وفریاد کرنا، آنسو بہانا، محراب عبادت میں کھڑے ہو کر اپنے خالق سے راز و نیاز کرنا ایسے فضائل ہیں جو آپؑ نے اختیاری طور پر حاصل کیے ہیں۔

○ ☆ ○ ☆ ○ ☆ ○ ☆ ○ ☆ ○

۲

شخصیت امیر المومنین علیہ السلام

آپؑ کی تین فضیلتوں کے بارے شکوک وشبہات اوران کا جواب

ہماری بحث کا عنوان ہے ''حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت اور فضائل کی معرفت'' ہماری کوشش ہوگی کہ اس بارے میں تفصیلی گفتگو کر کے اپنی معرفت میں اضافہ کریں اور آپ کی امامت اور خلافت کے بارے میں جو شکوک وشبہات یا اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا جواب دیں۔

پہلا شبہ

بچپن میں اور غیر شعوری ایمان

منجملہ ان شبہات کے جو حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: ''مؤرخین کے مطابق جب حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان رسالت فرمایا اس وقت حضرت علی علیہ السلام کا سن ۱۰ یا ۱۳ سال سے زیادہ نہیں تھا اور یہ وہ عرصہ ہوتا ہے جس میں انسان کے شعور میں پختگی نہیں ہوتی لہٰذا اس دوران حضرت علی علیہ السلام کا پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانا اور ان کی رسالت کی تصدیق کرنا شعور کی پختگی کی وجہ سے نہیں تھا اس لئے کہ ایسا ایمان اور ایسی تصدیق مکمل بصیرت اور آگاہی کی وجہ سے نہیں تھی۔ کیونکہ دس سالہ بچہ ایک بزرگ کے دامان شفقت میں پروان چڑھنے کے بعد ہوسکتا ہے کہ وہ محبت بھرے جذبات کے تحت اور سوچے سمجھے بغیر اس کی ہر بات کی تصدیق کردے، لہٰذا علی علیہ

السلام کی یہ تعریف کہ "کان اول الناس ایمانابرسول اللّٰہ" آپؑ، رسول پاک پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ (بحارالانوار جلد ۳۸ باب ۴ روایت ۱۶) والی فضیلت کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ یہ ایمان تحقیق اور آگاہی پر مبنی نہیں تھا۔

دوسرا شبہ

دس سال پہلے - نعوذ باللہ - علی علیہ السلام مسلمان نہیں تھے

دوسرا شبہ یہ ہے کہ اگر علیؑ دس یا تیرہ سال کی عمر میں پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لے آئے تو گویا وہ اس سے پہلے - نعوذ باللہ - کافر تھے، لہٰذا ان کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ "لَمْ یُشْرِکْ بِاللّٰہِ طَرْفَةَ عَیْنٍ" (بحارالانوار جلد ۳۲ باب ۹ روایت ۳۲۳) کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی اساس اور بنیاد ہے۔

تیسرا شبہ

دعوت ذوالعشیرہ میں ایک نابالغ بچے کو خلافت کیونکر سونپی جاسکتی ہے؟

حضرت علی علیہ السلام کی خلافت و امامت کے بارے میں پہلے شبہ کی طرح ایک اور شبہ یہ بھی ہے کہ روایات کے مطابق حضرت رسالتمآبؐ نے اپنی نبوت کے ابتدائی سالوں میں حضرت علی علیہ السلام کو اپنے جانشین کے طور پر مقرر کر دیا تھا اور اس بات کا تعلق دعوت ذوالعشیرہ سے ہے جسے اہل سنت نے بھی نقل کیا ہے۔ جس دن کہ آنحضرتؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے تمام قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں اپنا خلیفہ اور جانشین نامزد کر دیا تھا اور اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "هٰذَا اَخِی وَوَصِیِّی وَخَلِیفَتِی فِیکُم" (بحارالانوار جلد ۳۸ باب ۶۵ روایت ۲۳) یہ (علیؑ) میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ اور جانشین ہے۔

اسی طرح کی روایات کے مطابق جنہیں اہل سنت حضرات نے بھی نقل کیا ہے، پیغمبر اکرمؐ نے اپنی رسالت کے ابتدائی ایام ہی میں علی علیہ السلام کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا، لیکن اس بارے میں جو شبہ پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ''یہ کیونکر ہوسکتا ہے خلافت کسی ایسے شخص کے لئے ثابت ہو جو ابھی بالغ نہیں ہوا؟ اور رسالتمآبؐ کے بعد اس کی اطاعت کیونکر کی جاسکتی ہے؟''۔

تینوں شبہات کا ایک کلی جواب

ان تمام شبہات کا ایک ہی محور ہے اور وہ یہ کہ حضرات انبیاء عظام علیہم السلام، ائمہ اطہار علیہم السلام اور اولیاء الٰہی میں اور دوسرے عام انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے ایسے لوگوں کی نگاہوں میں مثلاً پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی وحی ایسی ہے جیسے کوئی کسی کو پیغام یا خط پہنچاتا ہے اور بس۔ اس سے زیادہ ان کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، ایسے شبہے پیدا کرنے والوں کے نزدیک پیغمبر اکرمؐ کے لئے معصوم امامؑ کی جانشینی ایسی ہے جیسے- بلا تشبیہ- ائمہ اطہار علیہم السلام کے بعد فقہا کی جانشینی ہوتی ہے، ان کے نزدیک معصوم امامؑ بھی ایک فقیہ ہوتا ہے البتہ وہ علم و دانش اور فقہ میں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔

اس قسم کے شبہات کے خاتمہ کیلئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ان مقدس ہستیوں اور دوسرے عام انسانوں میں کیا فرق ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بزرگ ہستیاں بظاہر ہماری طرح انسان ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ حضور سرور کائناتؐ فرماتے ہیں: ''اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُکُم'' (کہف/ 110) میں تمہارے جیسا بشر ہوں۔ تو اس سے لوگوں کو یہ سمجھ نہ آئی کہ وہ تو صرف بشریت میں ہی ہماری طرح ہیں نا کہ دوسری تمام خصوصیات میں بھی ہماری طرح ہیں۔ کیونکہ عام افراد بشر کا بھی ایک دوسرے کے ساتھ بہت فرق ہے۔ اگر چہ رسالتمآب نے ''انا بشر

مثلکم ''فرمایا ہے مگر ساتھ یہ بھی تو کہا ہے: ''یُوحیٰ اِلَیَّ '' مجھ پر وحی ہوتی ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی عام آدمی پر وحی نازل ہوتی ہے؟۔

انبیاء علیہم السلام تو وہ بزرگوار ہستیاں ہوتی ہیں جن میں وحی کے فرشتے کو دیکھنے اور پیام الٰہی کو سننے کی صلاحیت ہوتی ہے بلکہ ان کا مقام تو فرشتوں سے بھی بالاتر ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''ثم دَنیٰ فَتَدلّٰی ... عند سدرۃ المنتھیٰ''(نجم/8 تا 14) پھر قریب ہوا اور آگے بڑھا، پھر دو کمان کا فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب تھا، پس خدا نے اپنے بندے کی طرف جو وحی کی تو جو کچھ انہوں دیکھا ان کے دل نے جھوٹ نہ جانا تو کیا وہ جو کچھ دیکھتا ہے تم لوگ اس میں جھگڑتے ہو اور انہوں نے اس کو ایک بار اور دیکھا ہے سدرۃ المنتہٰی کے نزدیک۔

حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرشتہ وحی کو جو ''دیکھا'' ہے یا خداوند قدوس کے وجود مقدس کا دیدار فرمایا ہے تو وہ سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا کیونکہ سر کی آنکھوں سے خطا کا سرزد ہونا ممکن ہے جبکہ دل کی آنکھوں سے خطا ہرگز واقع نہیں ہوسکتی ''مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَأیٰ '' جو کچھ کہ حضورؐ پاک کی چشم دل نے دیکھا ہے اس میں جھوٹ اور غلطی تک کا شائبہ تک نہیں تھا۔

آنحضرتؐ کے لئے وحی اور علوم الٰہی کے حصول اور عصمت کے بارے عقیدہ میں اہل مکتب بیت علیہم السلام اور مکتب خلفاء کے پیروکاروں کے درمیان کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہے، لیکن ائمہ اطہار علیہم السلام اور ان سے متعلق امور کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے، آج جو مسائل گمراہ لوگوں کی طرف سے بیان کئے جاتے ہیں وہ ان لوگوں کے ذہن میں بہت سے شکوک وشبہات ایجاد کرتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان اچھی طرح راسخ نہیں ہوا اور معارف اہلبیتؑ کو صحیح معنوں میں حاصل نہیں کیا تو ایسے شکوک وشبہات اور سوالات کے جواب دینا ضروری

ہے اسی لئے مناسب ہے کہ فرصت سے استفادہ کرتے ہوئے اہل بیت اطہار علیہم السلام کے معارف کے سلسلے میں جتنا ہو سکے زیادہ سے زیادہ تحقیق اور مطالعہ کیا جائے۔

﴿افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا روزمرہ کا پروگرام کچھ اس طرح مرتب ہے کہ ہم اپنے مسائل میں ان مسائل کو اہمیت نہیں دیتے جو حقیقت میں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور اس موقع پر ہم اس بات کا اعتراف کرنے میں باک نہیں سمجھتے کہ تیس سال درس و تدریس کے بعد جب بھی ہم ان بعض آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جن کا مولا امیر المومنین اور اہل بیت اطہار علیہم السلام سے تعلق ہے تو ہمیں نت نئے مطالب ملتے ہیں جو گزشتہ تیس سال کے عرصہ میں ہم حاصل نہیں کر سکے اور ہماری احادیث و روایات اور تفاسیر کی کتابوں میں بصورت کافی و وافی موجود ہیں ،لیکن افسوس کہ ہم کچھ وقت نکال کر ان کا مطالعہ نہیں کر پاتے ، لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے کوشش کریں کہ ایک تو اہل بیت اطہارؑ کے متعلق ہم اپنی معرفت میں اضافہ کریں جس سے ہمارے ایمان میں اضافہ ہو اور دوسرے ان شکوک و شبہات کے جواب تلاش کریں جو ان مقدس ہستیوں کے بارے میں پیدا کئے جاتے ہیں﴾

بہر حال تمام مذکورہ شبہات کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

اگر چہ بظاہر یہ بزرگوار دوسرے عام انسانوں کی مانند انسان ہیں لیکن اپنی آغاز خلقت ہی سے خاص نورانیت کے حامل ہیں، ان کے دل کی آنکھیں ہمیشہ بیدار رہتی ہیں ایسے مسائل کا ادراک کرتے ہیں جو کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا ان کی عقلیں ہماری عقلوں سے بدرجہا کامل تر ہیں اور وہ ایسے مسائل کا ادراک کر لیتے ہیں جس تک عام انسانی عقول کی رسائی ناممکن اور ادراک عاجز ہے، اس بارے میں ہمارے پاس جو عینی شواہد ہیں ان کے علاوہ بہت سے ایسے ظاہری آثار بھی ہیں جو اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ذوات

مقدسہ شکم مادر میں تسبیح کرتی رہی ہیں اور زمین پر پہلا قدم رکھتے ہی سجدہ خالق میں جبہہ سائی کرتی ہیں اوراس طرح کی کئی دوسری مثالیں ہیں۔

رہے ان کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات تو ان کے تفصیلی جواب ہمارے پاس موجود ہیں جنہیں ہم یہاں ذکر کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں:

۱: بالغ ہونے سے پہلے مقام امامت تک رسائی

مذہب شیعہ اثنا عشریہ کے درمیان اس بارے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بعض ائمہ اطہار علیہم السلام ایام طفولیت ہی میں امامت کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے ہیں حتیٰ کہ وہ بالغ بھی نہیں ہوئے تھے، جبکہ امامت ایک جلیل القدر، عظیم المرتبت اور رفیع الشان عہدہ ہے، جس کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امام علیہ السلام معاشرہ کا مدیر ومدبر اور ذمہ دار شخص ہوتا ہے جس کا قول اور فعل تمام لوگوں کیلئے حجت ہوتا ہے۔

اب یہاں پر یہ سوچنے والی بات یہ ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ معاشرہ کی باگ ڈور ایسے شخص کے ہاتھ میں ہو جو لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کی قیادت اور رہنمائی ورہبری کررہا ہو لیکن خود ابھی تک سن بلوغ اور سن تکلیف کو نہ پہنچا ہو؟ آیا یہ بات قابل قبول ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کی ذمہ داری ایسے شخص کو سونپ دے جو خود ابھی تک بالغ ہی نہیں ہوا؟ اور اگر -نعوذ باللہ- اس عرصے میں اس سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو بھی وہ کسی قسم کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار پائے گا۔

اس بات کی مزید وضاحت کیلئے اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ فقہ میں بیان شدہ مسائل کہ جن میں لڑکی یا لڑکے کے سن تکلیف کی بات کی گئی ہے ان کا تعلق عام لوگوں سے ہے

انبیاء اور ائمہ علیہم السلام اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک بچہ جو ابھی آغوش مادر میں ہے وہ کہے "اِنّی عَبْدُاللّٰہِ اٰتانِی الْکِتَابَ وَجَعَلَنِی نَبِیًّا "(مریم/30) میں خدا کا بندہ ہوں، خدا نے مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے کتاب عطا کی ہے۔ چنانچہ وہ بچہ مکلّف تھا جبھی تو وہ یہ کہہ رہا ہے۔

اسی طرح ایک پانچ سات سال کا بچہ جو منصب امامت پر فائز ہوتا ہے اور اس کا کلام دوسروں کیلئے حجت اور اس کی اطاعت لوگوں پر واجب ہوتی ہے، اس میں اور جو ساٹھ سال کی عمر میں امامت کی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے اس میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے، اس لئے کہ امام کوئی عام آدمی نہیں ہوتا جس کیلئے کہ وہ پہلے کسی مکتب یا مدرسے میں درس پڑھے، حدیثیں یاد کرے، پھر اجتہاد کرے اور فتویٰ کی منزل تک پہنچے، نہ بلکہ امام کا حساب دوسروں سے علیحدہ ہے، جس طرح خود انہی بزرگواروں کا اپنا کہنا ہے اگر چہ سب لوگ اولاد آدم سے ہیں مگر ان کا اور دوسرے لوگوں کا باہمی فرق اسطرح ہے جس طرح شہد کی ملکہ مکھی کا دوسری مکھیوں سے فرق ہوتا ہے، چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "اَنَا یَعْسُوبُ الْمُؤْمِنِیْنَ "(بحار الانوار جلد۸ باب ۲۵ روایت ۷)"یعسوب" کے معنی شہد کی ملکہ مکھی کے ہیں، یعنی میں مومنین کا یعسوب ہوں، گویا آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں بشر ہونے کے باوجود دوسرے تمام انسانوں پر فوقیت رکھتا ہوں:

با ہمہ حسن و ملاحت اگر اینہا بشرند آب و خاک دگر و شہر و دیار دگرند

اس قدر حسن وخوبی کے باوجود بھی اگر وہ بشر ہیں تو یقین جانئے کہ ان کا آب وخاک اور شہر و دیار کوئی اور ہی ہے۔

ان کا علم اس طرح کا ہے جس کے حصول کیلئے انہیں دوسروں کے آگے زانوئے تلمذ تہہ

کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور نہ ہی کسی اور کی شاگردی اختیار کی -ذرا غور تو فرمائیں کہ ایک پانچ سالہ بچہ کس قدر احادیث و روایات کو یاد کرسکتا ہے کہ جب منصب امامت پر فائز ہو تو ان کے ذریعہ سے تمام احکام، ان کی تفصیل، قرآن کی تمام تفسیریں اور دین کے بارے ہونے والے تمام شکوک وشبہات اور اعتراضات کے جوابات کو جانتا ہو؟ ایک پانچ سالہ بچے کی لکھنے پڑھنے اور یاد کرنے کی کس قدر صلاحیت ہوتی ہے؟ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ان کا علم عام طریقے سے حاصل ہوا ہے اور انہوں نے تعلیم وتعلم کے ذریعہ مسائل کو یاد کیا ہے تو یقین جانئے کہ وہ دین کے امور کو قطعاً نہ سنبھال سکتے نیز یہ کہ اس قسم کا علم حجت ہی نہیں بن سکتا، لوگوں کیلئے قابل اعتماد بھی نہیں نہ ہوسکتا--۔

امام کا علم دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے اور اس مین ایک اور ہی نورانیت پائی جاتی ہے اور اس کا کسی اور جگہ سے تعلق ہے اس کے پس پردہ کوئی ذات ہے جو اس کی تائید کررہی ہے جس طرح خود پیغمبر ختمی مرتبت تھے۔

قبل ازیں "خطبہ قاصعہ" سے کچھ چیدہ چیدہ چیزوں کی طرف ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "جب آنحضرتؐ کی دودھ بڑھائی ہوئی اسی وقت سے اللہ نے ایک عظیم فرشتہ آپؐ کے ساتھ ساتھ رہا ہے اس کے ذریعہ خدا آپ کی رہنمائی کرتا تھا"۔ اسی بنا پر چالیس سال کی عمر تک جب کہ آپ ابھی مبعوث برسالت نہیں ہوئے تھے اور وحی بھی آپ پر نازل نہیں ہوئی تھی، لیکن خدائی بندوبست ایسا تھا کہ آپ الٰہی تربیت میں پروان چڑھتے رہے اور اس دوران خداوند عالم جو چاہتا تھا اسی فرشتہ کے ذریعہ آپ کو الہام فرمادیتا تھا اور حضورؐ بھی اسی کام کو انجام دیتے تھے۔

نزولِ شریعت سے پہلے انبیاء کو الہام ہوتا تھا

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت وحیؑ کے نزول سے پہلے احکام الٰہی کو جان کر ان پر عمل پیرا ہو کرتے تھے؟ تو ذہن کو مطلب سے نزدیک کرنے کیلئے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ہم قرآن کی ایک آیت کی طرف اشارہ کریں گے، جس میں بتایا گیا ہے کہ توریت کے نزول اور بنی اسرائیل کیلئے احکام شریعت کے حصول سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کچھ چیزیں اپنے اور دوسرے لوگوں کیلئے حرام قرار دے دیں تھیں۔ ارشادرب العزت ہے: "كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَٰٓءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَىٰةُ" (آل عمران/ 93) تمام غذائیں اولاد اسرائیل پر حلال تھیں سوائے ان کے جنہیں اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام) نے توریت کے نزول سے پہلے اپنے اوپر حرام قرار دے دی تھیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو چیزیں اپنے اوپر حرام قرار دے دی تھیں آیا یہ ان کی اپنی مرضی اور منشا سے تھا؟ آیا انہوں نے کوئی حکم اپنی طرف سے گھڑ کر دین میں ایک بدعت رائج کر دی تھی؟ آیا خداوند عالم اس بات کی اجازت دیتا ہے جس شخص کا جی چاہے کسی چیز کو حلال یا حرام کر دے؟ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو پھر اس سے یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کہ اس نے کس کی اجازت سے اسے حلال یا حرام کیا ہے؟ "قُلْ ءَآللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ ۖ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ" (یونس/ 59) کہہ دیجئے کہ آیا خدا نے تمہیں اجازت دی ہے یا تم خدا پر جھوٹ باندھتے ہو؟

اسی لئے اللہ کے معصوم پیغمبر اپنی طرف سے کسی چیز کو حرام نہیں کرتے، قطعی طور پر

حضرت یعقوب علیہ السلام نے الٰہی الہام کی بنیاد پر بہت سی چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے دیا تھا اور یہ وہ دور تھا جب ابھی شریعت موسیٰ علیہ السلام نازل ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ حضرت موسیٰ خود بھی اس دنیا میں تشریف نہیں لائے تھے۔

پس بنابریں ممکن ہے کہ شریعت نازل نہ ہونے کے باوجود بعض انبیاء خداوند عالم کے الہام کے ساتھ اس کے احکام اور حلال اور حرام کو سمجھ لیں اور ان پر خود بھی عمل پیرا ہوں اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کریں۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی حضرت علی علیہ السلام کے خطبہ قاصعہ میں فرمائش کے بموجب اپنے ایام طفلی اور نزول قرآن سے قبل ہی خدائی فرشتہ کے ذریعہ الہام کی وجہ سے ﷺ کے حلال اور حرام کے احکام کو درک کر کے ان پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اور امیر المومنین علیؑ اپنے ایام طفولیت اور دوران شیر خوارگی سے آغوش رسالت میں پرورش پانے کی وجہ سے رسول اسلام کی تعلیمات کے ذریعہ انہی احکام کو سمجھتے اور ان پر عمل کیا کرتے تھے۔

قبل از بعثت ایمان حضرت علی علیہ السلام

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ''آیا حضرت علی علیہ السلام دس سال کے سن میں حضرت رسالت مآب پر ایمان لانے سے پہلے مومن تھے یا غیر مومن؟'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایمان سے مراد پیغمبر اکرمؐ کی نبوت پر ایمان ہے تو یہ سوال بے جا ہے کیونکہ آنحضرتؐ اس وقت مبعوث برسالت نہیں ہوئے تھے تو ایمان لانے یا نہ لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ اس دوران وہ خدا کے منکر نہیں تھے کیونکہ اس بارے میں روایات ہیں کہ: ''حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے سے پہلے بھی مومن تھے'' (ملاحظہ ہو

بحارالانوار جلد۳۲ باب ۹ روایت ۳۳۴) اور جونہی حضرت رسالتمآبؐ نے اعلان رسالت فرمایا تو سب سے پہلے حضرت علی علیہ السلام نے آنحضرت کی رسالت کی تصدیق کی اور ایمان کا اظہار فرمایا۔

اسی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ کی بعثت سے قبل حضرت علی علیہ السلام کا خدا کی ذات پر پختہ ایمان تھا اور اسی کی عبادت بھی کیا کرتے تھے، البتہ یہ طریقہ اس عبادت سے مختلف تھا جو نزول اسلام کے بعد مخصوص قسم کے طریقہ سے بجالائی جاتی تھی، بلکہ اس طرح خدا کی بندگی کیا کرتے تھے جس طرح خود سرکارِ ختمی مرتبت کیا کرتے تھے اس دوران میں آپؑ خدا کی ذات پر ایمان رکھتے اور خالص توحید پرست تھے، لیکن چونکہ ہنوز پیغمبر اکرمؐ نے رسالت کا اعلان نہیں فرمایا تھا لہٰذا اس پر ایمان لانے یہ نہ لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضور کی رسالت کی تصدیق کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ نے اس کا اعلان فرمایا اور وحی کا نزول شروع ہوا تو اس وقت سب دنیا سے پہلے انہوں نے ہی اس کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔

پس بنابریں یہ بات کہ ''لَمْ یُشْرِکَ بِاللّٰہِ طَرْفَۃَ عَیْنٍ'' (بحارالانوار جلد۳۲ باب ۹ روایت ۳۳۴) حضرت علی علیہ السلام نے پلک جھپکنے کی دیر کیلئے بھی شرک نہیں کیا، صحیح اور برحق ہے انہوں نے کبھی شرک نہیں کیا، ہمیشہ مومن اور موحد تھے لہٰذا یہ موضوع بلادلیل نہیں کہ آپ اللہ کے گھر میں پیدا ہوئے۔

ایک قرآنی فیصلہ

شیعیان حیدر کرار کا یہ پختہ اور محکم عقیدہ ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی ذوات مقدسہ اور حضرت سیدہ طاہرہ فاطمہ زہرہ علیہم السلام عام انسانوں کے جیسے نہیں بلکہ ان میں اور عام انسانوں

میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔خداوند عالم نے ان پاک ،نورانی اور ملکوتی ہستیوں کو ہمارے لئے اس لئے بھیجا ہے تاکہ ہم ان کے علوم اوران کی رہنمائی سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرسکیں۔

اس کے برعکس کچھ لوگ اپنی معرفت کی کمزوری اور جہالت میں مضبوطی کی وجہ سے یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے جیسے انسان ہیں یا زیادہ سے زیادہ ہم سے ایک قدم آگے ہیں حالانکہ وہ اس طرف متوجہ نہیں ہیں کہ ہم جس قدر بھی ترقی کرجائیں اور جس قدر کوشش کریں، ان مقدس ہستیوں کے مقام وعظمت کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

بہرحال ممکن ہے کہ حضرات ائمہ علیہم السلام سے بعض ایسے مطالب بھی تعلق رکھتے ہوں جن کو ہم سند قرار دیتے ہیں اور ان میں ذرہ برابر شک نہیں کرتے جبکہ ہمارے اہل سنت بھائی اس بارے میں تأمل سے کام لیتے ہیں ہوسکتا ہے اس بارے میں بہت سے لوگوں کا قصور بھی نہ ہو کیونکہ وہ ایسے ماحول میں رہ رہے ہوتے ہیں جس میں ان کیلئے ایسی باتیں قابل باور ہوتی نہیں ہوتیں۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحث اور استدلال کیلئے ہمارے پاس ایسی کوئی روشن اور قانع کنندہ دلیلیں ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ ائمہ اطہارؑ خصوصاً حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ دنیا کے کسی فرد بشر کو قیاس نہیں کیا جاسکتا؟ چنانچہ برادران اہل سنت کے ساتھ بحث کے موقع پر بہترین دلیل جوان کیلئے قابل قبول ہوسکتی ہے سب سے پہلے تو قرآن مجید فرقان حمید ہے ،اس پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے،تو کیا ہم قرآن پاک کی کسی آیت سے استدلال کرسکتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت دوسرے لوگوں سے جدا ہے اوران کا مقام دوسروں سے بلند وبالا ہے؟۔

بہت سے علماء شیعہ اور نیز علماء اہل سنت نے اس بارے میں بے انتہا کتابیں لکھی ہیں

کہ بہت سی آیات حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک کتاب ''شواہد التنزیل'' ہے جسے اہل سنت کے برجستہ اور نامور عالم حافظ حسکانی نیشا بوری حنفی نے تالیف کیا ہے، یہ ضخیم کتاب سات سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ان آیات کو جمع کیا گیا ہے جو امیر المومنین علی اور اہل بیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہیں اور پھر ہر آیت سے تعلق رکھنے والی روایات کو اس میں ذکر کیا ہے، اہل سنت کے دوسرے بہت سے علماء نے بھی ایسا ہی کارنامہ انجام دیا ہے اور حضرت علی اور اہل بیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہونے والی آیات اور ان سے متعلق احادیث و روایات کو جمع کیا ہے اور اس بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے حتی کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ دوسرے لوگوں نے ان کے سنی ہونے میں شک کیا اور کہا کہ یہ حضرات شیعہ ہیں۔

بہر حال علماء اہل سنت نے خود حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ تین سو آیات حضرتؑ علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہیں اسی طرح پہلی صدی ہجری کے علماء و مفسرین میں سے ایک عالم اور مفسر قرآن ''مجاہد'' ہیں جنہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ قرآن مجید میں ستر آیات ایسی ہیں جو خصوصیت کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہیں اور ان میں کوئی دوسرا شخص آپ کا شریک نہیں ہے البتہ مذکورہ تین سو آیات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا کامل ترین اور مکمل ترین مصداق علی علیہ السلام ہیں لیکن ان ستر آیات کے متعلق مجاہد کے بقول: ''لَمْ یُشَارِکْهُ فِیْهِ اَحَدٌ'' آپ کا کوئی شریک نہیں صرف آپ ہی سے خاص ہیں ہمارا فرض بنتا ہے کہ اپنے بزرگ اور مرحوم علماء کی قدر کو پہچانیں اور ان کی شان زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کریں، کیونکہ اب بزرگواروں نے کافی زحمتیں اٹھائیں اور مشکلات کا سامنا کیا ہے جس کی وجہ سے ہمیں شیعہ ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے ہمیں ان کی زحمتوں کی قدردانی کرنی

چاہیئے اور عقائد کو محکم تر کرنا چاہیئے اور اس قابل قدر امانت کو پوری دیانتداری کے ساتھ آنے والی نسلوں تک پہنچانا چاہیئے۔ ان گرانقدر ہستیوں میں سے ایک بزرگ شیعہ عالم صاحب تفسیر ''البرہان'' سید ہاشم بحرانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں انہوں نے امیر المومنین علی علیہ السلام کے فضائل بارے بڑے سائز میں ساڑھے سات سو صفحات کی کتاب لکھی ہے جو تقریباً ساڑھے چار سو ابواب پر مشتمل ہے اس کتاب میں ایسا اچھوتا پن ہے کہ جس کی مانند مجھے کسی اور کتاب میں نہیں ملا اس کتاب کے ہر باب کی دو فصلیں ہیں ایک فصل ان روایات پر مشتمل ہے جنہیں حضرات اہل سنت نے نقل کیا ہے، جبکہ دوسری فصل ان روایات پر مشتمل ہے جنہیں علمائے تشیع نے نقل فرمایا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے حضرت امیرؑ کی شان میں ان روایات کو بھی جمع کیا ہے جو اہل سنت علماء سے منقول ہیں حتی کی بعض روایات تو شیعوں سے نقل ہونے والی روایات سے دوگنی ہیں، خداوند عالم مرحوم کو امیر المومنین علیہ السلام کا مہمان قرار دے۔ (آمین)

اپنی بحث کے اس حصے میں ہم ان چند آیات کو بطور نمونہ ذکر کریں گے جو حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

ا۔ علی علیہ السلام شاہدِ رسالت ہیں:

آیا قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت موجود ہے جو اس بات پر دلالت کرے کہ اسلامی امہ میں ایک ایسا شخص بھی ہے جس نے آنحضرتؐ پر وحی کے نزول کو درک کیا ہو؟ آیا کسی شخص کو کوئی ایسی آیت مل سکتی ہے؟ حالانکہ قرآن مجید میں کئی ایسی آیات ہیں جو اس بات کی نشاندہی کر رہی ہیں کہ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کیلئے خدا کی گواہی کے ساتھ ایک انسان بھی گواہ ہے ان میں سے ایک آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول پاکؐ کی

رسالت کا گواہ آنحضرتؐ کے نقش قدم پر چلنے والا بھی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ: "اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّہٖ وَیَتْلُوْہُ شَاھِدٌ مِّنْہُ" (ہود/17) آیا کوئی ایسا ہے جو اپنے پروردگار کی طرف سے روشن، واضح دلیل اور حجت پر قائم ہے اور اس سے ایک شاہد ہے جو اس کا پیروکار ہے۔

مندرجہ بالا آیت ان آیات میں سے ہے جو مرحوم بحرانی کی کتاب "غایۃ المرام" میں منقول ہیں اور اس بارے میں تشیع کی نسبت تسنن کی روایات زیادہ ہیں جو اس بات کی وضاحت کررہی ہیں کہ "ایک ایسا شخص ہے جو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر قائم ہے اور خدا نے اس کیلئے ایک واضح راستہ مقرر کردیا ہے اور وہ اس راہ پر گامزن ہے اور اس کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے وہ چل رہا ہے جو اس بات کا شاہد ہے اور خود اسی میں سے ہے "یَتْلُوْہُ شَاھِدٌ مِنْہ" وہ اس کے نقش قدم پر چل رہا ہے" بالفاظ دیگر یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ "افمن کان علی بینۃ" سے مراد ذات پیغمبر خدا ہے اور بعد از پیغمبرؐ ولی امر وہی ہے جو ان کے پیچھے پیچھے اور نقش قدم پر چل رہا ہے۔

چنانچہ اس آیت کے ذیل میں اہل سنت کی ۲۳ روایات نقل ہوئی ہیں جو اس بات پر دلالت کررہی ہیں کہ یہاں پر "شاہد" سے مراد امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں، جبکہ ۱۱ روایات مکتب اہل بیت سے وارد ہوئی ہیں البتہ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مکتب اہل بیتؑ سے نقل ہونے والی روایات مکتب خلفاء کی روایات کی تعداد سے کم کیوں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ یا تو تقیہ ہے جو شیعیان اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے اختیار کیا گیا ہے یا پھر سابقہ ادوار میں شیعی کتب خانوں کو جلا دیئے جانے کی وجہ سے مکتب اہل بیتؑ کے اصل متون نذر آتش کردیئے گئے ہیں۔

آیت کے بارے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر "یتلوہ شاھدمنہ" آیا

ہے "یَتلُوہُ اَخوہُ" یا "یَتلُوہُ ابنُ عمِّہِ" یا "یَتلُوہُ رَجُلٌ مِّنہُ" کے الفاظ بیان نہیں ہوئے اس کی کیا وجہ ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ یہ شہادت اس شہادت کی مانند ہے جسے ہم اور آپ زبان پر جاری کرتے ہیں اور کہتے ہیں "اَشھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًارَّسُولُ اللّٰہ" (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ، اللہ کے رسول ہیں)۔

کیونکہ یہ شہادت کسی فرد واحد کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ آیت اس کا اظہار کرے اور کہے: "یتلوہ شاھد منہ" کہ وہ شاہد پیغمبر ہی سے ہے اور ان کے ساتھ قریبی تعلق رکھتا ہے اور وہ شاہد "منہ" ہے لہٰذا اس بات میں جس شہادت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے قطعاً وہ شہادت نہیں ہے جو ہم اور آپ روزانہ اپنی زبانوں پر جاری کرتے ہیں بلکہ یہ شہادت اس شخص کی ہونی چاہئے جو یہ کہتا ہے: "میں خوشبوئے نبوت کو سونگھا کرتا تھا، وحی کی آواز کو سنتا تھا، فرشتہ وحی کو دیکھتا تھا" اور پیغمبر اکرمؐ جس کے حق میں کہیں: "اِنَّکَ تَسمَعُ مَااَسمَعُ وَتَریٰ مَااَریٰ" "تم وہی سنتے ہو جو میں سنتا ہوں اور وہی دیکھتے ہو جو میں دیکھتا ہوں"۔

اسی طرح اس میں اگر "شہادت" سے مراد "ایمان" ہو تو پھر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے علاوہ اور بھی کئی مومنین تھے، حتیٰ کہ اگر ہم رسالت کے ابتدائی ترین ایام کو بھی دیکھیں تو ہمیں اس وقت بھی امیر المومنین علی علیہ السلام کے علاوہ جناب خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام بھی اس صف میں نظر آتی ہیں، بنابریں اگر "شہادت" سے مراد "ایمان" ہوتا تو آیت میں لفظ "شاہد" جو مفرد ہے کی جگہ "شاہدین" یعنی جمع کا لفظ آتا۔

بنابریں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس آیت میں شہادت سے مراد ایسی شہادت ہے جو "عینی ادراک" پر مشتمل ہے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کون ایسا شخص ہے جو اس قسم کی شہادت پر قدرت رکھتا ہے، اور خدا فرماتا ہے "شاھد منہ" خود اسی کی ذات سے ہے،

چنانچہ جو لوگ کسی دوسری قوم، دوسرے قبیلے، دوسری ذات اور دوسرے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان پر "شاھد منہ" کا اطلاق نہیں ہوتا، اسی طرح اہل بیت پیغمبرؐ میں سے بھی کسی نے علیؑ کے سوا اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ "وہ شاہد میں ہوں" اور نہ ہی کسی روایت میں ملتا ہے کہ "یہاں پر "شاہد" سے مراد علیؑ کے سوا کوئی اور ہے"۔

لہٰذا "شاھد منہ" سے مراد قطعی طور پر امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں اور یہ فضیلت خاص کر انہی کے ساتھ ہی تعلق رکھتی ہے۔

۲: علی علیہ السلام حامل علم کتاب ہے

ایک اور روایت میں خداوند عالم فرماتا ہے: "قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ" کہہ دیجئے کہ کافی ہے خدا اور وہ شخص جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہو۔ (رعد/43)

خداوند عالم اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی خاطر کے طور پر ان سے فرما رہا ہے کہ: "اس ٹولے سے نہ گھبرایئے جو آپؐ کی تکذیب کرتے ہیں یا آپؐ کی رسالت کو قبول نہیں کرتے، خدا گواہی دیتا ہے کہ آپؐ اس کے رسول ہیں اور ایک اور شخص بھی اس کا گواہ ہے" اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گواہ کون ہوسکتا ہے کہ جس کی گواہی خدا کی گواہی کے ساتھ ساتھ ہے اور حضرت رسالتمآبؐ کی تسلی خاطر کا موجب بن سکتی ہے؟ تو خدا فرماتا ہے وہ شخص وہ ہے: "عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَاب" اس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے۔

سابقہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ "وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ" وہ شاہد خود پیغمبر اکرمؐ سے ہے اور ان کے اہل بیت سے ہے، جبکہ اس آیت میں اس "شاہد رسالت" کا تعارف کراتے ہوئے

فرمایا کہ: ''وہ شاہد ''علم الکتاب'' کا حامل ہے''۔

اس آیت کی تفسیر اور ''مَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتَاب'' سے مقصود و مراد کے بیان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث وارد ہوئی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

امام علیہ السلام نے راوی سے فرمایا: ''جو شخص تختِ بلقیس کو پلک جھپکنے کی دیر میں ''سباء'' سے حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں لے آیا، اس کے پاس کتنا علم تھا؟'' راوی نے امامؑ کے اس سوال کے جواب میں عرض کیا: ''اَلَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِنَ الْکِتَابِ'' وہی کہ جس کے پاس کتاب کا تھوڑا سا علم تھا'' امام علیہ السلام نے پوچھا ''جس کے پاس کچھ کتاب کا علم ہو اور جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہو، ان کا آپس میں کس قدر تفاوت ہے؟ جس کے پاس کتاب کا تھوڑا سا علم تھا وہ اپنے اسی علم کی قدرت سے پلک جھپکنے کی دیر میں تختِ بلقیس کو یمن سے فلسطین لے آتا ہے جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اسی دیر میں اپنے پاس موجود پایا، تو یہ ایک مختصر سے علم کی قدرت ہے''۔ پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: '' آصف بن برخیا کا علم، ہمارے علم کے مقابلے میں ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں قطرہ ہوتا ہے، آصف نے اپنے اس مختصر سے علم کی وجہ سے یہ قدرت نمائی کی جبکہ ''عِنْدَنَا وَاللّٰہِ عِلْمُ الْکِتَابِ کُلِّہٖ'' (اصول کافی جلد ا ص ۲۵۷ روایت ۳، باب تمام قرآن کو صرف ائمہؑ نے جمع کیا ہے) واللہ! ہمارے پاس پوری کتاب کا علم ہے'' ایسی کتاب کہ جس کے علم کے ایک قطرہ نے آصف بن برخیا کو اس قدر، قدرت عطا کی تو جن کے پاس پوری کتاب کا علم ہے ان کی عظمت کیا ہوگی؟ امام علیہ السلام کی اس فرمائش کے مطابق حضرات ائمہ علیہم السلام کہ جن میں سرِ فہرست امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں ایسی ہستیاں ہیں کہ جن کے پاس پوری کتاب کا علم ہے۔

اسی بنا پر چونکہ حضرت علی علیہ السلام ایسی ہستی ہیں کہ جن کے پاس پوری کتاب کا علم ہے لہٰذا اگر وہ پیغمبر اکرمؐ کی صداقت کی گواہی دیں تو ان کی یہ گواہی خدا کی شہادت کے ساتھ ہی ساتھ شمار ہوگی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا بَیْنِیْ وَبَیْنَكُم وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ''(رعد/43)

۳۔ حضرت علیؑ اور آیت مباہلہ

حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت اور ان کے علوم رتبت کو جو آیات بیان کر رہی ہیں ان میں سے ایک آیۂ مباہلہ ہے، یہ آیت انہیں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم پلہ قرار دے رہی ہے۔ جبکہ ''مباہلہ'' کی داستان کچھ اس طرح ہے کہ:

جب سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تبلیغ تمام جزیرۃ العرب میں پھیل گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان آیات کے ذریعہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کو اسلام کی دعوت دی جو ان لوگوں کے بارے میں تھیں اور آیات اس مضمون پر مشتمل تھیں کہ پیغمبر اسلامؐ کا تعارف اس سے پہلے تمہیں کرایا گیا ہے اور تم انہیں بخوبی پہچانتے ہو'' یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَائَهُمْ ''انہیں ایسے پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں (بقرہ/126) یعنی یہ وہی پیغمبرؐ ہیں کے ظہور کی بشارت حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام دے چکے ہیں''وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَد ''اور میں خوشخبری دے رہا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام ''احمدؐ'' ہوگا۔ (صف/6)

جزیرۃ العرب کے جنوبی حصہ میں ''نجران'' نامی ایک جگہ ہے جو اہل کتاب کا مرکز اور مسیحی علماء ودانشوروں کے صدر مقام کی حیثیت رکھتی تھی، چنانچہ جب حضورؐ کی رسالت کی خبر منتشر

ہوئی اور نجران پہنچی تو یہاں کے علماء کا ایک گروہ حضور اکرمؐ سے بحث ومناظرے کی غرض سے مدینہ آیا، پیغمبرؐ نے انہیں شرف باریابی عطا فرمایا اور مناظرہ شروع ہوگیا:

نجران والوں نے پوچھا: ''آپ کس کے فرزند ہیں؟''

فرمایا: ''میں عبداللہ کا بیٹا ہوں'' اسی طرح ان لوگوں نے گزشتہ کچھ افراد کا نام لیا کہ وہ کن کے بیٹے تھے؟ تو حضورؐ نے اس سوال کا جواب بھی دیا، تو انہوں نے سوال کیا کہ: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کس کے فرزند تھے؟'' چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے لہٰذا ان لوگوں کو یہ توقع تھی کہ آپ کہیں گے کہ: ''خدا کے بیٹے!'' مگر حضرتؐ خاموش رہے جس پر فوراً ہی اس مضمون کی آیت نازل ہوئی کہ: ''حضرت عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ جیسی ہے'' ''اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ'' (آل عمران/59) یعنی اگر ہر انسان کا باپ ہونا چاہئے تو پھر حضرت آدم علیہ السلام کا باپ بھی ہونا چاہئے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی ماں تو تھیں جبکہ آدمؑ کی ماں بھی نہیں تھیں اور اللہ نے ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا کیا۔

اس جواب سے علماء نجران بحث میں لاجواب ہوگئے، مگر اس کے باوجود انہوں نے شکست تسلیم کرکے اسلام قبول نہ کیا بلکہ ''مباہلہ'' کی دعوت دی۔

''مباہلہ'' کچھ مراسم کا نام ہے جو سابقہ ادیان میں بھی رائج تھا اور وہ یہ کہ فریقین جب اک دوسرے کو بحث ومباحثہ کے ذریعہ قانع نہیں کر سکتے تھے تو ایک دوسرے کے مقابلے میں آکر ان الفاظ میں نفرین کرتے تھے: ''خداوندا! ہم میں سے جو فریق باطل پر ہے اسے اپنے عذاب کے ساتھ ہلاک کردے!''۔

چنانچہ جب نصاریٰ مباہلہ کی پیشکش کی تو آنحضرتؐ نے اسے قبول فرمالیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی: ''فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآئَنَا وَاَبْنَآئَكُمْ وَنِسَآئَنَا وَنِسَآئَكُمْ وَاَنْفُسَنَا

وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْکَاذِبِیْنَ ''تو اے پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجئے کہ آؤ!! ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو تم اپنی عورتوں کو ہم اپنی جانوں کو تم اپنی جانوں کو بلاؤ پھر ہم مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں ۔ (آل عمران/59) چنانچہ طے پایا کہ چند روز بعد مباہلہ کے لئے میدان میں آحاضر ہوں، دو تین دن روزے رکھے گئے اور پھر جناب سرکار رسالتمآبؐ نے اپنے ہمراہ علی بن ابی طالبؑ، فاطمہ زہراؑ اور حسنین شریفین کو لیا، باوجودیکہ، اس وقت آنحضرتؐ کی بیویاں بھی تھیں اور آیت میں بھی ''نسائنا'' کا لفظ ہے لیکن حضور نے ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لیا بلکہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو اپنے ہمراہ لیا اور علی بن ابی طالب اور حسن و حسین علیہم السلام کو مباہلہ کیلئے اپنے ساتھ میدان میں لے آئے۔

نجران کے بڑے پادری نے جب دور سے ان بزرگواروں کے نورانی چہرے دیکھے تو اپنی قوم والوں سے کہا: ''میں ایسے لوگوں کے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ خدا سے دعا کریں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو قبول کرلے گا، ایسے لوگوں کے ساتھ مباہلہ نہ کرنا ورنہ ایسی آگ نازل ہوگی جو ہم سب کو جلا کر بھسم کردے گی اور قیامت تک کوئی نصرانی روئے زمین پر باقی نہیں رہے گا، لہٰذا واپس چلو اور مباہلہ نہ کرو، انجام کار ایسا ہی ہوا اور انہوں نے مباہلہ نہ کیا اور جزیہ دینا منظور کیا''۔

نوٹ :یادرہے پیغمبر اکرمؐ کی نصاریٰ کے ساتھ مباہلہ کی داستان متعدد روایات میں بیان ہوئی ہے اور یہ تمام روایات اگرچہ اس اصل قضیہ کی نقل میں متفق ہیں لیکن بعض روایات میں اس ماجرا کی جزئیات میں قدرے اختلاف ہے، بہتر ہے اس بارے میں

مزید معلومات کیلئے کتاب بحار الانوار جلد ۲۱ باب ۳۲ کا مطالعہ کیا جائے۔

مباہلہ کے بارے میں نازل ہونے والی آیت مجیدہ کے سلسلے میں جو بحثیں ہو سکتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آیت کے الفاظ کے مطابق حضور گرامی کو اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ مباہلہ میں شرکت کرنا چاہئے تھی لیکن چونکہ حسن اور حسین علیہما السلام کے سوا آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی لہٰذا ان دو معصوم ہستیوں کا اپنے ہمراہ لانا آیت کے مطابق تھا لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ آیت میں ''نسائنا'' جمع کا صیغہ آیا ہے لیکن حضورؐ نے اس سلسلے میں اپنی بیویوں کو اپنے ہمراہ لانے کی بجائے صرف جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو اپنے ساتھ لیا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اسی طرح آیت میں ''ابنائنا'' اور ''نسائنا'' اور ''انفسنا'' کا ذکر ہے، یہاں پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اس بارے میں اپنے علاوہ حضرت علی علیہ السلام کو اپنے ساتھ کیوں لائے؟ اگر ''انفسنا'' سے مراد صرف حضورؐ کی ذات ہے تو پھر علیؑ کو کس دلیل کی بنا پر اپنے ساتھ لائے؟ اگر آیت کا مقصد یہ ہے کہ حضورؐ اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ مباہلہ میں تشریف لائیں تو پھر حضورؐ نے اپنی بیویوں کو ہمراہ کیوں نہ لیا اور صرف علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسین علیہ السلام کو اپنے ساتھ کیوں لائے؟۔

اس بارے میں بہت سی روایات بیان ہوئی ہیں یہ وہ بزرگوار ہستیاں تھیں کہ اگر وہ بددعا کر دیں تو اہل باطل کا نام ونشان تک مٹ جائے، کیونکہ، جبکہ دوسرے لوگوں میں اس کام -مباہلہ میں شرکت- کی صلاحیت نہیں تھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہ حضرت علی علیہ السلام ''انفسنا'' کا مصداق ہیں یعنی صرف حضرت علی علیہ السلام ہی پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور نفس بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کی جان کے بمنزلہ ہیں اور یہ وہ فضیلت ہے جس میں نہ

تو کوئی شریک ہوا اور نہ ہو سکے گا، کیونکہ یہ پیغمبرؐ کے بعد کسی شخص کیلئے بلند ترین مقام و مرتبہ ہے جو کسی کے تصور میں آ سکتا ہے۔

اہل سنت کے ایک عظیم عالم سے پوچھا گیا کہ: اصحاب پیغمبرؐ میں سے کس صحابی کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے؟ تو انہوں نے علی علیہ السلام کا نام لئے بغیر جواب میں چند ایک اصحاب و خلفاء کا نام لے کر کہا کہ "یہ ہیں" لوگوں نے پوچھا: "آپ نے علی علیہ السلام کا نام کیوں نہیں لیا" کہا "تم نے مجھ سے اصحاب پیغمبر کا پوچھا ہے جان پیغمبر کا نہیں کیونکہ علی "نفس نبی ہیں" جبکہ دیگر لوگ "اصحاب نبی" ہیں" اور اپنے اس دعویٰ کی دلیل کیلئے آیت مباہلہ کی تلاوت کی۔

جو پیغمبر کی جان اور نبی کا نفس ہے وہی تو ہے جس کا اور نبی کا نور ایک ہے، شیعہ اور سنی بہت سے علماء نے کثیر تعداد میں روایات کو نقل کیا ہے جن میں کہا گیا ہے: "محمدؐ اور علیؑ ایک ہی نور سے ہیں"۔ ملاحظہ ہو بحار الانوار جلد ۱۵ باب ۱ روایت ۱۲۔ جلد ۱۶ باب ۶ روایت ۱۴۴۔ جلد ۲۵ باب ۱ روایت ۱۵ اور کتاب مناقب ابن مغازلی ص ۸۸، ۱۳۰۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث کے خاتمے پر اپنے علمائے معاصر میں سے ایک عالم بزرگوار مرحوم آقای فیروز آبادی کی کتاب "فضائل الخمسة في صحاح الستة" سے کچھ احادیث کو نقل کیا جائے مرحوم فیروز آبادی کا شمار دور حاضر کے ان محقق علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے تشیع کے فروغ کیلئے شایان شان خدمات انجام دی ہیں اور ایک کتاب "فضائل الخمسة في صحاح الستة" کے نام سے تین جلدوں میں تالیف کی ہے جس کے آغاز میں انہوں نے اہل تسنن کے صحاح ستہ سے فضائل اہل بیت علیہم السلام کو نقل فرمایا ہے اور پھر دوسری کتابوں سے اس طرح کے فضائل کا اضافہ کر کے کتاب کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے منجملہ اور روایات کے جو انہوں نے صحاح مذکورہ سے نقل کی ہیں کئی ایک روایات اس مضمون کی بھی ہیں کہ:

''خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کی تخلیق سے پہلے حضرت رسول خداؐ اور مولا علی علیہ السلام کے نور کو خلق فرمایا ہے''۔

خلاصہ بحث: ہم نے اس نشست میں ائمہ اطہار علیہم السلام کے بارے میں بعض شیعی عقائد کے بارے میں بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ عظیم الشان ہستیاں، عام لوگوں سے ہٹ کر اور انہیں دنیا کے دوسرے انسانوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، ایام طفولیت میں درجہ امامت پر فائز ہوئے ہیں ایام رضاعت میں علوم الٰہی سے بہرہ مند ہوتے ہیں بلکہ پیدا ہونے سے پہلے ان علوم سے بہرہ مند ہو چکے ہوتے ہیں اور تسبیح خداوندی بجالا چکے ہوتے ہیں بنابریں ان کی ظرفیت وجودی ہم سے بہت ہی مختلف ہے، اگرچہ وہ بظاہر بشر ہیں لیکن ان میں اور دوسرے انسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس بحث میں ہم نے زیادہ تر ان دلائل سے کام لیا ہے جو برادران اہل سنت کے نزدیک قابل قبول ہیں، قرآن مجید کی آیات سے استدلال کرتے ہوئے اور ان کی تائید وتفسیر اہل سنت کی ان روایات سے پیش کی ہے جو سنی مکتب فکر سے مروی ہی حضرت علیؑ کی تین فضیلتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ: ا۔ ''علی علیہ السلام نفس نبی اور جان پیغمبرؐ ہیں'' ۲۔ ''رسالت پیغمبر ختمی مرتبت کے شاہد ہیں'' اور ۳۔ ''ان تمام علوم کے حامل ہیں جو کتاب اللہ میں موجود ہیں اور جس کا صرف ایک مختصر سا حصہ آصف بن برخیا کو عطا ہوا تھا اور انہوں نے تخت بلقیس کو یمن سے سرزمین فلسطین میں پلک جھپکنے کی دیر میں حاضر کر کے ایک عظیم اور بے نظیر کارنامہ نجام دیا''۔

۳

حضرت علی علیہ السلام کے فضائل بارے بعض شکوک وشبہات کا مدلل جواب

گزشتہ مطالب کا خلاصہ:

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کچھ فضائل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور مقدمہ کے طور پر بتا چکے ہیں کہ ان فضائل کی تین قسمیں ہیں ایک تو وہ وہبی فضائل ہیں جو اللہ نے انہیں عطا فرمائے ہیں لیکن یہ فضائل براہ راست آپ کے اعمال وکردار میں اثر انداز نہیں ہیں۔ جیسے آپ علیہ السلام کا خانہ کعبہ میں پیدا ہونا۔ جو یقیناً ایک خاص خدائی عطیہ ہے مگر اس کا براہ راست آپ کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں ہے۔

دوسرے وہ فضائل ہیں کہ جو مواہب خداوندی ہیں اور ان کی شخصیت وکردار میں اثر انداز بھی ہیں اور ان فضائل میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور تمام ائمہ اطہار علیہم السلام برابر کے شریک ہیں، خداوند عالم نے ان عظیم ہستیوں کو ایسی روحانی پاکیزگی اور نورانیت عطا فرمائی ہے کہ انہوں نے پیدا ہوتے ہی بلکہ قبل از ولادت ایسے حقائق کا مشاہدہ فرمایا جنہیں دوسرے لوگ کمال عقل کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی درک کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔

اس بارے میں ہم نے خود حضرت امیر علیہ السلام کے کلام کی طرف اشارہ کیا ہے جسے آپ نے نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ میں بیان فرمایا ہے ارشاد کیا: ''آنحضرتؐ کے مبعوث برسالت ہونے سے پہلے میں ان کا ساتھی اور ہمقدم تھا، جس زمانے میں وحی نازل ہوتی تھی میں

اس کی صدا کو سنا کرتا تھا حتی کہ میں نے شیطان کی چیخ کو بھی سنا اور آنحضرتؐ سے اس بارے میں سوال کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ: یہ شیطان کی چیخ ہے اور ہمارے مبعوث ہونے کی وجہ سے مایوس ہو کر اس نے یہ چیخ ماری ہے، پھر حضورؐ نے فرمایا: ''اِنَّکَ تَسمَعُ مَااَسمَعُ وَتَریٰ مَااَریٰ اِلَّا اَنَّکَ لَستَ بِنَبِیٍّ '' جو کچھ میں سنتا ہوں وہ تم بھی سنتے ہو اور جو کچھ میں دیکھتا ہوں وہ تم بھی دیکھتے ہو مگر تم نبی نہیں ہو''۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۲۳۴ خطبہ قاصعہ)

دس سال یا اس سے پہلے کی عمر میں جو نورانیت مولا علی علیہ السلام میں پائی جاتی تھی کہ جس کی وجہ سے آپ وحی کی آواز کو سنتے تھے یا بلکہ بعض موقعوں پر فرشتہ وحی کو دیکھتے بھی تھے یہ خداوند عالم کی طرف سے آپ کو خصوصی امتیاز ملا ہوا تھا جو دوسرے لوگوں کو عطا نہیں ہوا تھا اور خصوصی امتیاز آپ علیہ السلام کی نورانی شخصیت میں بہت اثر انداز ہوا اور آپ کی شخصیت کو اجاگر کیا۔

اس خدائی عطیہ کی مثال آپ یوں سمجھئے جس طرح دوسرے لوگوں کو اللہ نے ''عقل'' کی نعمت سے نوازا ہے چنانچہ جو شخص بے وقوف اور دیوانہ ہے یعنی اس نعمت سے کم بہرہ مند ہوا ہے یا بالکل ہی بے بہرہ ہے اس کا کردار، رفتار اور شخصیت اس شخص سے بہت ہی مختلف ہے جو عقل کی دولت سے مالا مال ہے۔

بہر حال امیر المومنین کا یہ خاص امتیاز اور آپ کی یہ خصوصی نورانیت آپ کی شخصیت میں بہت زیادہ اثر انداز ہوئی ہے۔ آپ کی یہ طولانی عبادتیں، قضا و حکومت کے مقام پر آپ کا منصفانہ رویہ، دنیاوی امور میں زہد و ورع کی پابندی، میدان جنگ میں شجاعت و مردانگی اور بے مثال اور بے نظیر ایثار و فداکاری وغیرہ وغیرہ...... یہ سب آپ علیہ السلام کی اسی نورانیت کے آثار اور اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں اور یہ سب آپ کے ارادہ و اختیار اور اپنی مرضی سے عمل میں آئے

نا کہ کسی قسم کے جبر کے تحت وقوع پذیر ہوئے، یعنی آپ یہ سب کچھ بجالانے میں مختار تھے مجبور نہیں تھے جس طرح کہ "عقل" کی نعمت اس بات کا موجب نہیں ہوتی کہ عقلمند انسان، نیک اور پسندیدہ کاموں کی انجام دہی میں مجبور ہو۔

جبکہ تیسری قسم کے وہ فضائل ہیں جو آپ کی طرف سے اکتسابی ہیں اور آپ نے وہ فضائل مکمل طور پر اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ کسب کیے جیسے عبادت کی بجا آوری، عوام الناس کی خدمت، جنگوں میں شرکت اور فتوحات کا حصول وغیرہ اس کے چند نمونے ہیں۔

آیا غیر کسبی فضائل جبر کے موجب ہیں؟

امیر المومنین اور دیگر معصومین علیہم السلام کے دوسری قسم کے فضائل اور مواہب کے بارے میں کچھ ابہام اور شکوک وشبہات پیدا کیے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ: "اگر خداوند عالم یہی فضائل ہمیں عطا فرماتا اور ہمیں بھی انہی مواہب سے نوازتا تو ہم بھی حضرت علیؑ کی مانند ہوتے، اگر ہم بھی معصوم ہوتے تو انبیاءؑ کی طرح ہوتے، بنا بریں انبیاءؑ اور ائمہ علیہ السلام کو حقیقت میں دوسروں پر کوئی فضیلت اور کمال حاصل نہیں ہے ان کے بقول

فیض روح القدس ارباز مدد فرماید ○ ○ دیگران ہم بکنند آنچہ مسیحا کردد

یعنی اگر آج بھی روح القدس کی کسی کو مدد حاصل ہو تو وہ بھی وہی کر دکھائے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا یعنی وہ بھی مردے کو زندہ کردے مادرزاد اندھوں کو بینا کردے وغیرہ"۔

ان لوگوں کا اس قسم کے شکوک وشبہات پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ: ایک تو اس قسم کے مطالب کہ ان ذوات قدسیہ کے یہ فضائل ہیں، قدرت کے یہ انعامات اور مواہب ہیں وغیرہ سرے سے ہی بے بنیاد اور افسانوی باتیں ہیں، ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور اگر فرض کرلیا

جائے کہ ان کا وجود ہے تو ایسے مواہب وانعامات کا حصول ان لوگوں کیلئے کسی فضیلت کا موجب نہیں ہیں کیونکہ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ان حضرات کے اختیار سے باہر ہیں اور وہ ان کے حصول میں مجبور ہیں اگر یہ فضائل ہمیں عطا ہوتے ہم بھی انہی کے مانند ہوتے، بنابریں ان کرامات کا حصول ان کیلئے کسی قسم کا اعزاز وافتخار شمار نہیں ہوتا۔

چونکہ اس قسم کے شکوک بار بار لوگوں کے دلوں میں پیدا کئے جاتے ہیں لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ان فضائل کے بارے میں خوب غور وفکر کر کے ان کیلئے منطقی جواب تیار کئے جائیں تا کہ وہ اس قسم کے مسکت جواب سے قانع ہو جائیں۔

اس قسم کے شبہات کیلئے اجمالی جواب تو یہ ہے کہ اگر چہ یہ فضائل ومواہب، خدادادی ہیں لیکن اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ یہ ان کے مجبور ہونے کا سبب بھی ہیں، نہ، ایسا نہیں ہے، ان مواہب وفضائل میں ان عظیم ہستیوں کا امتیاز اسی بات میں ہے کہ انہوں نے ان فضائل ومواہب سے ''اپنے مکمل اختیار'' کے ساتھ کمال استفادہ کیا اور ان کے اس بارے میں مکمل طور پر خود مختار ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس قسم کے فضائل وکمالات سے ''بلعم باعورا'' جیسے شخص کو بھی نوازا گیا تھا مگر اس نے ان سے نہ صرف پورا فائدہ ہی نہیں اٹھایا بلکہ انہیں غلط طور پر استعمال کر کے ناجائز مفادات بھی اٹھائے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ دنیا وآخرت میں لعنت کا مستحق قرار پایا۔

اس طرح کی ایک اور مثال خود ہمارے اندر بھی موجود ہے وہ ہے ''عقل کی نعمت'' کیونکہ عقل ایک خداداد عطیہ ہے جو انسان کو کسی کوشش کے بغیر عطا ہوا ہے جس کے ذریعہ ہم اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکتے ہیں، یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ نعمت خداوندی اور عطیہ الٰہی ہم سے سلب اختیار کا موجب ہے؟ اور چونکہ ہم اس کی مدد سے اچھائی اور برائی کے درمیان فرق پیدا کرتے ہیں لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ حتماً اچھے کام انجام دیں اور برے کاموں کو ترک کر دیں

اوراس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے؟ آیا اچھائی اور برائی کا فقط ادراک یا اچھے کاموں کی طرف ہمارا صرف رجحان اس بات کا باعث بن جاتا ہے کہ انسان ایسے کاموں کی انجام دہی کیلئے مجبور ہے؟۔

چونکہ انسان فطری طور پر اچھائی اور نیکی کا خواہاں ہوتا ہے لہٰذا جو شخص نیک کام انجام دیتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے؟ گناہوں اور برے کاموں کے بارے میں بھی کبھی انسان سوچتا تک نہیں تو کیا یہ اس کیلئے مجبوری کا سبب ہے؟ بہت سے برے اور ناشائستہ کام جو بنیادی طور پر کسی بھی وقت انسان کے ذہن میں خیال کی صورت تک متصور نہیں ہوتے کیونکہ وہ اس قدر پلید اور ناشائستہ ہوتے ہیں کہ انسان ان سے متنفر ہو جاتا ہے اور کبھی ان کی انجام دہی کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا تو کیا ایسا کرنے میں وہ مجبور ہے؟ آیا ممکن ہے کہ کوئی شخص حتی کہ ایک مرتبہ بھی اس بات کا تصور کرے کہ نجس غذا کھائے گا؟ اس بارے میں سوچنا تو درکنار بات کرنا بھی نامناسب ہے تو ایسا شخص جو نجس غذا نہیں کھائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایسا کرنے میں مجبور ہے؟ واضح سی بات ہے کہ کسی کام کی استعداد رکھنا، خیر اور نیکی کا سمجھنا اور اس کی طرف میلان پیدا کرنا، یا گناہ کی انجام دہی کیلئے رغبت پیدا کرنا کوئی بھی چیز انسان کو اس کی انجام دہی پر مجبور نہیں کرتی۔

فضیلت اسی بات میں ہے کہ ہر شخص کو جو خداداد سرمایہ ملا ہوا ہے چاہے وہ علم وعقل ہے یا ذکاوت واستعداد، تو اسے بہترین طریقے پر خدا کے قرب کے حصول، اپنے ارتقاء وتکامل اور خلق خدا کی خدمت بجالانے کیلئے استعمال میں لائے اور یہ استعمال انسان کے اپنے ارادہ و اختیار میں ہے، انسان چاہے تو اس سے کمال کی راہوں میں استعمال کیلئے استفادہ کرے اور چاہے تو اپنے سقوط وانحطاط اور پستی میں گرنے کیلئے غلط استفادہ کرے۔

اسی طرح یہ بات بھی صحیح ہے کہ ایک یکسالہ بچہ عقل وفہم اور اچھے برے کی شناخت کے

سلسلے میں ایک بیس سالہ شخص کے برابر نہیں ہو سکتا لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں چونکہ اس بیس سالہ انسان کی عقل زیادہ کامل ہے لہٰذہ وہ نیک کام بجالانے کیلئے مجبور ہے اسی طرح ایک عام آدمی اور ایک نابغہ روزگار شخصیت کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔

بعض لوگ ایک خاص ''نبوغ'' کے حامل ہوتے ہیں جو اپنے بچپن میں ہی ایسے ایسے مطالب سمجھ لیتے ہیں کہ جن کے ادراک سے بڑی عمر کے افراد عاجز ہوتے ہیں، لیکن ان کا نبوغ اور خصوصی استعداد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ ایسا کرنے میں مجبور ہیں، یہ استعداد خداداد سرمایہ ہے جس کے آپ اور ہم حامل ہیں، اب اس کے استعمال میں ہم کس قدر اپنے اختیار سے کام لیتے ہیں؟۔

اسی طرح اصل فہم انسان کیلئے ایک خدائی عطیہ ہے، جبکہ یہ عطیہ حیوانات کو نہیں ملا، اگر ملا ہے تو بہت کم جانوروں کو، تو کیا چونکہ ہم اس کے حامل ہیں لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ نیک کام کریں؟ نہیں بلکہ فہم کی نعمت سے سرفراز ہونا اس استعداد کا ہونا انسان کیلئے خود مختار ہونے کی راہ ہموار کرتا ہے اگر انسان نیک اور بد کو نہ سمجھے تو پھر وہ کس طرح نیک کاموں کو انجام دے گا اور برے کاموں کو ترک کرے گا؟ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا چونکہ خدا نے یہ فضیلت جس کو عطا کی ہے اس نے اسے مجبور بنا دیا ہے۔

اس مقدمہ کے بعد ہم ایک بار پھر اصل شبہے کی کی طرف جاتے ہیں اور وہ یہ کہ: ''اہل بیت عظامؑ، ائمہ اطہارؑ، انبیاء گرامیؑ کے فضائل اور کمالات بارے دو صورتیں قابل تصور ہیں اور وہ یہ کہ: ا۔ یہ فضائل خداداد ہیں تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مجبور ہیں کہ ان فضائل کے حامل ہوں اور یہ چیز ایسی نہیں ہے جس پر فخر کیا

جا سکے کیونکہ اگر ہم بھی ایسے فضائل سے نوازے جاتے تو ہم بھی انہی کی مانند ہوتے!۔۲: یہ فضائل کسبی ہیں تو پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ خداوند عالم نے انہیں دوسری مخلوق سے مختلف خلق فرمایا ہے اور اصل خلقت میں انہیں یہ خصوصیت عطا فرمائی ہے؟ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ بزرگوار ہستیاں نور سے خلق کی گئی ہیں، زمانہ طفلی میں عظیم ترین مسائل کا ادراک رکھتے تھے، ان کی روح پاکیزہ تھی یا خداوند عالم نے ان کے ساتھ ایک فرشتہ مقرر کر رکھا تھا؟..................... ...."

مذکورہ بالا مقدمہ کے بیان کرنے کے ساتھ ہی اگر غور کیا جائے تو اس شبہے کا جواب خود بخود روشن ہو جاتا ہے وہ یہ کہ ان فضائل اور عطیات کا خداداد ہونا اس معنی میں ہے کہ ان کی اصل خداداد ہے، خداوند عز وجل نے انہیں عقل، نورانیت، صفائے باطن اور علم سے بہرہ مند فرمایا ہے، تو اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اب وہ مجبور ہو گئے ہیں اور ان کے اختیارات اس بارے سلب ہو گئے ہیں بلکہ علم و نورانیت سے ان کے استفادہ کا طریقہ کار اختیاری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بعض دوسرے لوگوں کو بھی ایسے فضائل سے نوازا تھا مگر انہوں نے اس خداداد عطیہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور غلط استعمال کیا، خدا کی طرف سے فضائل و عطیات کی نوازش افراد کی مصلحتوں کی بنا پر ہوتی ہے، لہٰذا جو لوگ ایسے مواہب و فضائل کے حامل نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان فضائل کے حامل ہونے میں ان کی مصلحت نہیں یا وہ اس کے اہل نہیں ہیں، ان کی قدر کو نہیں جانتے، چنانچہ اس قسم کے چند نمونوں کو خداوند عالم نے ذکر فرمایا ہے ہمیں معلوم ہو کہ کچھ لوگوں کو ان کے فضائل سے نوازا تو گیا لیکن انہوں نے ان سے ناجائز مفاد اٹھایا اور وہ

بڑے بڑے مصائب و بلاؤں میں مبتلا ہو گئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے مواہب و فضائل جو عطیہ خداوندی ہیں اور جس سے ان کے خاص بندے نوازے گئے ہیں وہ بغیر حکمت کے نہیں ہے "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ" خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کس میں قرار دے اور اس رسالت کے حامل بننے کا کون اہل ہے؟۔ (انعام/ 124)

بنابریں اگر چہ اس سرمایہ کی اصل من جانب اللہ ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حضرات مجبور ہیں، کیونکہ ان خدائی عطیوں و مواہب سے بہرہ گیری اختیاری ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم (بنی اسرائیل) میں سے ایک شخص - کہ روایت میں جسے "بلعم باعورا" کے نام سے یاد کیا گیا ہے- کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے: "وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيْ آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا.........." "ہم نے اپنے بعض بندوں کو کچھ اعزازات سے نوازا، اسے خاص امتیاز عطا فرمایا اور قابل فخر فضائل عطا کئے "فَانْسَلَخَ مِنْهَا" لیکن وہ ان سے عاری ہوا (اعراف/ 175) خداوند عالم فرماتا ہے ہم نے اسے اپنی آیات عطا کیں یہ ایک خاص تعبیر ہے جس سے ملتی جلتی تعبیریں انبیاء واولیاء کے بارے میں استعمال ہوئی ہیں۔

اگر یہ مانا جائے کہ "جبر" کا عمل دخل ہے تو یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے اپنی ان آیات سے اسے رفعت عطا کی اور اسے بلند ترین مقامات تک پہنچایا "وَلٰكِنَّهُ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ" لیکن اس نے اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا اور اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ (ایضاً/ 176) اس نے خدا کے ان عطیات کی ناقدری کی اور ان سے ناجائز فائدے اٹھائے "فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ" تو اس کی مثال کتے جیسی ہے (ایضاً/ 176) یعنی اس نے اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کر کے ناجائز مفادات اٹھا کر خود کو اتنا پست و ذلیل

کردیا کہ ایک کتے کی مانند ہو گیا۔

پس معلوم ہوا کہ اگر خدا کسی کو فضائل و مواہب عطا کرتا ہے تو وہ ان سے استفادہ کرنے میں مجبور نہیں ہے، بلکہ مکمل طور پر مختار ہے چاہے ان سے صحیح استفادہ کرے چاہے غلط مفادات اٹھائے اگر خدا چاہتا تو زبردستی لوگوں کو راہِ راست پر لے آتا "لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا" اگر خدا چاہتا تو یقیناً تمام لوگوں کو ہدایت کرتا (رعد/ 31) لیکن انسان کی تخلیق کچھ اس طرح سے ہوئی ہے کہ وہ اپنے مکمل ارادے اور اختیار سے اپنی راہوں کو متعین کرتا ہے "لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ" اگر خدا چاہتا تو روئے زمین کے تمام لوگ ایمان لے آتے (یونس/ 99) لیکن اس طرح کے ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی۔

خلاصہ بحث یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی علیہ السلام کو کچھ ایسے فضائل عطا فرمائے جو ان کی شخصیت پر اثر انداز نہیں ہیں بلکہ ایسی خداد فضیلتیں ہیں جو کسی اور کو عطا نہیں ہوئیں ایسے فضائل کے بارے میں نہ تو بحث کی جاتی ہے اور نہ ہی وہ محل اشکال ہیں اور کچھ فضائل ایسے ہیں جو آپ کی شخصیت میں موثر ہیں اور اس کو نکھارا ہے اور چار چاند لگائے ہیں جیسے آپ کی وہ نورانیت ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی ہے یا وہ تربیت ہے جو پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے آپ کو روز ولادت ہی سے حاصل ہوئی ہے۔ جس کے بارے میں آپ خود فرماتے ہیں کہ: "میں ابھی شیر خوار تھا کہ حضور پاک نے میری کفالت اپنے ذمہ لے لی اور اپنے لعاب دہن سے مجھے غذا بہم پہنچائی"۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۲۳۴ قاصعہ)

اصل بحث یا اشکال ایسے مسائل کے بارے میں کئے جاتے ہیں اور ہم بتا چکے ہیں کہ اگرچہ اصلی فضائل عطیہ خداوندی اور غیر کسبی ہیں لیکن ان سے استفادہ میں آپ مجبور نہیں بلکہ مکمل طور پر خود مختار ہیں بلکہ آپ علیہ السلام کی فضیلت اسی بات میں ہے کہ آپؑ نے ان فضائل کو صحیح

معنوں میں اور کما حقہٗ استفادہ کیا اور کسی بھی موقع پر سوئی کی نوک کے برابر بھی انہیں ضائع نہیں ہونے دیا، جس طرح آپ نے الٰہی نعمات اور فضائل و مواہب سے استفادہ کیا اس سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ایسے فضائل سے نوازا جانا آپ کی لیاقت، استعداد اور شائستگی کی وجہ سے تھا، جب آپؑ ان سے نوازے گئے تو پھر ان سے صحیح معنوں میں اختیاری طور پر استفادہ کر کے بلند و بالا درجات اور والا مقامات تک بذات خود رسائی حاصل کی۔

خداداد فضائل یا امتیازی سلوک؟

یہاں پر ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ امتیازی سلوک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ فضائل و مواہب ذاتی اور غیر کسبی امیر المومنین علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کو عطا فرمائے لیکن دوسرے لوگوں کو اس سے محروم رکھا ہے یہ امتیازی سلوک نہیں تو اور کیا ہے؟۔

تو اس کا جواب حاصل کرنے کیلئے دو الفاظ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے ایک ہے ''امتیاز'' اور دوسرا ہے ''تفریق'' تفریق ناروا کام اور منفی نقطہ نظر کا نام ہے، جبکہ ''امتیاز'' اس طرح نہیں ہے، مثال کے طور پر اگر استاد اپنی کلاس کے دو ایک جیسے شاگردوں میں سے ایک کو زیادہ نمبر دے دیتا ہے اور دوسرے کو کم، تو اسے تفریق کہا جائے گا، یا اگر باپ اپنی اولاد میں سے صرف ایک کے ساتھ بلاوجہ زیادہ محبت کرتا ہے دوسروں کے ساتھ کم، تو یہ ان کے درمیان اس کی تفریق ہوگی جو ایک غلط طریقہ کار ہے یا جو شخص بیت المال کا انچارج ہے اسے چاہیئے کہ لوگوں کو ایک نظر سے دیکھے اور ان کے حصے کا جو مال ہے وہ انہیں دے، لیکن اگر وہ اپنے رشتہ داروں، دوستوں، پارٹی یا گروپ کے لوگوں کو خصوصی طور سے نوازتا ہے تو اس کا یہ طریقہ کار غلط ناپسندیدہ اور تفریق آمیز ہے۔

تفریق ایسے مقامات پر ہوتی ہے جہاں پر سب لوگوں کیلئے یکساں اور مساوی شرائط موجود ہوتے ہیں، لیکن وہاں پر بعض لوگوں کو نوازا جائے اور بعض کو محروم کر دیا جائے یہ ظلم و جور کے مصداقوں میں سے ایک ہے، لیکن ''امتیاز'' اس کے برعکس ہے اور ہر امتیاز ظلم نہیں ہوتا، مثلاً ایک کلاس کے شاگردوں میں سے ایک طالب علم نے خوب درس پڑھا، خوب محنت کی اور امتحان میں شرکت کر کے اعلیٰ نمبر حاصل کئے، جبکہ دوسرے شاگرد نے نہ تو اچھی طرح درس پڑھا اور نہ محنت کی جب امتحان میں شریک ہوا تو، بہت کم نمبر لیئے، تو اس موقع پر دونوں کے درمیان ''امتیاز'' موجود ہے اور اس امتیاز کو تفریق سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے عالم تکوین اور اصل تخلیق میں اپنی مخلوق کے درمیان امتیاز قائم کیا ہے اور بنیادی طور پر تخلیق عالم امتیاز کے بغیر قابل تصور نہیں، آیا عالم انسانیت میں آپ کو دو شخص ایسے ملیں گے جو ہر جہات سے ایک جیسے ہوں؟ ہرگز نہیں! کیونکہ افراد بشر میں سے ہر ایک شخص کی اپنی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں۔

مرد اور عورت کے درمیان اور انسان اور دیگر حیوانات کے درمیان امتیاز کا ہونا ضروری ہے، جس سے کوئی بھی مفر نہیں، تمام حیوانات انسان کی خدمت کیلئے ہیں اور انسان ان سے مختلف صورتوں میں بہرہ دیری کرتا ہے اور یہ چیز ہرگز ''تفریق'' کے زمرے میں نہیں آتی، البتہ عالم تکوین میں یہ تمام امتیازات اور ایک کا دوسرے سے باہمی فرق کسی نہ کسی علت اور حکمت کی بنا پر ہوتا ہے، کیونکہ خداوند عالم ''حکیم'' ہے اور وہ کسی کو ''ترجیح بلا مرجح'' یعنی کسی خاص علت کے بغیر کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا، بلکہ کچھ شرائط موجود ہوتے ہیں جو انسان کی آمادگی کا موجب اور کمال تک رسائی کی استعداد کا سبب بنتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ شرائط کیونکر پیدا ہوتے ہیں؟ اور خداوند عالم نے ایسا کونسا نظام

خلق فرمایا ہے جس سے موجودات میں مختلف قسم کی لیاقتیں اور صلاحیتیں خلق ہوتی ہیں اور خاص قسم کی کمالات کی استعداد ہر ایک موجود چیز کو عطا کی ہے؟ اس میں ایک طویل اور مفصل بحث ہے جو اس مختصر سے مقالے میں پیش نہیں ہو سکتی اور ہماری موجودہ بحث سے بھی خارج ہے لیکن جو بات مسلّم ہے وہ یہ کہ تکوینیات عالم میں ''امتیاز'' موجود ہے جو تخلیق عالم کی بنیاد ہے اور اگر یہ نہ ہوتو تمام عالم ہستی کا وجود ہی ختم ہو جائے۔

اصولی طور پر اس قسم کے اعتراضات کہ موجودات عالم کے درمیان کیوں فرق روا رکھا گیا ہے خاص کر انسانوں میں؟ دراصل یہ انسانی حقوق کے ضائع کرنے کا موجب ہیں، یا یہ اعتراض کہ ایک انسان کو مرد اور دوسرے کو عورت کیوں خلق کیا گیا؟ یقیناً بے جا اور بے معنی ہے کیونکہ کوئی بھی موجود اپنے اصل وجود میں خدا پر کسی قسم کا حق نہیں رکھتا، کسی کو بھی حق حاصل نہیں کہ کہے: ''میں چاہتا تھا عورت پیدا ہوں، مجھے مرد پیدا کیا گیا'' یا کہے: ''میں چاہتی تھی مرد پیدا ہوں لیکن مجھے عورت پیدا کیا گیا'' کیونکہ انسان اپنی تخلیق سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا کہ جس کی وجہ سے وہ اپنا حق جتلا سکے، اس کا حق تو تخلیق کے بعد بنے گا، اگر کوئی ہوتو۔

ہاں البتہ! پیدا ہو جانے کے بعد دو انسان ہر جہات سے بطور مساوی نیک کام انجام دیں اور ایسی صورت حال کے پیش نظر خداوند عالم ان کے درمیان تفریق پیدا کر دے اور ایک کو جنت میں اور دوسرے کو جہنم بھیج دے، تو یہ تفریق ظلم ہوگی اور خدا ہرگز ایسا کوئی کام نہیں کرتا، ارشاد ہوتا ہے: ''اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ'' آیا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں کے جیسا قرار دیں گے؟۔ (سورہ ص/8)

بہرحال جو بات اصل تخلیق میں مسلّم ہے وہ یہ کہ کائنات کی کسی بھی چیز کا خدا پر کسی قسم کا حق نہیں ہے، خداوند عالم نے اپنے لطف و کرم کی وجہ سے اور حکمت و مصلحت کی بنیاد پر ہر موجود کو

اس کے وجود کا حصہ عطا فرمایا ہے، رہی بات عالم تکوین میں ''امتیاز'' کی بات تو یہ ظلم کی بات نہیں ہے، البتہ اگر عالم کی تخلیق میں کوئی کام حکمت اور مصلحت کے برخلاف انجام پائے تو وہاں پر سوال پیدا ہوسکتا ہے، جبکہ خداوند عالم کوئی بھی کام حکمت اور مصلحت کے بغیر انجام نہیں دیتا، بنابریں یہ جو موجودات علم کی تخلیق میں امتیازات آپ کو نظر آرہے ہیں بطور کامل مصلحت کے مطابق اور حکمت کی بنیاد پر قائم ہیں اور ان کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ ''خداوند عالم نے موجودات عالم کے درمیان ''تفریق'' روا رکھی ہے''۔

بنابریں عالم تخلیق میں موجودات عالم کا باہمی فرق ضرور ہے اور خداوند عالم نے ہر موجود کو ایک مخصوص خصوصیت عطا فرماتا ہے اور اس کے باوجود کسی دوسرے موجود کا حق ضائع نہیں ہوتا، کیونکہ موجودات میں سے کسی کا بھی تخلیق سے پہلے خدا پر کوئی حق نہیں بنتا اور عالم تکوین میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ ذات اقدس کے تقاضوں کے مطابق اور حکمت مصلحت کی بنیاد پر موجودات عالم اور اپنے بندوں کیلئے حقوق کو پیش نظر رکھتا ہے، مثلاً جیسا کہ فرماتا ہے: ''كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصرُ الْمُؤْمِنِيْن '' مومنین کی امداد کرنا ہم پر فرض ہے۔ (روم/47) یا جیسا کہ فرماتا ہے کہ: ''كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ '' اس نے اپنے اوپر رحمت کو واجب قرار دے دیا ہے (انعام 12) یا جیسا کہ اس کا یہ طریقہ کار قرار پایا ہے کہ نیک لوگوں کا حق بنتا ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ سے جزا اور ثواب حاصل کریں''۔

پس بنابریں خداوند عالم نے حضرت علی علیہ السلام کو جو امتیازات عطا فرمائے ہیں اور دوسرے بندوں کو عطا نہیں فرمائے ہیں اس کا فرق ایسا ہے جیسے ایک نابغۂ روزگار شخصیت اور ایک عام آدمی کے درمیان ہوتا ہے، ان دونوں کے فہم و استعداد کے مراتب ایک جیسے نہیں، البتہ یہ امر مصلحت کی بنیادوں پر استوار ہے، نہ تو اس میں ظلم کا پہلو پایا جاتا ہے اور نہ ہی حکمت الٰہی کے

تقاضوں کے خلاف ہے، اگر یہ فضیلت اختیاری افعال میں موثر ہوتو پھر حق کے پیدا ہونے کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے، اگر انسان اس خداداد عطیہ سے شائستہ طریقے پر استفادہ کرے تو خداوند عالم سے نیک جزا کے حصول کا حق پیدا کر لیتا ہے، ہاں البتہ اس صورت میں اگر اس کے اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کے کہ جنہوں نے خداداد عطیات سے بطور خوب و بدرجہ اتم فائدہ اٹھایا ہے کسی قسم کا فرق نظر آئے تو پھر کہا جاسکتا ہے کہ خدا نے ان کے درمیان تفریق پیدا کر دی ہے لیکن اس قسم کا کوئی موقع آپ کو نظر نہیں آئے گا۔

پس معلوم ہوا کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام اور دوسرے ائمہ اطہار علیہم السلام اور دوسرے عام انسانوں کے درمیان تکوینی طور پر امتیازات موجود ہیں، لیکن یہ امتیازات عدالت الٰہی کے خلاف نہیں ہیں، کیونکہ تکوینی نقطہ نظر سے ان بزرگ ہستیوں کیلئے ایسے مواقع میسر تھے جن سے انہوں نے اس طرح کے کمالات کی استعداد پیدا کرلی اور اللہ تعالی نے بھی اپنے عطیوں اور مواہب سے انہیں نوازا، البتہ یہ سوال اپنی جگہ پر باقی ہے کہ انہیں یہ استعداد اور مواقع کیونکر میسر آئے؟ اس کیلئے ایک مفصل اور پیچیدہ بحث ہے جو اپنے مقام پر بیان ہوگی۔

تکوینی عطیات اور بھاری ذمہ داریاں

مذکورہ بالا بحث میں اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ اگر کسی کو خدادادی عطیوں اور مواہب سے زیادہ نوازا گیا ہے، اس کی ذمہ داریاں بھی دوسروں سے زیادہ ہیں اور اس کی اور دوسرے عام لوگوں کی ذمہ داریوں اور فرائض کی ادائیگی میں بھی فرق ہے، خداوند عالم جس اندازے سے بھی کسی کو فہم و کمالات کی دولت سے زیادہ نوازتا ہے اس کے ذمہ فرائض اور ذمہ داریاں بھی بھاری اور سنگین لگا دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت رسالتمآبؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام

کی ذمہ داریوں اور فرائض میں ہمارے فرائض اور ذمہ داریوں میں فرق ہے ان مقدس ہستیوں کی ذمہ داریاں دوسرے لوگوں سے کہیں زیادہ ہیں اور بفرض محال (خدانخواستہ) نافرمانی کی صورت میں ان کی سزا بھی کئی گنا زیادہ ہے مثال کے طور پر خداوند عالم فرماتا ہے: "لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلاً اِذًا لَّاَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لاَ تَجِدُلَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا" اے پیغمبرؐ! اگر آپؐ نے ان لوگوں کی طرف تھوڑا سا جھکاو بھی پیدا کرلیا ہوتا تو ہم دنیا میں بھی آپ کو دوگنی سزا دیتے اور آخرت میں دوگنی سزا دیتے اور کوئی بھی آپ کی مدد کو نہ پہنچتا۔ (بنی اسرائیل/74,75)

چنانچہ بعض روایات میں ان آیات کا شان نزول اس طرح بیان ہوا کہ اہل طائف نے مسلمان ہونے کے بعد اس بات پر اکتفا کرلیا تھا کہ انہوں نے کلمہ پڑھ لیا ہے اور حضور پاکؐ کے پیروکار ہو چکے ہیں اور جنگوں میں آپ کے ساتھ تعاون کریں گے اور آپ کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلیں گے اس کے مقابلے میں ان لوگوں کے ایک دو تقاضے تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انہیں "نماز میں سجدہ کرنے سے معاف کردیا جائے" حضورؐ نے اس بارے میں "وحی" کا انتظار کیا، وحی ان الفاظ میں نازل ہوئی: "لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلاً......"۔ (بنی اسرائیل/74,75) اور یہ اس حالت میں ہے کہ اس طرح کی سخت تنبیہ اور شدت کا اظہار عام انسانوں کیلئے نہیں ہے، اسی طرح بعض عبادات مثلاً "نماز شب" حضور پیغمبر گرامیؐ پر واجب تھی جبکہ دوسرے لوگوں پر واجب نہیں ہے۔

پس بنابریں ان تکوینی امتیازوں کو جو اللہ نے پیغمبر خداؐ، امیر المومنینؑ اور دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کو عطا فرمائے ہیں، دو طرح کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے، پہلا یہ کہ اگر چہ یہ غیر کسبی فضائل ہیں لیکن ان پر عمل پیرا ہونا ان کے اپنے ارادہ و اختیار میں ہے اور دوسرے یہ کہ

انہیں جس قدر عظیم اور اہم فضائل عطا ہوئے ہیں اسی نسبت سے ان کی شرعی ذمہ داریاں بھی سخت ترین اور سنگین ترین تھیں۔

اس طرح کے فضائل و مواہب کے حامل ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ آپ ان پر عمل کریں ورنہ خدائی ناراضگی کے اسباب مہیا کرنے ہوتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ خداوند عالم کسی فرد یا افراد کو تکوینی طور پر امتیازات تو عطا فرمائے لیکن ان کے شرعی فرائض دوسرے لوگوں کے مساوی قرار دے، تکوینی نقطہ نظر سے اور تخلیقی لحاظ سے جو شخص جتنا بلند مرتبہ ہوگا اس کی ذمہ داری شرعی تکلیف کا درجہ بھی اتنا ہی بالاتر ہوگا، شاید یہی وجہ تھی کہ وہ عظیم ہستیاں اپنے پروردگار کے حضور اس قدر تضرع وزاری کیا کرتی تھیں: جی ہاں! مدینہ اور کوفہ کے نخلستانوں میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا خوف خدا میں اس قدر گریہ اور نالہ وشیون بغیر مقصد کے نہیں تھا اس لئے کہ آپؑ اپنی مسئولیت کے بار کی سنگینی سے اچھی طرح واقف تھے اور اسی ذمہ داری کے پیش نظر وہ ہر شب تا صبح عبادت کیا کرتے تھے اور اپنی مناجات میں بارگاہ رب العزت میں عرض کیا کرتے تھے: ”آہ! مِنْ قِلَّةِ الزَّادِ وَ طُوْلِ الطَّرِيْق “ ہائے زادراہ بہت کم اور راستہ بہت طولانی ہے۔ (نہج البلاغہ حکمت ۷۷)

حتی کہ معاشرہ میں بلند مقام اور کچھ دنیوی نعمتیں جو بعض لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں ان کی ذمہ داریوں میں سختی کا موجب بن جاتی ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں پیغمبر اسلامؐ کی بیویوں کے بارے میں ارشاد کررہا ہے: ”يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ مَن يَّاتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَ كَانَ ذَالِكَ عَلَى اللهِ يَسِيْراً وَّمَنْ يَّقْنُتْ مِنكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا “ اے نبی کی بیبیو! تم میں سے جو بھی کھلم کھلا برائی کی مرتکب ہوگی اس کیلئے دوگنا عذاب ہوگا اور یہ بات اللہ کیلئے بہت

آسان ہے اور تم میں سے جو بھی اللہ اور اس کے رسول کے سامنے عاجزی کرے گی اور نیک اعمال بجالائے گی ہم اسے دوگنا اجر عطا کریں گے اور اس کیلئے باعزت روزی تیار کر رکھی ہے۔ (احزاب/30,31)

پیغمبر اکرمؐ کی ازوج اپنے بلند معاشرتی مقام کی وجہ سے، مخصوص شرعی فریضہ کی حامل تھیں اگرچہ خود وہ ذاتی اور تکوینی لحاظ سے دوسروں سے مختلف نہیں تھیں، لیکن چونکہ حضرت رسولخداؐ کی زوجیت کا شرف حاصل تھا لہٰذا معاشرہ میں نمایاں مقام کی حامل تھیں۔ اسی اللہ تعالیٰ ان سے فرمارہا ہے: "اس معاشرتی مقام ومنزلت کا حامل ہونے کی وجہ سے تم دوسرے لوگوں جیسی نہیں ہو اگر تقویٰ اختیار کروگی تو تمہیں دوہرا اجر ملے گا اور اگر گناہ کروگی تو دوگنا عذاب کی مستحق ہوگی اس لئے کہ لوگ تمہیں اپنے لئے نمونہ عمل سمجھتے ہیں اور تمہارے اچھے برے کردار کی پیروی کرتے ہیں اسی لئے تمہارا یہ معاشرتی مقام اس بات کا موجب ہے کہ تمہاری ذمہ داریاں شدید ترین ہیں" اسی لئے کہا گیا ہے کہ: "یُغفَرُ لِلْجَاهِلِ سَبْعُوْنَ ذَنْباً قَبْلَ اَنْ یُغْفَرَ لِلْعَالِمِ ذَنْبٌ وَاحِدٌ" عالم کے ایک گناہ بخشے جانے سے پہلے جاہل کے ستر گناہ بخشے جائیں گے۔ (بحار جلد۲ باب ۹ روایت ۵)

اگر کسی ایک عالم سے نیک کام سرزد ہوجائے اس کا ثواب سب سے زیادہ ہے اور اسی طرح اگر وہ ایک گناہ کا ارتکاب کرے گا تو دوہرے گناہ کی سزا پائے گا، خداوند عالم نے جس شخص کو اپنے انعامات ومواہب سے جس قدر نوازا ہے اگر وہ اس سے صحیح معنوں میں استفادہ کرے گا تو اس کی جزا پائے گا اور اگر اس سے غلط مفاد اٹھائے گا تو اسی قدر اسے سزا ملے گی، گویا یہ دونوں قسم کے لوگ ثواب وعقاب کے لحاظ سے برابر ہوں گے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر کسی سے اختیاری طور پر کسی فعل کے سرزد ہونے سے پہلے "عدل" اور "حق" صدق پیدا کرتے ہیں، بحث یہاں پر عدل

اور ظلم کے بارے میں نہیں بلکہ حکمت خداوندی کے تقاضوں کی بات ہے جو یہاں پر جاری وساری ہے اور وہ جس قدر مصلحت سمجھتا ہے اسی قدر اپنے موجودات میں سے کسی کو عطا کرتا ہے۔

لہٰذا حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا سب سے زیادہ تکوینی مواہب وانعامات کا حامل ہونا، تفریق اور ظلم کا موجب نہیں ہے، بلکہ یہ ایک خاص امتیاز ہے جو تخلیق خداوندی کا جزو ہے، یہ خدا کا ہم لوگوں پر احسان ہے کہ اس قسم کے گوہر ہائے گرانمایہ ہم جیسی گناہگار مخلوق میں قرار دیئے ہیں جیسا کہ ہم زیارت جامعہ کبیرہ میں ان سے خطاب کرتے ہیں:

''آپ حضرات نور کی صورت میں عرش الٰہی کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے اور وہاں پر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے، خداوند عالم نے ہم پر احسان فرمایا اور تمہیں اس جہان میں ہمارے پاس بھیج دیا''۔ ''**خلقکم اللّٰہ انوارا فجعلکم فی بیوت اذن اللّٰہ ان ترفع و یذکر فیھما اسمہ** '' اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو نور سے خلق فرمایا اور تمہیں عرش معلیٰ کے گرد ٹھہرایا جہاں حلقہ بنائے ہوئے تھے پھر اسی نے ہم پر تمہارے ذریعہ احسان فرمایا اور اس دنیا میں ایسے گھروں میں بھیجا جس کے عظمت واحترام کا خدا نے ہمیں حکم دیا ہے اور ان میں اس کی یاد ہوتی رہتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کا نام قرآن میں کیوں نہیں؟

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں ایک اور سوال کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ''آپ کا نام قرآن مجید میں کیوں نہیں آیا؟ آخر کیا وجہ ہے کہ ان کے اس قدر احترام وعظمت کے باوجود ان کا نام صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں کیوں نہیں آیا؟'' یہ وہ سوال ہے جو بار بار بعض شیاطین کی طرف سے پیش ہوتا آرہا ہے اور ہمارے بزرگ علماء نے اس کا شافی اور کافی جواب

دیا ہے اور دیتے آ رہے ہیں، ان میں سے ایک حضرت امام خمینی رضوان اللہ علیہ ہیں جنہوں نے اپنی کتاب ''کشف الاسرار'' میں مرتد کسروی کی کتاب ''اسرار ہزار سالہ'' کے جواب میں اس کا جواب مختلف مقامات پر دیا ہے، اس سوال کے دو کلی جواب ہیں:

1۔ پہلا جواب اس جملہ سے متعلق ہے کہ احکام الٰہی کی شرعی حیثیت اور شریعت سے مربوط احکام و مسائل کا بیان بلکہ ان تمام کلی امور کا منظّم کرنا اس حکمت کے ہمراہ ہے کہ ان کے ذریعہ افراد کی آزمائش کی جائے اور ان کا امتحان لیا جائے اور انسان اپنے ارادہ اور اختیار کے تحت خداوند عالم کے اوامر ونواہی - جو کہ خود انسان کے ارتقا کا موجب ہوتے ہیں ان کیلئے آگے کی طرف قدم بڑھائے، مثلاً خداوند عالم اگر چاہتا تو اپنے پیغمبرؐ کو کہہ سکتا تھا کہ ابتدا ہی سے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کیا کریں لیکن خدا نے ابتدا میں بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا پھر کچھ عرصہ بعد اسے تبدیل کرنے کا حکم دیا اس کا فلسفہ خود قرآن مجید ہی نے بیان فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ '' (بقرہ/143) یعنی یہ ایک خدائی امتحان تھا کہ اس کے ذریعہ سے حقیقی، پیغمبرؐ خدا اور ذات خدا کے تابع افراد کی پہچان ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ کون لوگ خداوند عالم کے امر و نہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں؟ اور کون لوگ ہیں جو دل سے ایمان نہیں لائے صرف زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں اور ہر موقع محل پر کسی نہ کسی طرح کے بہانہ کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اس طرح کے معاملات میں دلوں میں شکوک پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدائی احکام تبدیل ہوں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہماری سابقہ نمازوں کا کیا بنے گا؟ جو ہم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھتے رہے؟ اگر وہ صحیح تھیں تو پھر جو نمازیں خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے

پڑھیں گے تو ان کا کیا بنے گا؟ اور اس طرح کی کئی دوسری باتیں!۔اسی لئے خداوند عالم فرماتا ہے: ''اس کام کا مقصد یہ تھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ کون لوگ حقیقی طور پر ایمان رکھتے ہیں؟''

اسی لئے شریعت سے متعلقہ مسائل کے بیان میں اگر تمام مسائل کھلم کھلا، شفاف اور کسی ابہام کے بغیر بیان ہوتے تو بہت سے موقعوں پر امتحان و آزمائش کی حکمت وقوع پذیر نہ ہوتی آزمائش و امتحان کا تقاضا یہی ہے کہ قدرے ابہام باقی ہو ورنہ امتحان کا کوئی مقصد ہی نہ ہوتا۔

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی خلافت اور ولایت کے بارے بھی امتحان کی یہی حکمت کارفرما تھی تا کہ یہ مسئلہ بھی صاف اور کسی قسم کے پیرائے کے بغیر نہ ہو۔ اور اگر امیر المؤمنینؑ سے متعلقہ آیات میں آنجنابؑ کا نام صریحی طور پر ذکر ہوتا تو یہ خدائی حکمت کے برعکس ہوتا۔

۲۔اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ جیسے حضرت امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے کتاب ''کشف الاسرار'' ہی میں ذکر کیا ہے کہ ''اگر امیر المؤمنینؑ کا اسم مبارک قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ مذکور ہوتا تو جن منافقین نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حکمرانی کی امیدیں اپنے دل و دماغ میں سموئی ہوئی تھیں کہ آنجنابؐ کو قتل کر کے اپنے مذموم مقاصد کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے قرآن مجید میں دست اندازی کرتے جس کا لازمی نتیجہ پیکر اسلام پر ایک کاری ضرب ہوتا، جس کی تلافی ناممکن ہوتی''۔

اس کے علاوہ ایک اور جواب بھی ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ کلی مسائل کو بیان کرتا ہے اور اس کی تفسیر و تاویل کا کام حضرت رسولخداؐ کے ذمہ لگاتا ہے۔ چنانچہ اسی بارے حضرات آئمہ اطہار علیہم السلام سے سوال کیا گیا کہ: ''قرآن پاک میں حضرت امیر المؤمنینؑ اور دیگر آئمہ اطہار علیہم السلام کا نام کیوں مذکور نہیں؟'' یا ''انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین امنوا الذین یقیمون

الصلوۃ......"

(مائدہ/۵۵)"والـذیـن امـنـوا ... "کا تعارف صراحت کے ساتھ کیوں نہیں کرایا گیا؟" یا"اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامرمنکم "(نساء/۵۹)میں"اولی الامر" کی واضح صورت میں صراحت کیوں نہ کی گئی؟ "یا"نماز کے بارے میں واجب نمازوں کی تعداداور رکعتوں کی تعداد کی وضاحت کیوں نہیں ؟"یا"زکوٰۃ کی آیات میں اس کے موارد اور مقدار کو بیان کیوں نہیں کیا گیا؟" آئمہ اطہارؑ ے جواب میں ارشادفرمایا:"احکام الٰہی کے جزئیات کی تفسیر کا کام حضرت رسولخداؐ کے ذمہ لگایا گیا ہےاورقرآن فرماتا ہے:"وانزلنا الیک الـذکـر لتبیـن للناس مانزل الیهم "ہم نے آپ کی طرف ذکر(قرآن پاک)کونازل کیا ہے تا کہ تم،لوگوں کوان کی تفصیل بیان کرو۔(نحل/۴۴)

بنابریں جس طرح خداوند عالم نے قرآن مجید میں نماز کے پڑھنے کا حکم تو دیا ہے لیکن نماز کی رکعتوں کی وضاحت نہیں کی ،اسی طرح اس نے اولی الامر کی اطاعت کا حکم تو دیا ہے لیکن ان کے اسمائے گرامی کو ذکر نہیں فرمایا تا کہ وہ لوگ آنحضرتؐ سے سوال کریں اورآپ اس مسئلہ کی مکمل طور پر وضاحت فرمائیں۔پس بطور خلاصہ اس سوال کے جواب میں کہ کیا وجہ ہے کہ قرآن نے احکام کی جزئیات کو بیان نہیں فرمایا؟اوردوسری وجہ یہ ہے تا کہ لوگ ان کی تفصیل وتشریح پیغمبر عالیقدر اور آئمہ اطہار علیہم السلام سے دریافت کریں اس طرح سے لوگوں کو بھی ان کے مقام اوران کی منزلت کا پتہ چلے۔

بطور کلی بہت سے مقامات پر اس قسم کے سوال اس لئے پیدا ہوتے ہیں تا کہ ہم یہ سمجھیں کہ خداوند عالم ایک مصلح کی مانند ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں ہر ممکن طریقے سے اس کے افراد ارتقائی مراحل طے کریں اوراس میں سکون واطمینان ہواورامن وامان کا دور

دورہ ہو۔ اور لوگ آسودہ حال ہوں۔ اس نظریئے کی بنیاد پر اگر ہم کسی موقع پر یہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو رہا تو کیا ہم نتیجہ نکالیں گے کہ۔ معاذ اللہ۔ خدائی کاموں میں کسی قسم کا اشکال پیدا ہوگیا ہے؟ حالانکہ خداوند عالم تو ایسا ہرگز نہیں چاہتا کہ لوگ زبردستی ایمان لے آئیں اور مومن کہلائیں۔ اور اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو وہ قطعاً ایسا کرسکتا تھا اور ایسے اسباب فراہم کرسکتا تھا جس سے تمام لوگ ایمان لے آتے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے: "وَلَوْشَآءَ رَبُّکَ لَآمَنَ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا" یعنی اگر تمہارا رب چاہتا تو روئے زمین پر موجود تمام لوگ ایمان لے آتے (یونس/۹۹) لیکن چونکہ ایمان ایک اختیاری معاملہ ہے اور لوگوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ ایمان کا انتخاب کریں اور اس کا پھل پائیں۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "لَوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَھَدَی النَّاسَ جَمِیْعًا" اگر خدا چاہتا تو تمام لوگوں کو (زبردستی) ہدایت کرسکتا تھا۔ (رعد/۳۱) مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی مرضی، ارادے اور اختیار سے راہ ہدایت کو طے کرے اور کمال کے مرحلے تک جا پہنچے، اسے چاہئے کہ اپنی مرضی کے مطابق راہ کمال کو منتخب کرے اور اس پر گامزن ہو، اور منزل مقصود تک جا پہنچے اور اسی میں اس کا کمال ہے۔

۴

حضرت علی کی حکومت

انتخابی یا انتصابی (Elected or Selected)

تکوینی اور تشریعی امتیازات کا حصول

قبل ازیں حضرت امیر علیہ السلام کے ان چند فضائل اور مناقب کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے، جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائے ہیں۔ان میں سے کچھ فضائل تو ایسے بھی ہیں جن پر دوس ودشمن اور مومن وکافر کا اتفاق ہے۔اور اس بارے میں بہت سی کتابیں بھی رشتہ تحریر میں لائی جاچکی ہیں، مثلاً آپؑ کی شجاعت اور عدالت ہی کو لے لیجئے جو زبان زدعام وخاص ہیں۔اور تاریخی طور پر ان لوگوں نے بھی آپ کی ان صفات عالیہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے جو مسلمان بھی نہیں تھے۔بلکہ کسی بھی دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا ان لوگوں نے بھی آپ کی بے مثال شجاعت کو سراہا ہے۔اسی طرح وہ تمام لوگ جو آپ کی سیرت طیبہ سے باخبر ہیں ''عدالت'' کی صفت کو آپ کے بزرگ ترین فضائل میں شمار کرتے ہیں نمونے کے طور پر عیسائی صاحب قلم جارج جرداق نے اپنی کتاب ''صوت العدالۃ الانسانیہ'' میں آپ کا ''مظہر عدالت'' کے عنوان سے تعارف کرایا ہے۔ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ہمارے لئے ایسے فضائل سے باخبر رہنا اور ان کے متعلق گفتگو کرنا نہایت ہی مفید اور اہم ہے اور جہاں بھی حضرت امیرؑ اور اہلبیت اطہار علیہم السلام کے فضائل ومناقب بیان ہوتے ہیں وہیں پر انوار الٰہی اور برکات خداوندی کا نزول ہوتا ہے۔ لیکن اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں شیعی عقائد کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیئے جارہے ہیں، لہذا اس دور میں ایسے فضائل پیش کیئے

جائیں جو اعتقادی مسائل کے ساتھ مربوط ہوں۔ جن سے امیر المومنینؑ کی امامت اور ان کے تشریعی مقامات کے بارے میں ہمارے عقائد محکم سے محکم تر ہوں۔

جو انعامات خالق کائنات نے آپ کو عطا فرمائے ہیں ان میں سے کچھ کا تعلق تکوینی انعامات و مواہب سے بھی ہے۔ آنجنابؑ کی تخلیق پیغمبرؐ کے نور سے ہوئی جس کی وجہ سے آپؑ آغاز طفولیت ہی سے ایسے حقائق کا ادراک کر لیا کرتے تھے جن کے ادراک سے دوسرے لوگ عاجز ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ سرکار رسالتؐ کی ایک حدیث میں ہے کہ: ''جب خداوند عالم نے مجھے معراج کی سیر کرائی اور عالم بالا کے حقائق دکھلائے تو علی ابن ابی طالبؑ کے لئے بھی آسمانوں کے دروازے کھول دیئے گئے اور انہوں نے بھی ان حقائق کو ملاحظہ فرمایا'' (بحار الانوار جلد ۱۶ روایت ۷) تو یہ تکوینی انعامات ہیں جو اللہ نے علیؑ کی ذات کو عطا فرمائے تھے۔

ان فضائل کے ساتھ ساتھ بہت سے تشریعی امتیازات بھی ہیں جو آپ کو عطا ہوئے ہیں ایسے امتیازات کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم وہ امتیازات ہیں جن کا شرعی احکامات سے تعلق ہے اور ان کی بنیاد پر شریعت میں حضرت علیؑ کے لئے خاص احکام مقرر کئے گئے ہیں۔ وہ یہ کہ اسلامی شریعت میں کچھ واجبات ہیں اور کچھ محرمات ہیں اسی طرح بعض امور حلال ہیں اور بعض حرام ہیں اور بعض ایسے حلال امور بھی ہیں جن کا خصوصی تعلق صرف اور صرف حضرت رسولخداؐ حضرت امیر المومنینؑ اور آئمہ علیہم السلام کے ساتھ ہے۔ بطور مثال جس مرد یا عورت پر غسل واجب ہو چکا ہو وہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا لیکن حضرت رسولخداؐ اور امیر المومنینؑ کو اجازت تھی کہ وہ ایسی حالت میں مسجد میں آ جا سکتے تھے اور یہ ان خصوصی امتیازات میں سے ایک تھا جو ان بزرگوار ہستیوں کو حاصل تھے اس حکم کے بارے میں ایک مشہور واقعہ ہے آپ بھی سن لیجئے!

جب آنحضرتؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے تو چند دن تک مدینہ کے نزدیک

ایک جگہ پر قیام فرمایا۔اور وہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی جس کا نام ''مسجد قبا'' ہے اور چند دن کے بعد مدینہ تشریف لے آئے اور جس جگہ پر آج مسجد نبوی اور حرم شریف ہے وہاں پر آپؐ نے ایک زمین کو منتخب کیا تھا کہ وہاں پر مسجد کی بنیاد رکھی جائے۔اور مسجد کے کنارے پر آپؐ کا گھر بھی بنایا گیا جس کا دروازہ مسجد کے صحن میں کھلتا تھا۔حضرت امیر المومنین کی جناب سیدہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ کے ساتھ شادی کے بعد ایک گھر بھی ان کے لئے اسی گھر کے ساتھ تعمیر کیا گیا اور اس کا دروازہ بھی مسجد کی طرف کھلتا تھا۔اسی طرح آہستہ آہستہ دوسرے صحابہ کرامؓ،پیغمبر گرامی کے کچھ چچاؤں ،آپؐ کی ازواج مخدرات کے والدین اور جو لوگ آنحضرتؐ سے زیادہ عقیدت رکھتے تھے، نے بھی اسی طرح مسجد کے اطراف میں اپنے گھر بنانا شروع کر دیئے کہ جن کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے۔کچھ عرصہ کے بعد حداوند عالم کی طرف سے حکم صادر ہوا کہ مسجد کی حرمت کے پیش نظر حضرت رسولخداؐ اور امیر المؤمنینؑ کے دروازوں کے علاوہ دوسرے تمام لوگوں کے دروازے بند کر دیئے جائیں تا کہ کوئی مرد یا عورت جنابت کی اور حیض کی حالت مسجد میں داخل نہ ہونے پائے۔سوائے پیغمبرؐ کی ذات اور علیؑ وفاطمہؑ کے کوئی بھی شخص وہاں سے نہیں آ جا سکتا تھا۔اور ان بزرگوار ہستیوں کے دروازے مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ سے نہیں کھلتے تھے۔

روایات میں منقول ہے کہ حضور پاکؐ کے ایک چچا نے اس امر پر احتجاج کرتے ہوئے کہا:''آپ نے ہم بوڑھے آدمیوں، محترم لوگوں اور اشراف قوم کو کیوں اجازت نہیں دی کہ ہمارے دروازے بھی مسجد سے کھلے رہتے؟'' حالانکہ اس جوان (علیؑ) کو تو آپ نے اجازت دے دی ہے۔یہ کیسی تفریق ہے؟ آپؐ نے مسلمانوں کے درمیان کیوں تفریق پیدا کی ہے؟ چونکہ ہم بوڑھے اور صاحب احترام لوگ تھے آپ ہمیں اس کی اجازت دیتے اسے جو کہ ابھی جوان ہے اجازت نہ دیتے!اور یہ امتیاز ہمیں عطا ہوتا!'' حضور پاک نے یہ سن کر فرمایا:''میں نے

کوئی بھی کام خدا کے اذن وامر کے بغیر انجام نہیں دیا اور میں ہر کام وحی کے حکم کے مطابق کرتا ہوں۔''ان ھو الا وحی یوحی'' (نجم/۴) چونکہ یہ بھی وحی کا حکم تھا جو خدا نے مجھے دیا ہے خدا نے حکم دیا ہے ہے کہ علیؑ کے دروازے کے علاوہ دوسرے تمام دروازوں کو بند کردوں'' چنانچہ ہم دعائے ندبہ میں پڑھتے ہیں ''وَسَدَّ الْاَبْوَابَ اِلَّا بَابُہ'' پیغمبر خداؐ نے (حکم خدا کے مطابق) تمام دروازے بند کردیئے سوائے علی کے دروازے کے۔اور یہ امیر المومنینؑ کا خصوصی امتیاز ہے

تشریعی امتیازات کی دوسری قسم وہ ہے جن کا تعلق مسئلہ امامت، خلافت اور پیغمبرؐ کی جانشینی سے ہے۔ چنانچہ اس بارے میں پیغمبر اکرمؐ نے خداوند عالم کی جانب سے کئی مقامات پر حضرت کی جانشینی کا تعارف کرایا ہے۔ اسی گفتگو کے ضمن میں ہم اس مسئلے پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

حدیث ''منزلت'' سے خلافت کا ثبوت

مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد پیغمبر اکرمؐ خداوند عالم کی طرف سے مامور ہوئے کہ مہاجرین وانصار کے درمیان ''عقد اخوت'' قائم کریں۔ وہ یوں کہ ایک مہاجر اور ایک انصاری بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کی شادی غمی میں شریک ہوں تا کہ اس طرح سے مہاجرین جب کی مشکلات حل ہوں اور انصاری اپنے گھروں میں انہیں ٹھہرا کر ان کی مشکلات کا ازالہ کریں۔ جب تمام مہاجرین وانصار اور دیگر مومنین کے درمیان رشتہ اخوات قائم ہو گیا تو صرف امیر المومنینؑ ہی باقی رہ گئے جن کا کسی سے رشتہ اخوت قائم نہیں ہوا اس طرح سے انہوں نے احساس محرومی کرتے ہوئے غم کا اظہار کیا اور حضور اکرم سے اس بات کی شکایت کی۔ حضورؐ نے اپنا بھائی قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی '' آیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ آپ کو تو وہ مقام ومنزلت حاصل ہے جو ہارون کو

موسیٰ سے تھی۔ (بحارالانوار جلد ۳۵ باب ۲ روایت ۱۲)

یہ ایک ایسا موقع تھا جہاں پر رسول پاکؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا بھائی قرار دیا اور ہارونؑ کے ساتھ تشبیہ دے کر موسیٰؑ سے ان کے مقام و منزلت کا تعارف کرایا۔

مکتب خلفاء و اہلبیتؑ سے تعلق رکھنے والے علماء و محدثین نے نقل کیا ہے کہ رسولخداؐ نے مختلف اور متعدد مقامات پر امیر المومنینؑ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''تمہیں مجھ سے وہی نسبت حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا'' یعنی وہ تمام مقام و منزلت جو ہارونؑ کو موسیٰ علیہ السلام سے حاصل تھی وہی آپؑ کو پیغمبر اسلام سے حاصل ہے فرق صرف یہ ہے کہ ہارون نبی تھی اور میں چونکہ خاتم الانبیاء ہوں لہٰذا میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور ہارون کو حضرت موسیٰؑ سے وہ مقام و منزلت حاصل تھی قرآن نے اسے حضرت موسیٰ کی زبانی یوں بیان کیا ہے: ''رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ هٰرُوْنَ اَخِیْ اشْدُدْ بِهٖ اَزْرِیْ وَاَشْرِكْهُ فِیْ اَمْرِیْ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا'' خلاصہ ترجمہ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خداوند عالم کی طرف سے فرعون کو دعوت دینے کا حکم ملا تو انہوں نے بارگاہ خداوندی میں درخواست کی کہ میرے بھائی جناب ہارون کو میرا وزیر اور شریک کار قرار دے تا کہ وہ اس کار خیر میں میرا پشت پناہ بنے۔ (طٰہٰ/ ۲۵ تا ۳۴)

اگر ان آیات کو اور حدیث منزلت کو ملا کر دیکھیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارونؑ کے لئے جس بات کی درخواست کی اور ان کی یہ درخواست منظور ہوئی۔ بعینہ یہی چیز حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بھی وقوع پذیر ہونی چاہئے یعنی حضرت علیؑ بھی رسول گرامیؐ کے وزیر اور شریک کار قرار پائیں اور ہارونؑ کی مانند تبلیغ رسالت میں

جناب رسالتمآب کا ہاتھ بٹائیں اور شرکت فرمائیں۔لیکن حضور پاکؐ نے سوائے نبوت کے ہارون کی دیگر تمام خصوصیات کو علیؑ کے لئے برقرار رکھا۔پس علیؑ، پیغمبر خداؐ کے وزیر،ان کے پشت پناہ اور ان کی دل گرمی کے موجب تھے۔کچھ ایسی مشکلات بھی پیغمبرؐ کو پیش آجاتی تھیں جنہیں علی علیہ السلام حل کیا کرتے تھے۔بوقت ضرورت علیؑ آپؐ کی نصرت ویاوری فرمایا کرتے تھے۔بہر حال ان کو پیغمبرؐ کی وزارت کا شرف حاصل تھا۔جبکہ اس کے ساتھ وہ آپؐ کے بھائی بھی تھے۔مذکورہ بالا روایت کے علاوہ بیسیوں شیعہ سنی روایات ایسی بھی ہیں جن میں حضرت علیؑ کا پیغمبر خداؐ کے بھائی اور منزلت ہارون کے عنوانات سے تعارف کرایا ہے۔

حضرت رسولخداؐ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ''علیؑ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی تو اس سے مولا علیؑ کی خلافت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ہارونؑ کو جو حضرت موسیٰ سے منصب ومقامات حاصل تھے ان میں سے ایک خلافت ہے۔جب حضرت موسیٰؑ چالیس راتوں کے لئے میقات پرودگار کی طرف تشریف لے جانے لگے تو ہارونؑ سے فرمایا: ''اُخْـلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِی'' تم میری قوم میں میرے جانشین بن کر رہو۔(اعراف/142)اسی لئے حدیث ''منزلت'' کی رو سے حضرت علیؑ کے لئے خلیفہ رسولؐ کی منزلت بھی ثابت ہوتی ہے اگر چہ پیغمبر اکرمؐ نے ایک نہیں متعدد بار اس بات کو پوری صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

ان مطالب کا تذکرہ اس لئے ہے تاکہ ہم اس بات کی طرف متوجہ رہیں کہ حضرت علیؑ کو امام ہونے کی حیثیت سے مکمل بصیرت کے ساتھ منصوب کیا گیا۔مبادا ہم تصور کریں کہ حضرت علیؑ چونکہ پیغمبر کے چچازاد بھائی اور داماد تھے اس لئے آپ کو خلیفۃ الرسول ہونے کا شرف حاصل ہے،نہیں بلکہ بات اس سے کہیں آگے تک پہنچی ہوئی ہے۔یہاں پر ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ حضرت علیؑ کا رسولخداؐ کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تعارف بحیثیت ایک

''امیدوارخلافت'' کے نہیں تھا جس کی وجہ سے یہ کہا جائے کہ دوسرے افراد بھی اپنے امیدواروں کا خلیفۃ الرسول ہونے کی حیثیت سے تعارف کرانے کا حق رکھتے تھے۔ کیونکہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت ہیں کچھ لوگ ایسے جو اپنا تعارف ''اسلام شناس'' کی حیثیت سے کراتے ہیں لیکن اندر سے کچھ اور ہیں وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے جو کچھ علیؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے صرف امیدوار کی حیثیت سے ان کا تعارف تھا لیکن جب دوسروں نے اپنے امیدواروں کا تعارف کرادیا تو اب لوگوں کو اختیار حاصل ہے کہ اپنی رائے (ووٹوں) سے پیغمبرؐ کے جانشین کا انتخاب کریں۔

اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ اپنا ووٹ پیغمبرؐ کے متعارف شدہ امیدوار کو دیں یا کسی دوسرے کے نامزد امیدوار کو کہ جس کو ''خلیفۃ الرسول'' کی حیثیت سے منتخب کیا جائے۔

نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ آج کل ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ یہ کہ اس قسم کے پست، بیہودہ اور بے بنیاد خاص کر نوجوان نسل میں بڑی تیزی کے ساتھ پھیلائے جارہے ہیں لہذا ہمارے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ نہایت ہی عمیق صورت اور دقت نظر سے اس کی تحقیق کریں اور دیکھیں کہ آیا بات وہی ہے جو یہ لوگ کہتے ہیں یا معاملہ اس سے ہٹ کر ہے؟

خلافت علیؑ کی ایک اور دلیل

دعوت ذوالعشیر ہ

شیعہ اور سنی مکتب فکر کے بزرگ علماء، مفسرین، دانشوروں اور محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بعثت نبوی سے کم از کم تین سال کے عرصے میں حضرت علیؑ کا جانشین رسول کے عنوان سے دعوت ذوالعشیر ہ کے موقع پر تعارف کرایا گیا۔ دعوت ذوالعشیر ہ یا حدیث ''یوم

الدار" کا ماجرا کچھ اس طرح ہے۔

حضرت رسولخداؐ نے مبعوث برسالت ہونے کے بعد اپنی نبوت کی دعوت کو چھپائے رکھا اور صرف مسجد الحرام میں نماز پڑھا کرتے تھے اور خدا کی عبادت کیا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہ الکبریٰؑ اور حضرت علیؑ بھی آپ کی اقتداء کیا کرتے تھے۔ اسی طرح آنحضرتؐ اپنے پاس بیٹھنے والوں کے ساتھ اس انداز میں گفتگو فرمایا کرتے تھے جس سے لوگوں کو بتایا کرتے تھے کہ "میں خداوند وحدہ لاشریک کی عبادت کرتا ہوں، مجھے رسالت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے۔" وغیرہ اور اس عرصہ میں بت پرستی کے خلاف جہاد یا بتوں کی نکوہش کی بات نہیں ہوتی تھی۔

آنحضرتؐ نے اپنی نبوت کے پہلے تین سال تو آرام وسکون، نرمی، آہستہ آہستہ اور کسی قسم کی سختی کا اظہار کئے بغیر اپنے تبلیغی کا کو جاری رکھا۔ اور لوگوں کی مختصر تعداد بھی ایمان لاتی رہی، لیکن بعثت کے تیسرے سال حکم ملا کہ: "فَاصْدَعْ بِمَاتُؤْمَر" (سورہ حجر/94) یعنی خداوند متعال کی طرف سے آپ کو حکم ملا کہ آپ اپنی دعوت کو اعلانیہ پیش کریں اور باقاعدہ طور پر لوگوں کے درمیان رہ کر انہیں توحید کی دعوت دیں۔ بتوں کے خلاف علم جہاد بلند کریں، اور اس کام کا آغاز اپنے ہی خاندان اور عزیزوں رشتہ داروں سے کریں۔ ساتھ ہی یہ حکم ملا کہ: "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْن" اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا سے ڈراؤ۔ (شعراء/214)

متعدد سنی شیعہ روایات اس بابت نقل ہوئی ہیں کہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد حضرت رسولخداؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ: کھانا تیار کرو اور نزدیک کے رشتہ داروں کو کھانے کی دعوت دو" چنانچہ آنحضرتؐ کے چار چچاؤں اور ان کے صاحبزادوں اور قوم کے دوسری قریبی رشتہ داروں نے دعوت میں شرکت کی۔ حضورؐ نے حضرت علیؑ نے فرمایا: "گوسفند کی ایک ران کا گوشت اور شربت کا ایک پیالہ فراہم کرو اور ان لوگوں کی اس سے تواضع کرو۔"

بہرحال امیرالمؤمنین علیہ السلام نے یہ غذا تیار کی اور چچاؤں، چچازاد بھائیوں اور قریب کے رشتہ داروں کو رسول پاکؐ کے گھر میں بلایا گیا اور وہ سب لوگ آ گئے۔ جب کھانے کا موقع آیا تو انہوں نے دیکھا کہ دسترخوان پر غذا کا صرف ایک برتن ہے اور شربت کا صرف ایک جام ہے، یہ صورت حال مشاہدہ کرتے ہی انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا، مگر جب کھانا شروع کیا تو وہ جس قدر بھی غذا کھاتے گئے، اس سے کچھ بھی کم ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے بھی کھاتے وقت تہیہ کر لیا تھا خوب جی بھر کر کھالیں خوب خوب سیر ہو کر کھانا کھایا پھر بھی سب کچھ بچ رہا، خوب جی بھر کر پیا مگر کچھ بھی کم نہ ہوا۔ ابولہب نے یہ صورت حال دیکھی تو اس نے کہا: ''میرے بھتیجے نے عجیب جادو کیا ہے۔'' ان باتوں سے پیغمبر خدا کو ذہنی کوفت تو ہوئی مگر منہ پر کوئی بات نہ لائے اور مہمان بھی چلے گئے۔

رسولخداؐ نے دوبارہ حضرت علیؑ کو مامور کیا کہ اسی غذا کو تیار کرو اور انہی لوگوں کی دوبارہ دعوت کرو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور کھانا بچ رہا۔ اس بار کھانا کھانے کے بعد آنحضرتؐ نے ان لوگوں کے سامنے اپنا مقصد اور مدعا پیش کیا، روایات کے مطابق حضورؐ نے ان سے فرمایا: ''آیا آپ لوگوں نے اب تک مجھ سے کوئی جھوٹی بات سنی ہے؟ یا کسی قسم کی خیانت دیکھی ہے؟'' اس کے بعد کچھ اور باتیں کیں اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے تا کہ میں تمہیں خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلاؤں، جو شخص سب سے پہلے میری دعوت پر لبیک کہے گا وہ میرا وزیر، میرا بھائی میرا وصی اور میرا خلیفہ ہوگا۔'' ارباب بزم یہ سن کر تعجب کی نگاہوں کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ مگر کوئی بھی شخص اس وقت آپ پر ایمان نہ لے آیا، لیکن امیرالمؤمنین علی ابن ابیطالبؑ جو اس وقت تیرہ سال کے تھے اٹھ کر عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے برحق رسول ہیں اور جو کچھ آپ نے فرمایا ہے بالکل سچ ہے۔'' بعض روایات کی

رو سے حضور گرامی رسالتمآبؐ نے اپنے الفاظ کو تین بار دہرایا اور ہر بار صرف اور صرف علی ابن ابیطالبؑ ہی کھڑے ہو کر یہی الفاظ دہراتے رہے۔ آخر میں حضور پاکؐ نے حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر بولے: "اِنَّ هٰذَا اَخِی وَوَصِیِّی وَوَزِیْرِیْ وَخَلِیْفَتِیْ مِنْکُمْ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْهُ" "یہ میرا بھائی، میرا وصی، میرا وزیر اور میرا خلیفہ ہے تم اس کی بات کو بھی سنو اور اس کی اطاعت بھی کرو۔" "فَقَامَ الْقَوْمَ یَضْحَکُوْنَ" "یہ سن کر وہ لوگ ہنستے اور مذاق کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ (بحار الانوار جلد ۱۸ باب اول روایت ۲۷)

حضرت ابوطالب سے کہنے لگے: "نوبت اب یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ تم اپنے تیرہ سالہ بیٹے کی اطاعت کرو اور وہ تمہارے اوپر حکم چلائے! وہ امیر اور تم فرمانبردار اور تابع فرمان!!" یہ کہا اور مذاق اڑاتے مسخرہ بازی کرتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

اس روایت کو مکتب خلفاء کے محدثین نے متواتر سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جبکہ ایک اور روایت کے مطابق جو اسی مضمون ہی کی ہے آنحضرتؐ نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے علیؑ کے متعلق فرمایا: "یکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ" (بحار الانوار جلد ۱۸ باب ا روایت ۴۱)

اہلسنت کے ایک جید عالم دین (عبداللہ بن احمد المعروف حاکم حسکانی) اپنی کتاب "شواہد التنزیل" میں فرماتے ہیں کہ میں نے "حدیث منزلت" کو پانچ ہزار اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے، اسی طرح سے دوسرے بہت علماء تسنن نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ یہ حدیث ان احادیث میں جو "اخبار متواترہ" کہلاتی ہیں جبکہ علماء تسنن میں سے ایک اور عالم نے متواتر روایات کے بارے میں ایک کتاب تحریر کی ہے جس کا نام ہے "الدرر المتنافرہ فی الاخبار المتواترہ" اور اس میں ان روایات کو نقل کیا ہے جو تواتر کے ساتھ حضرت رسالتمآبؐ سے نقل ہوئی ہیں ان احادیث متواترہ میں سے ایک یہی (حدیث منزلت) بھی ہے۔ صورت حال خوا

کچھ بھی ہو منقولات تشیع و تسنن کے پیش نظر اس میں شک نہیں ہے کہ سرکار ختمی مرتبتؐ نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی "تمہیں مجھ سے وہی منزلت حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی، فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ (بحار الانوار جلد ۲۱ باب ۲۷ روایت ۵)

پس بنا بریں پیغمبر اسلامؐ کی اعلانیہ دعوت کے آغاز ہی میں اعلان رسالت کے ساتھ ولایت و خلافت و امامت علیؑ کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ اور ایسا نہیں تھا کہ یہ امر (خلافت) حضور گرامی کی آخری زندگی میں اور بروز غدیر خم، علی علیہ السلام کو منصوب کر دیا گیا ہو بلکہ، جس دن رسول پاکؐ کی اعلانیہ دعوت کا آغاز ہوا اسی دن سے ہی علیؑ کی خلافت کا اعلان بھی ہو گیا تھا۔

اس کے علاوہ حضرت امیرؑ کی خلافت متواتر و متعدد روایات میں بیان ہوئی ہے، کہ جن میں فقط ایک "حدیث منزلت" ہے جو صاحب شواہد التنزیل کے مطابق پانچ ہزار اسناد کے ساتھ منقول ہے اس لئے ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس حدیث سے سادگی کے ساتھ انکار نہیں کیا جا سکتا۔

خلافت علیؑ کے تعین میں جمہوری طریقہ کار

یہ بات بڑے افسوس سے کہنا پڑتی ہے کہ آجکل کچھ لوگ جو تحقیق اور تجدد کے لباس میں روشن خیال اور روشن فکر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ مختلف مسائل میں مناسب طریقہ کار کا انتخاب نہیں کرتے ان مسائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب ایسے لوگ اس بات کا سامنا کرتے ہیں کہ "آیا رسول گرامیؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا یا نہ؟" تو وہ کہتے ہیں کہ "اسلام جمہوریت کے خلاف نہیں اور نہ ہے، کیونکہ جمہوریت ہی تمام مسائل پر حاکم اور ان کا

حل پیش کرتی ہے۔ لہذا آنحضرتؐ نے بھی جمعیت کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ اسی بنا پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ رسولخداؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے۔ کیونکہ یہ ایسا کرنا جمہوریت کے خلاف تھا اور اگر اس بارے میں کچھ روایات ذکر ہوئی بھی ہیں تو وہ اس عنوان سے ہیں کہ حضور پاکؐ نے حضرت علی کو خلافت کے لئے اپنا ایک امیدوار نامزد فرمایا ہے، ورنہ حضورؐ کا عمل ''آمرانہ'' قرار پائے گا۔''

یہ لوگ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ''حکومت کے بارے میں یا تو واضح اور مکمل طور پر ڈکٹیٹر شپ کو اختیار کیا جائے اور ایک شخص کے ارادے اور منشاء کو معیار قرار دیا جائے یا پھر عوام الناس کی طرف رجوع کر کے ان کی رائے معلوم کی جائے اور اسے معیار قرار دے کر خلیفہ کا انتخاب کیا جائے۔''

ایسے لوگوں کے نزدیک کوئی تیسرا راستہ قابل تصور نہیں ہے، لہذا وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''رسولخداؐ کو کسی بھی صورت میں ڈکٹیٹر تسلیم نہیں کیا جا سکتا، لہذا قبول کرنا پڑے گا کہ حضور پاکؐ نے جمہوری تقاضوں پر عمل کیا۔''

باالفاظ دیگر وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ''اسلامی حکومت اگر آمرانہ طرز حکومت نہیں تو لازماً ماننا پڑے گا کہ جمہوری تھی کیونکہ کوئی تیسرا راستہ نہیں اسی وجہ سے لازم ہے کہ لوگ خود ہی رسول پاک کا جانشین منتخب کریں حتیٰ کہ خود رسول اللہ کی ''حکومت'' کو منتخب کرنا بھی لوگوں کا کام ہے لیکن چونکہ رسالت ایک دینی منصب ہے جو لوگوں کے عبادی امور اور افراد کے شخصی مسائل سے متعلق ہے، اور یہ بات بھی چنداں مشکل نہیں کہ ہم اس بات کو قبول کر لیں کہ رسالت کے بارے میں لوگوں کی رائے کو دخل کا کوئی حق نہیں ہے۔'' لیکن چونکہ حکومت کا مسئلہ بہت اہم ہے لہذا اس بات کو قبول نہیں کر سکتے کہ خداوند عالم کسی کو لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے خود

مقرر کرے۔ حاکم کا تعین عوام الناس کا حق ہے جب تک لوگ اپنی رائے (ووٹ) نہ دیں کسی کو حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ بعض اوقات وہ لوگ بھی جو علماء کے شریفانہ لباس میں ہیں اس قسم کے پست نظریئے کا اظہار کرتے ہیں اور اس کے لئے دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ''چونکہ خداوند عالم نے انسان کو آزاد خلق فرمایا ہے لہذا اسے لوگوں پر حکمرانی کرنے کے لئے کسی خاص شخص کو متعین نہیں کرنا چاہئے، اور لوگ خود ہی اس بارے میں کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔''

جواباً عرض ہے کہ اس قسم کی گفتگو ''مغالطہ'' سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور جو نکتہ اس مقام پر قابل غور ہے وہ یہ کہ ''تکوینی آزادی'' اور ''تشریعی اور حقوقی آزادی'' کو باہم مخلوط کر کے پیش کیا جاتا رہا ہے، ان حضرات کا یہ قول کہ ''خدا نے انسان کو آزاد خلق فرمایا ہے'' کا معنیٰ یہ ہے کہ انسان تکوینی لحاظ سے مجبور نہیں ہے وہ چاہے تو کسی چیز کو قبول کرے چاہے تو اسے مسترد کر دے۔ بلکہ بنیادی طور پر انسان کی انسانیت اس کے مختار ہونے ہی میں مضمر ہے۔ لیکن جو چیز انسان کو ملائکہ پر فضیلت کا سبب بنتی ہے وہ یہ کہ انسان اپنی خود اختیاری رفتار عمل سے ایسے مقام تک پہنچ سکتا ہے جہاں پر ملائکہ نہیں پہنچ سکتے۔ اور بات بالکل صحیح ہے اور ہم بھی قبول کرتے ہیں کہ خدا نے انسان کو آزاد خلق فرمایا ہے۔ اور انسان کا آزاد ہونا اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ تمام امور میں صاحب اختیار ہے خواہ وہ قانون کا وضع کرنا ہو حاکم کا متعین کرنا ہو یا اس قبیل کے دوسرے امور ہوں۔ اور اگر ایسا ہو جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو پھر خلق کرنے کے بعد خدا کا کیا مقام ہوگا جس نے انہی انسانوں کو خلق فرمایا ہے؟ آیا خدا نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد یوں ہی چھوڑ دیا ہے اور اسے اپنے دائرہ قدرت سے باہر نکال دیا ہے؟ یاد رکھئے یہ بات، خداوند عالم کی

خدائی سے تضاد کی حامل ہے۔ کیونکہ جو بھی موجود، خدا کی مخلوق موجود ہے جب تک وہ موجود ہے خدا ہی کی مخلوق رہے گی اور اسکی قدرت واختیار کے دائرے میں ہی ہوگی اور خداوند متعال کسی بندے کو ''بندگی'' سے خارج نہیں کرتا۔ اور یہ محال امر ہے اور خدا کی قدرت کا محال سے تعلق نہیں ہوتا۔ البتہ اس مسئلے کی مفصل بحث کا تعلق علم کلام سے ہے اور اس قسم کے مطالب وہیں پر ثابت کیئے جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کو آزاد خلق فرمایا ہے، اسے اچھے اور برے راستوں کی نشاندہی کر دینے کے بعد اختیار دیا گیا ہے کہ جسے چاہے اختیار کرے۔ اگر اس نے اچھی راہ کا انتخاب کیا تو اس حسن انتخاب کے بدلے میں اسے ثواب ملے گا اس کا اجر حاصل کر کے سعادت مندی کا تمغہ سجا کر بہشت جا پہنچے گا۔

اگر برے راستے کا انتخاب کیا تو اس کی سزا جہنم ہوگی، بلکہ بعض صورتوں میں اسے اسی دنیا ہی میں سزا مل جائے گا، لہٰذا خدا نے اگر انسان کو آزاد پیدا کیا ہے تو اس کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ اس کیلئے کوئی قانون وضع نہیں فرمایا یا اس پر کسی کو حاکم مقرر نہیں فرمایا، بلکہ اس معنی کے لحاظ سے آزاد ہے کہ جو قانون خدا کی طرف سے اس کے لئے وضع کیئے گئے ہیں انہیں قبول کر کے ان پر عمل کرے یا انہیں مسترد کر کے عمل نہ کرے۔ باالفاظ دیگر خدا کی اطاعت کرنے یا اس کی نافرمانی کرنے میں آزاد ہے۔ انسان کی آزادی کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس کی چاہے اطاعت کرنے میں لگ جائے یا جس کی چاہے نافرمانی کرنے لگے۔ حلال وحرام تو خدا ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے ''وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَهٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ''، تمہیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کہتے پھرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ یہ خدا پر جھوٹ باندھنا ہوتا ہے۔

(نحل/١١٦) حلال وحرام کا متعین کرنا خدا کا کام ہوتا ہے اور قانون کا وضع کرنا بھی اسی کا کام ہوتا ہے یا پھر جو اس کی طرف مجاز وماذون ہوتا ہے جیسے رسولِ خداؐ یا آئمہ اطہارؑ یا زمانہ غیبت میں ان کے نائب (ولی فقیہ)۔

پس معلوم ہوا کہ انسان کی ''تکوینی آزادی'' اس معنی کے لحاظ سے نہیں کہ اسے قانون وضع کرنے یا امام کے متعین کرنے کا حق حاصل ہے۔ امامت وخلافت کا مقام، روزِ اول ہی سے حضرت علی علیہ السلام کے لئے ثابت ہے۔ اس کی پہلی اثباتی دلیل وہی ''یوم الدار'' کا ماجرا ہے جہاں حضور اکرمؐ نے حضرتؑ کا اپنے جانشین کی حیثیت سے تعارف کرایا۔ اور اسے بارہا اور مختلف مناسبتوں سے دہراتے رہے مختلف قرائن اور مختلف بیانات سے وضاحت کرتے رہے آخر کار غدیر کے دن حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے وصال سے ستر دن قبل اس مسئلہ کو کھول کر بیان فرما دیا۔

بنابریں امیر المومنینؑ کی خلافت کا مسئلہ عامۃ الناس کی رائے کا محتاج نہیں۔ بلکہ یہ ایک ایسا منصب ہے جو خداوند عالم نے انہیں عطا فرمایا ہے اور حضرت علی علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا شخص اس منصب کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہی علی علیہ السلام جو اپنی ولادت کے روز اول ہی سے دامان رسالت میں پرورش پانے لگا، جس کو خوراک لعاب رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے ملتی رہی۔ حضور پاکؐ اپنے دہان مبارک میں غذا کو چبا چبا کر علی علیہ السلام کے منہ میں ڈالا کرتے تھے۔ جیسے پیغمبر فرمایا کرتے تھے جو میں دیکھتا ہوں وہی تم دیکھتے ہو جو میں سنتا ہوں وہی تم سنتے ہو جس نے اسی طرح پیغمبرؐ سے تربیت حاصل کی تھی جس طرح پیغمبر نے خدا سے حاصل کی تھی۔ وہی علیؑ جو روز اول ہی سے موحد اور خدا پرست تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کے دامان شفقت میں رہ کر ہر روز آپؐ سے ایک نیا علم حاصل کرتا تھا اور رسولِ خداؐ نے بعثت سے پہلے خدا کے عظیم فرشتے سے جو حاصل کیا تھا وہی بعینہ علی علیہ السلام کی طرف منتقل کر دیا وہی علی جو وحی کے نزول کے موقع پر وحی کے حصول کو دیکھ رہا

ہوتا تھا۔سب سے پہلے رسالت آپؐ کی رسالت کی تصدیق وتائید کی۔خلافت وامامت اور پیغمبر کی جانشینی کے لئے اس سے بڑھ کراور کون شائستہ ولائق ہوسکتا ہے؟

خلافت علی انتخابی تھی یا انتصابی؟

یہ بات بھی افسوس سے کہنا پڑتی ہے کہ تاریخی لحاظ سے ہمیشہ ہی سے کچھ لوگ ایسے بھی چلے آرہے ہیں جواس حقیقت کو چھپاتے رہے ہیں کہ ''حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے جانشین کی حیثیت سے منصوب فرمایا'' البتہ دشمن سے ان حقائق کے کتمان پر تعجب نہیں ہے،اسی طرح ان لوگوں سے بھی کوئی تعجب نہیں ہے جو جاہل ہیں،اسلامی معارف اوراہلبیت علیہم السلام کی معرفت سے کوسوں دور ہیں۔تعجب تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو خودکوشیعہ سمجھتے ہیں اور چندروز کسی دینی مدرسے میں گزارے ہیں اورحضرت علی علیہ السلام کے فضائل پر متعدد واضح ،روشن اور لاتعداد دلائل کے باوجودان حقائق سے چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔اگر یہ لوگ واقعاً اس بارے میں تحقیق کرنا چاہتے ہیں تو وہ تحقیق کے ابتدائی ترین مسائل سے کیوں آنکھیں بندر کھتے ہیں؟

ہر محقق جانتا ہے اور جولوگ بھی تحقیق سے سروکارر کھتے ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ معارف کا ہرایک رشتہ تحقیقی رَوش کا حامل ہوتا ہے،اور تحقیق کے تمام علوم میں ایک قسم کی روش کو اختیارنہیں کیاجاسکتا۔

ریاضی،جیومیٹری،الجبرا،منطق اوراس قسم کے دوسرے علوم کے بارے میں صرف اور صرف عقل کی مدد سے تحقیق کی جاتی ہے جسے اصطلاح میں ایک خاص تحقیقی نام دیا جاتا ہے۔ اوران مسائل میں تجزیہ وتحلیل کی روش کواپنایا جاتا ہے۔اوران علوم میں اگر تجرباتی آلات سے

کام لیا جاتا ہے تو صرف اس لئے کہ مسئلے کی وضاحت کی جائے یا اس مطلب کی تائید کی جائے جو عقل کے تعاون سے ثابت ہو چکا ہے۔

دوسرے علوم مثلاً طب وغیرہ میں تجرباتی روش کو پنایا جاتا ہے کہ کسی بیماری کے لئے کسی علاج کی دریافت کی صورت میں تجرباتی روش کو اپنایا جاتا ہے۔ ایک فلسفی اپنی تحلیلی قوتوں سے جس قدر زیادہ مدد حاصل کرے گا اسی قدر بہتر انداز میں نتیجہ حاصل کرے گا۔ فزکس میں کیمیکل اور دوسرے تجربی علوم میں بھی تجرباتی روش سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ دیگر علوم میں تحلیلی اور تجرباتی کسی بھی روش سے استفادہ نہیں کیا جاتا۔ مثلاً یہ جاننے کے لئے ''ماسکو'' نامی شہر بھی دنیا میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کہاں پر؟ اس بارے میں مذکورہ دونوں روش میں سے کونسی روش مفید ہوگی؟ آیا عقل یا تجربہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ''سکندر'' نامی کسی شخص نے ایران پر حملہ کیا تھا؟ اگر یہ دونوں طریقہ کار ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہیں تو پھر ان کا کیونکر جواب دیا جا سکتا ہے؟ تو اس قسم کے سوالات کے لئے تیسرے طریقے کو اپنایا جاتا ہے جس کا نام ''روش نقلی'' ہے۔ جس کے تحت صرف اسناد، مدارک، حوالہ جات، نقل اقوال اور معتبر شواہد ہی مفید واقع ہو سکتے ہیں۔

اب روش کے مذکورہ تینوں طریقوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم جب یہ جاننا چاہیں کہ آیا حضرت رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو اپنی خلافت اور جانشینی کے لئے مقرر فرمایا تھا یا نہ؟ تو کیا ہم ''عقلی روش'' سے استفادہ کریں گے اور عقلی تحلیل کے ذریعے سے کسی نتیجے پر پہنچیں گے یا تجربہ یا حس کے ذریعے اس سوال کا جواب حاصل کر سکتے ہیں؟ واضح ہے کہ عقل اور تجربہ کوئی بھی ہمیں اس کا جواب نہیں دے سکتا اس سوال کا جواب صرف اور صرف نقلی روش ہی دے سکتی ہے اور تمام

علماء عالَم خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اس قسم کے مسائل کے تحقیق کی روش کو جو کہ نقلی روش ہے، تاریخی روش سمجھتے ہیں۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ "میں چاہتا ہوں کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی خلافت اور جانشینی کے بارے میں عقلی روش سے کام لوں اور تحقیق کروں" تو کیا اس کی یہ بات عقلاء عالَم کے نزدیک قابل قبول ہوگی؟ واضح سی بات ہے اس تاریخی ماجرا کا اثبات تاریخی اسناد و مدارک کی طرف رجوع کیے بغیر ممکن نہیں۔

دنیا میں بہت سے مسائل رونما ہورہے ہوتے ہیں اور ہم ان سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں، تو کیا ہم انہیں بچشم خود دیکھ رہے ہوتے ہیں؟ آیا ہم عقل کی مدد سے اور ذہن کی تحلیل کے ذریعے سے ان تک نتائج پہنچتے ہیں؟ واضح سی بات ہے کہ اس طرح کے واقعات کے معلوم ہونے کا راستہ وہی "راہ نقل" ہی ہے۔

جب دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ امریکی انتخابات کے سلسلے میں پیدا ہونے والے اختلافات کو بیان کرتے ہیں تو ہم ان ذرائع کی سند کو معتبر جانتے ہوئے ان خبروں کو صحیح مانتے ہیں اور کسی کو اس بارے میں شک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کیوں کہ یہ بات ہرگز قابل قبول نہیں ہے کہ جن تمام لوگوں نے ایسی خبروں کو نشر کیا ہے انہوں نے اس سازش کے تحت آپس میں اتفاق کرلیا ہے اور جھوٹی خبریں نشر کردی ہیں۔ اس قسم کی خبروں کو "خبر متواتر" کہتے ہیں۔ اس قسم کی خبروں سے بعض اوقات ایسا یقین حاصل ہوجاتا ہے جو حس کے ذریعے حاصل ہونے والے یقین سے بھی بالاتر ہوتا ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بعض مقامات پر حس غلطی کرجائے اور آنکھ یا کان اشتباہ کرجائیں مگر "اخبار متواتر" کسی وقت غلطی نہیں کرسکتیں۔

بہرحال اس قسم کے مسائل کے بارے میں تحقیق کا راستہ یہ ہے کہ اخبار و روایات اور اسناد و مدارک کے بارے میں خوب چھان بین کی جائے اور اس طرح کی روش سے ہی یقین حاصل ہوتا ہے۔ یہ خبریں ہی انسان کے لئے قطعی یقین پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہیں اور کسی عقل مند کے لئے کسی بھی طرح شک وشبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتیں۔

جب ایک سنی دانشور ''حدیث منزلت'' کو پانچ ہزار سندوں کے ساتھ نقل کرتا ہے تو پھر کوئی عقل منداس کے بارے میں شک کرسکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ جھوٹ ہے؟ جبکہ اس طرح کی گفتگو کو اہلسنت کے ہزاروں علماء، محدثین اور اکابر بھی نقل کر چکے ہیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس بارے میں تحقیق اور جستجو کریں تو اسناد اور مدارک کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ اور کون سا راستہ ہے؟ اسناد اور مدارک اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ خود علماء اہلسنت نے اپنی کتابوں میں ''اخبار متواتر'' کے بارے میں صراحت کی ہے کہ خبریں جو کہ متواتر کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں سے قطعی متواتر کی حیثیت کی حامل ہے وہ ہے ''حدیث منزلت'' یعنی حضور پاک کا علی علیہ السلام سے فرمانا ''انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ'' اور یہ ان متواتر ترین روایات میں سے جو پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہیں۔ تو اب بتایئے کہ ان تمام خصوصیات کے باوجود اگر کوئی شخص اس بارے میں شک کرے تو آپ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کریں گے؟ آیا ''حدیث منزلت'' کے صحیح ہونے کے بارے میں شک وتردید ایسے نہیں ہے جیسے دنیا میں ''سونامی'' کی تباہ کاریوں کے بارے میں کہا جائے کہ جھوٹ ہے تو آپ اس کبارے میں کیا فرمائیں گے؟۔

یہ احادیث اپنے ان تمام اسناد اور تائیدات کے ساتھ جو خود علماء اہل تسنن کی طرف سے انہیں حاصل ہیں قطعاً ناقابل انکار ہیں اور یہ تمام احادیث اس بات کی شاہد ہیں کہ رسالت پیغمبر

اکرمؐ کے آغاز ہی سے امیر المومنین علی علیہ السلام کا آنحضرتؐ کے خلیفہ اور جانشین کے عنوان سے تعارف کرایا گیا۔ صرف ایک شبہ جو ممکن ہے پیش کیا جائے یہ ہے کہ: کوئی شخص یہ کہے شاید پیغمبر نے یہ کام اپنی طرف سے انجام دیا ہے اور علی علیہ السلام کا انتخاب آپ کی ایک ذاتی پسند تھی۔"

اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ہمارے پاس ایسے بیشمار دلائل ہیں جن کی رو سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر سرکار پیغمبر اکرمؐ وحی کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے چنانچہ جس طرح ہم "سدالابواب" (دروازوں کے بند کرنے) کی داستان میں بیان کر چکے ہیں جہاں پر آپؐ نے خود فرمایا تھا کہ: "میں اپنی طرف سے کوئی کام نہیں کرتا "ان هو الا وحی یوحی" یہ تو حکم الٰہی ہوتا ہے جسے میں بجالاتا ہوں۔"

اس مسئلے کے آخر میں ہم داستان غدیر کو بیان کرتے ہیں تاکہ کم ترین شبہ بھی باقی نہ رہ جائے جیسا کہ آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ مقام غدیر خم پر یہ آیت نازل ہوئی "یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاس" "اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف آپکے پروردگار کی جانب سے نازل ہوا اسے پہنچا دیجئے اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو خدا کی رسالت کو نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں (کی گزند) سے محفوظ رکھے گا۔ (مائدہ/٦٧) ماجرائے غدیر کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ خداوند عالم "علامہ امینی" کے درجات بلند فرمائے جنہوں نے تشیع کی حقانیت کی عظیم ترین اسناد میں سے ایک سند "حدیث غدیر" کے لئے اپنی عمر کا ایک وافر حصہ اس "عظیم دائرۃ المعارف" کی جمع آوری میں صرف کر دیا اور ہم خداوند عالم سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان جیسے بزرگوں کی تصنیفات وتالیفات سے کماحقہ فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

۵

سقیفہ......سیکولرازم کا نقطہ آغاز

دعوت ذوالعشیرہ پرایک نظر

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے فضائل کو ذکر کیا جا چکا ہے اور آپ کو خداوند عالم نے منصب خلافت ولایت کی لیاقت وشائستگی کے لئے جن خوبیوں اور خصوصیات سے نوازا ہے وہ بیان ہو چکی ہیں۔ اس بارے میں بحث کافی طولانی ہے، چند صدیوں کے دوران بزرگ شیعہ علماء کی اہم ترین فعالیتوں میں سے ایک اس بارے تحقیق تھی اوران بزرگواروں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں مختلف صورتوں میں تحریر کی ہیں۔ اوران کی یہ کوشش اس حد تک وسیع ہے کہ جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ابہام کا کوئی نقطہ باقی نہیں رہنے دیا، چنانچہ ان تصنیفات میں سے دونہایت ہی گراں قدر اور وقیع کتابوں کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے ان میں سے ایک کا نام ''حلقات'' (عبقات الانوار) ہے اور دوسری کا نام ''الغدیر'' ہے۔ عبقات میر حامد حسین ہندی کی خدمات کا شاہکار ہے جس میں منصب خلافت وولایت کے سلسلے میں ذکر ہونے والی روایات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، اوران کی تحقیق پر بڑی عرق ریزی سے کام کیا گیا ہے۔ اوراس بارے انہیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے جبکہ ''الغدیر'' علامہ امینی قدس سرہ کی گرانمایہ تحقیقات کا عظیم ثمرہ ہے اس عظیم اور بزرگوار عالم نے سالہا سال کی سعی وکوشش کے بعد الغدیر کی کئی جلدیں تحریر فرمائی ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے اپنے داخلی فریب خوردہ اور ملحد لوگ- حتی کہ بعض اوقات ''اسلام اور تشیع کے دفاع'' یا مذہب شیعہ کی اصلاح کے عنوان سے- اس بارے

میں ایسے ایسے شبہات پیش کرتے ہیں کہ جن سے ہمارے جوانوں اور نوجوانوں کے اذہان تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ایسے شکوک وشبہات کا جواب دینے کیلئے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی خلافت اور امامت کے بارے میں جن سُنی روایات پر شیعہ اور سنی متفق ہیں، مقدمہ کے طور پر انہی متواتر روایات کو بیان کیا گیا ہے اور اس بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ان احادیث میں ایک ''حدیث یوم الدار'' جس کے بارے میں ہم گذشتہ نشست میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں اور جسے ''دعوت ذوالعشیرہ'' بھی کہتے ہیں روایت کے مطابق ایک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پروردگار عالم کی طرف سے حکم ملا کہ آپ اپنی دعوت کا کھل کر اظہار کریں اور سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں، چنانچہ آپ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو ایک دعوت میں مدعو کیا اور اس مجلس میں ارشاد فرمایا: ''جو شخص مجھ پر سب سے پہلے ایمان لائے گا اور میری رسالت کی تصدیق کرے گا وہ میرا وصی، وارث، وزیر اور خلیفہ ہوگا''۔

مکتب خلفاء کے بزرگ علماء نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اس مجلس میں سوائے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کسی اور نے آپ کی آواز پر لبیک نہیں کہی، اس لئے سرکار رسالت مآبؐ نے بھی انہیؑ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''اِنَّ هٰذَا اَخِیْ وَوَصِیِّ وَوَزِیْرِیْ وَخَلِیْفَتِیْ فِیْکُمْ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْا'' یقیناً یہی میرا بھائی، میرا وصی، میرا وزیر اور تم میں میرا خلیفہ ہے پس تم اس کی باتوں کو سنو اور اطاعت کرو۔ (بحار الانوار جلد ۱۸ باب ۱ روایت ۲۷)

اس حدیث کے بارے میں یہ سوال کھڑا کیا گیا ہے کہ ''اس مجلس میں حضرت ابو طالبؑ بھی تو موجود تھے وہ کیوں نہ آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے؟''

البتہ "ایمان ابوطالبؑ" کا مسئلہ اور بحث کا اس حدیث کے ساتھ خصوصی تعلق نہیں ہے بلکہ ان کلی مسائل میں سے ایک یہ ہے جو مکتب خلفاء اور مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے درمیان اختلافی چلے آتے ہیں، مکتب خلفاء کا نظریہ ہے کہ "حضرت ابوطالبؑ پیغمبر اسلام کے ساتھ خاندانی تعلقات کی وجہ سے ان کی حمایت کیا کرتے تھے، لیکن آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے تھے" جبکہ مختلف صورتوں میں کثیر تعداد میں ائمہ اطہار علیہم السلام سے روایات مروی ہیں کہ: "اس امت میں حضرت ابوطالبؑ کی مثال مومن آل فرعون کی جیسی ہے جس کے متعلق خدا فرماتا ہے: "یَکْتُمُ اِیْمَانَهٗ" (وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا۔ سورہ مومن/28) اسی لئے حضرت ابوطالبؑ بھی مامور تھے کہ اپنے ایمان کو تقیۃً چھپا کر حضرت سرور کائناتؐ کی حفاظت فرمائیں، حضرت ابوطالب علیہ السلام نہ صرف سرکار رسالتمآبؐ پر ایمان رکھتے تھے بلکہ آپ سے پہلے بھی مرد مومن اور معتقد بواحدانیت رب العالمین تھے، لیکن امر الٰہی کی وجہ سے اس بات کے پابند تھے کہ ایمان کا کھلم کھلا اظہار نہ کریں جیسا کہ مومن آل فرعون اور تاریخ عالم میں دوسرے مومنین نے کیا تھا کہ وہ لوگ کچھ مصلحتوں کی وجہ سے خداوند وانبیاء پر ایمان واعتقاد اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی ولایت کا کھلم کھلا اظہار نہیں کرتے تھے۔

کچھ تقیہ کے بارے میں

بحث کی مناسبت سے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اشکالات میں سے ایک کی طرف اشارہ کریں جو "وہابی ٹولہ" شیعوں پر کرتا چلا آرہا ہے، چنانچہ یہ ٹولہ شیعوں کی کمزوری جانتے ہوئے اعتراض کرتا ہے:

شیعہ کہتے ہیں کہ "ہم بعض مقامات پر تقیہ کرتے ہیں" لہٰذا یہ لوگ منافق اور دورُخ ہیں

،باوجودیکہ باطن میں ان کے عقائد ہم وہابیوں سے مختلف ہیں، ہماری نمازوں کو صحیح نہیں سمجھتے مگر ظاہر میں وہابیوں کے امام جماعت کی اقتداء میں بھی نماز پڑھتے ہیں اسی لئے شیعہ منافق ہیں۔

اس شبھے کے جواب میں ہم یہی کہیں گے کہ:''اگر ایمان کے چھپانے اور تقیہ کرنے کا نام ''نفاق'' ہے تو پھر اس منطق کی رو سے مومن آل فرعون سب سے بڑے منافق ٹھہرے (نعوذ باللہ)''اور جسے یہ لوگ منافق کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے نام سے ایک پوری سورت کیوں نازل فرمائی اور کس لئے اس کی اس قدر تعریف وستائش کی ہے؟۔

اسی طرح اوائل اسلام میں حضرت عمارؓ نے اپنے ایمان کو چھپایا جس کی وجہ سے انہیں جان کی امان ملی جبکہ ان کے والدین مسئلہ تقیہ کو نہیں جانتے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی برائت کا اظہار نہیں کیا تھا اسی لئے کفار نے انہیں اس قدر اذیتیں دیں کہ شہید ہو گئے۔

قرآن مجید''اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ ''جسے مجبور کیا جائے مگر اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو (نحل/ 106) کے ذریعہ اس بات کی رہنمائی کر رہا ہے کہ کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جہاں پر ایمان کو چھپانا چاہئے، تاکہ اس طرح سے دشمنوں کے شر سے محفوظ رہا جاسکے یا دوسرے اسلامی مصالح کی حفاظت کی جا سکے۔

امام خمینی قدس سرہ نے اپنی کتاب ''رسالہ تقیہ''میں فرماتے ہیں:''تقیہ ہمیشہ اپنی جان کے خوف کی وجہ سے ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی دو قسمیں ہیں ایک تقیہ ''خوفی''ہوتا ہے کہ جس کے تحت انسان اپنی جان کے ڈر سے اپنے ایمان، عقیدے اور فقہی فتویٰ کا اظہار نہیں کرتا اور دوسروں کی فقہ کے مطابق عمل کرتا ہے، جبکہ بعض اوقات اسلامی امہ کی مصلحت کو پیش نظر رکھ کر تقیہ جیسے عمل کو اپناتا ہے تاکہ اس طرح سے دشمن کی ہر مصلحتیں دشمن کی ہر گزند سے محفوظ رہیں ایسے تقیہ کو''تقیہ

مدارت'' کہتے ہیں''۔

دونوں صورتوں میں تقیہ مکتب اہل بیت کیلئے اعزاز شمار ہوتا ہے جس کی تائید قرآن مجید کر رہا ہے اور جسے مومن آل فرعون نے اپنایا ہے اور حضرت ابو طالب علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی ہے کہ اس باعظمت ہستی نے ''نوبنیاد'' دین اسلام کی مصلحتوں کی نگہبانی کرتے ہوئے تقیہ اختیار کیا اور اسلام کے نونہال کی حفاظت کر کے اسے شجر سایہ دار اور ثمر آور بنا دیا۔

سیکولرازم کا ظہور

حضرت رسالتمآبؐ سے کثیر تعداد میں روایات نقل ہوئی ہیں جن میں کبھی تو علیؑ کو ''خلیفہ'' کہا گیا ہے اور کبھی ''ولی'' کبھی ''مولا'' اور کبھی ''امام'' وغیرہ ان میں سے اکثر کو مکتب خلفاء کے علماء نے بھی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، حتی کہ ان میں سے بعض تو ایسی صریح اور واضح ہیں کہ اگر کوئی شخص غیر جانبدار ہو کر ان کا مطالعہ کرے اس کیلئے کہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت اور ولایت کے بارے میں کوئی بھی شک وشبہ باقی نہ رہے کہ بعض علماء اہل سنت جنہوں نے حضرت علی علیہ السلام کی مدح وثنا ان کی ولایت اور خلافت کے اثبات میں اس قدر روایات کی جمع آوری کی ہے کہ ان پر ''شیعہ'' ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے۔

اس قسم کی روایات فراوانی کے ساتھ موجود ہیں اور متعدد کتب میں ثبت ہو چکی ہے، شائقین اگر چاہیں تو ان کا مطالعہ بھی فرما سکتے ہیں۔ اس دوران ایک اہم نکتہ جو قابل غور ہے وہ ان روایات کے مضمون کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کرنا ہے اوائل اسلام ہی سے جو لوگ بحث وجدل اور مناظرہ میں مغلوب چلے آرہے ہیں اور ان کیلئے ثابت ہو چکا ہے کہ روایات اور ان کی تعبیریں خود سرکار رسالتؐ ہی کی زبانی بیان ہوئی ہیں جن کا مقصد صرف اور

صرف حضرت علی علیہ السلام کی خلافت اور ولایت ہے، وہ تعصب کا شکار ہو کر دلوں میں شیطانی شکوک وشبہات پیدا کر کے ان روایات کی معنوی تحریف کرتے ہیں، چنانچہ ان شبہات میں سے ایک یہ بھی ہے:

''ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت رسالتمآب کی وفات کے بعد ان کے ذمہ جو فریضہ تھا وہ حضرت علی علیہ السلام کو منتقل ہوا ہے اور رسالتمآب کا فریضہ صرف رسالت کی تبلیغ اور دین خدا کی نشر واشاعت تھی، اسی لئے حضرت علیؑ کے ذمہ بھی پیغمبر خداؐ کے خلیفہ ہونے کے ناتے خدا کے دین کی نشر واشاعت کا فریضہ ادا کرنا ہے اور بس!!''۔

اس قسم کے نظریہ سے سیکولرازم کی بنیاد اوائل اسلام ہی سے پڑ گئی تھی، جس کا مقصد ہے ''دین اور سیاست دو الگ چیزیں ہیں' اسی ابتدائے اسلام ہی سے کچھ لوگ ایسے تھے جو کہتے تھے کہ ''امت پر حکمرانی'' یا بالفاظ دیگر ''امامت'' کا تعلق دینوی زندگی اور اس کے چلانے سے ہے جس کا ''رسالت'' کا ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ پیغمبر اکرمؐ، رسولخداؐ تو ہیں جو احکام الٰہی لوگوں تک پہنچاتے ہیں لیکن جہاں تک آپ کی امامت کی بات ہے اور ان لوگوں پر حکومت کا تعلق ہے یا لوگوں کی دینوی امور میں اطاعت کی بات ہے تو یہ چیز آج تک ثابت نہیں ہو سکی۔ بنابریں اگر چہ حضرت علی علیہ السلام رسولخداؐ کے خلیفہ ہیں لیکن ان کا فریضہ صرف دینی امور کی تبلیغ ہے جس طرح کہ حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فریضہ تھا۔

خلاصہ کلام: حکومت کا مسئلہ الگ ہے اور تبلیغ دین کا مسئلہ جدا ہے۔ اور روایات میں یہ جو حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کا ذکر ہے اس سے فقط تبلیغ دین میں آنحضرت کی خلافت ونیابت ہے۔ شاید آپ تعجب کریں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ صدر اسلام میں اس طرح کا نظریہ کام

کرے؟ لیکن آپ یقین کریں کہ یہ حقیقت ہے اور اتفاق سے سقیفہ کے ماجرا کی بنیاد بھی اسی نظریئے پر استوار ہوئی۔ کیونکہ ابھی حضور سرورِ کائنات کا جسد اطہر سپرد خاک نہیں ہوا تھا کہ کچھ لوگ سقیفہ میں امت کے لئے خلیفہ اور امام کے انتخاب کے لئے واسطے جمع ہوئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا صرف دین کے معاملے میں عمل دخل تھا رہا امت کی رہبری، قیادت اور معاشرے پر حکومت کا تعلق، تو اس چیز کا چونکہ دین سے تعلق نہیں ہے، لہذا اللہ اور اس کے رسولؐ نے اس بارے کچھ ارشاد نہیں فرمایا اس بارے میں فیصلہ کرنا خود ہمارا اپنا کام ہے اللہ اور رسول کا نہیں جس کے معنی کھلم کھلا یہ ہوتے ہیں کہ "دین، سیاست سے جدا ہے" اور اس نظریئے کا سنگ بنیاد پیغمبر اکرم کی وفات کے دن سقیفہ میں رکھا گیا ہے۔

تاریخ اسلام میں سیکولرازم کا پہلا مبلغ

تاریخ اسلام میں سیکولرزم کا سب سے پہلا پرچار کرنے والا اور مبلغ معاویہ تھا انہوں نے اپنے اس نظریئے کا اظہار حضرت علی علیہ السلام کے نام اپنے ایک مکتوب میں کیا حضرت علی علیہ السلام کے پنجسالہ دور حکومت میں آپ کے اور معاویہ کے درمیان بہت سے مکتوبات کا تبادلہ ہوا۔ کیونکہ حضرت علی علیہ السلام نے معاویہ کو شام میں ان کے منصب ___ گورنری ___ سے معزول کر دیا تھا اور نہیں چاہتے تھے کہ جنگ وجدال اور خونریزی کا موقع آنے پائے اور بے گناہوں کا خون بہنے سے بچ جائے۔ اسی لئے آپ چاہتے تھے کہ معاویہ اپنی حجت تمام کریں۔ اور ساتھ ہی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو بھی دور کریں۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ کہیں بہتر تھا کہ حضرت علی علیہ السلام معاویہ کو بات چیت اور بحث ومباحثہ کی دعوت دیتے اسے ہدایت کرتے ممکن ہے کہ معاویہ راہ راست پر آجاتا۔ آپ نے ایسا

کیوں نہیں کیا؟ چنانچہ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے آپ کی حکومت کے دور میں آپ کے اور معاویہ کے درمیان کافی خط وکتابت ہوتی رہی حضرت علی علیہ السلام کے معاویہ کے نام بہت سے مکتوبات نہج البلاغہ میں درج ہیں۔ اور معاویہ کی طرف سے جوابات بھی شرح ابن ابی الحدید جیسی بعض کتابوں میں مذکور ہیں ان خطوط میں سے ایک خط میں حضرت امیر المومنینؑ میں اپنے لئے احادیث پیغمبر سے استدلال کرتے ہوئے لکھا: ''حضرت رسولخداؐ نے مجھے اپنا وصی اور وزیر قرار دیا اور فرمایا: علی علیہ السلام، میرے بعد تم پر میرا خلیفہ ہوگا۔ اور حضور اکرمؐ میرے بارے ولایت، امامت، خلافت اور ریاست جیسی تعبیریں ارشاد فرمائیں۔ ان کے ہوتے ہوئے تم کیونکر انکا انکار کرسکتے ہو''۔

معاویہ نے جواب میں تحریر کیا: ''اِلَّا وَاِنَّمَا کَانَ مُحَمَّدٌ رَسُوْلاً مِنَ الرُّسُلاِاِلَی النَّاسِ کَافَّةًفَبَلَّغَ رِسَالَتِ رَبِّهٖ لَایَمْلِکُ شَیْئًا غَیْرَہ''' (بحار جلد ۳۳ باب ۱۶) یہ ٹھیک ہے کہ آپ خلیفہ رسول اور ان کے جانشین ہیں مگر رسولخداؐ کون تھے؟ وہ صرف ایک پیغام رساں ہی تو تھے جو خدا کی طرف سے لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچا کر چلے گئے ''لَایَمْلِکُ شَیْئًا غَیْرَہ'' خدا کی طرف سے پیغام لائے اور لوگوں تک پہنچائے اس کے علاوہ اور کیا تھے اسی بنا پر آپ بھی انہی کے ان امور میں خلیفہ ہیں کہ حضور جو پیغام خداوندی لائے تھے آپ لوگوں تک وہی پہنچائیں رہی لوگوں پر حکومت، امامت اور ریاست تو یہ ان کے پاس بھی نہ تھی آپ کے پاس کیسے پہنچ گئی؟۔

حضرت امیر نے اسے اس کا جواب ان لفظوں میں دیا: ''زَعَمْتَ اِنَّهٗ کَانَ رَسُوْلاً وَلَمْ یَکُنْ اِمَامًافَاِنَّ اِنْکَارَکَ عَلٰی جَمِیْعِ الْاَنْبِیَآءِ الْاَئِمَّةِ'' (ایضاً) تم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضور پیغمبر اسلام صرف رسول تھے امت پر امام اور صاحب حکومت نہیں تھے۔ ایسی باتیں

تمہارے صرف پیغمبر اسلام کے امام امت ہونے کی نفی نہیں کر رہی ہیں بلکہ ان تمام انبیاء کی نفی کر رہی ہیں جو امامت کے درجے پر فائز تھے۔''

حضرت امیر علیہ السلام کے فرمان کے وضاحت کے طور پر ہم عرض کئے دیتے ہیں کہ قرآن مجید میں دو آیات ایسی ہیں جو انبیاء کی امامت کی صراحت سے نشاندہی کر رہی ہیں پہلی آیت یہ ہے''وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ''اور ہم نے ان میں سے بعض پیغمبروں کو امام بنایا جو ہمارے فرمان کے مطابق لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں (سجدہ/۲۴،انبیاء/۷۳)

دوسری آیت وہ ہے جو کھلم کھلا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کو ثابت کر رہی ہے ارشاد ہوتا ہے:''وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرَاهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ''اور جب ابراہیم علیہ السلام کا ان کے رب چند کلمات کے ذریعہ امتحان لیا اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو اللہ نے فرمایا:''میں تمہیں لوگوں کا امام بنا رہا ہوں''(بقرہ/۱۲۴)

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو نبوت مل چکی، رسالت کے درجے پر فائز ہو گئے، خلیل الرحمان کے الٰہی خطاب سے نوازے گئے تو آخر میں انہیں عہدہ امامت پر فائز کیا گیا۔ اور آپ کو یہ آخری عہدہ آخر عمر میں عطا ہوا جبکہ آپ کی عمر مبارک سو سال سے بڑھ چکی تھی۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب خداوند کریم نے انہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسا لائق فرزند عطا فرما دیا تھا۔ اور جب وہ ایک جوان رعنا ہو گئے تو خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے فرزند عزیز اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کے ذریعہ امتحان لے لیا اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ اور ذبح اسماعیل علیہ السلام بھی انہیں امتحانات میں سے ایک اور آخری امتحان تھا تو ارشاد ہوا''اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ''میں تمہیں لوگوں کا امام اور پیشوا مقرر کرتا ہوں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ مقام امامت سب سے آخری اور سب سے اعلیٰ

مقام ہے۔جس سے حضرت ابراہیمؑ نوازے گئے۔

یہ فضیلت ـــــ یعنی عہدہ امامت سے نوازنا ـــــ ایک ایسی اہم اروالاترین فضیلت تھی کہ جس کے ملتے ہی حضرت ابراہیمؑ نے فوراً بارگاہ رب العزت میں عرض کیا: ''ومن ذریتی'' پروردگارا! یہ عہدہ میری نسل اور ذریت میں بھی قرار دے۔

حضرت ابراہیمؑ کی ذاتی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اولاد اور ذریت کے بارے میں خاص طور پر مہربان تھے اور ہر مناسب موقع محل پر اپنی آئندہ نسل کے لئے دست بدعا ہو جاتے تھے۔چنانچہ جب انہیں منصب امامت پر فائز کر دیا گیا تو بارگاہ خداوندی میں دست دعا بلند کر کے عرض کیا یہ عہدہ میری اولاد کو بھی عطا فرما تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرماتے ہوئے فرمایا: ''لَایَنَالُ عَهْدِیْ الظَّالِمِیْنَ'' یعنی میں یہ عہدہ انہیں عطا کروں گا لیکن ظالم لوگ اس تک نہیں پہنچ سکیں گے۔(ایضاً)

پس حضرت ابراہیمؑ اور بعض دوسرے انبیاء علیہم السلام قرآنی نص کے مطابق عہدہ امامت کے حامل تھے۔اور انہی آیات کے پیش نظر حضرت امیرالمؤمنین علی ابن ابی طالبؑ معاویہ سے فرماتے ہیں: ''اگر تم حضرت رسول گرامیؐ کی امامت کے قائل نہیں ہو اور انہیں صرف نبی اور رسول سمجھتے ہو کہ وہ ایک پیغام رساں کی حیثیت سے آتے تھے اور اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچا کر چلے گئے اس طرح سے نہ صرف تم حضور اکرمؐ کی امامت کے منکر ہو گئے بلکہ جن جن انبیاء کی امامت کی قرآن نے تصریح کی ہے ان سب کے منکر بھی ہو گئے۔''

جو آیات دیگر انبیاء کی امامت کو ثابت کرتی ہیں انہی کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ کی امامت بھی ثابت ہوتی ہے جبکہ اور بھی دوسری بہت سی آیات خصوصیت کے ساتھ آنحضرتؐ کی امامت کو ثابت کر رہی ہیں۔جن میں سے شاید صریح ترین یہ آیت ہے ''اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ

اَنفُسِهِم ''یعنی نبی پاک مومنین کے اپنے نفوس سے زیادہ ان پر حق تصرف رکھتے ہیں (احزاب /٦) اس آیت کے مطابق پیغمبر اکرمؐ تمام مومنین کی اپنی جانوں کی نسبت خود ان سے زیادہ اولیٰ ہیں اور جو بھی تصرفات کی وہ اپنی جان اور مال میں ولایت رکھتے ہیں حضور پاک کو ان میں ان سے زیادہ حق تصرف حاصل ہے۔

اسی طرح کئی دوسری آیات کی طرف بھی اشارہ کہا جا سکتا ہے، مثلاً ''اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُولُہ ''تمہارا اولیٰ تو بس اللہ اور اس کا رسول ہے۔(مائدہ/٥٥) نیز وہ آیات بھی ہیں جن میں مطلق طور پر آنحضرتؐ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے''اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ ''خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو (نساء/ ٥٩۔ اور کئی دوسری آیت) ان تمام آیات کا معنیٰ حضرت رسولخداؐ کے لئے مقام امامت کا اثبات ہے، جبکہ معاویہ پوری جسارت کے ساتھ ان تمام آیات کے مفہوم و مصداق کا انکار کر رہا ہے۔ اور اس کا یہ انکار اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ ان سے بے خبر تھا بلکہ وہ بحث و مناظرے کی صورت یوں ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ ''اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا اور یہ بات میرے لئے پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہوتی تو اس کی مخالفت کبھی نہ کرتا اور آپ کی ہر بات کو مان لیتا'' بالفاظ دیگر وہ جاہل نہیں تھا بلکہ ''تجاہل عارفانہ'' کا ارتکاب کر رہا تھا۔ اور یہ بھی اس کی ایک مکارانہ چال تھی۔

''تجاہل'' معاویہ کی ایک چال تھی

منجملہ اور مقامات کے ایک موقع اور بھی ایسا تھا کہ جہاں پر معاویہ نے یوں ظاہر کیا کہ اگر وہ مطلع ہوتا تو ہرگز سرپیچی نہ کرتا۔ اور وہ ایک ایسا واقعہ ہے جو امیر المومنین علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد پیش آیا اور اس کی داستان کچھ یوں ہے:

ایک مرتبہ حج کے بہانے معاویہ نے حجاز مقدس کا سفر اختیار کیا__ چالباز سیاستدانوں کی طرح کہ جس کے نمونے آج بھی دکھائی دیتے ہیں کمزور ایمان کے لوگوں کو اپنا بنانے اور اپنے دام فریب میں پھنسانے کے لئے دعوتوں کا اہتمام کرتے اور ان دعوتوں میں ان کی خوب آؤ بھگت کرتے تھے تحفے تحائف سے نوازتے ہیں__ منقول ہے کہ اس نے__ بظاہر مسجد نبوی میں_ معاشرہ کے تین برجستہ شخصیتوں کو دیکھا کہ ایک دوسرے کے پاس بیٹھے باتیں کرر ہے تھے۔ وہ تینوں حضرات عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور سعد بن ابی وقاص تھے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہی سعد، کربلا کے واقعہ میں لشکر یزید کے سالار عمر کا باپ اور اپنے زمانے کے معروف افراد میں سے ایک اور صحابی رسولؐ تھے۔ اور یہ ان افراد میں سے تھے جنہوں نے معاویہ کی بیعت نہیں کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ علی علیہ السلام کی بیعت سے بھی روگردان رہے تھے۔

بہر حال معاویہ ان تینوں کے پاس آیا اور آکر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہر ایک کی مزاج پرسی کرنے لگ گیا۔ آخر میں سعد بن وقاص سے کہا: ''ایک آپ وہی شخص ہیں جنہوں نے ہماری بیعت نہیں کی؟'' سعد نے جواب دیا: ''جی ہاں! میں وہی ہوں، میں چونکہ اب بوڑھا ہو چکا ہوں لہذا میں ایسی بحثوں میں نہیں پڑنا چاہتا علاوہ اس کے کہ آپ کی بیعت میں کچھ ابہام پائے جاتے ہیں اور اس کام کے صحیح ہونے پر بھی یقین نہیں رکھتا'' معاویہ نے ان سے پوچھا: ''آپ کو کیسے جرائت ہوئی ہے کہ آپ میرے بارے میں کہیں کہ مجھ میں بیعت لینے کی صلاحیت نہیں ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''میں نے حضرت رسولخداؐ سے سنا ہے آپؐ نے فرمایا: ''عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ يَدُوْرُ حَيْثُمَا دَارَ عَلِيٌّ'' علی علیہ السلام حق کے ساتھ ہے اور حق علی علیہ السلام کے ساتھ ہے، جہاں علی علیہ السلام ہوتا ہے وہاں حق ہوتا ہے، (بحار الانوار جلد ۳۸ باب ۵۷ روایت ۱) حضور رسالتمآبؐ کے اس فرمان ہوتے ہوئے

میں علی کو چھوڑ کر تمہاری بیعت کیونکر کرسکتا تھا؟''

یہ سن کر معاویہ نے کہا: ''آپ نے تو حضورؐ کا عجیب قول نقل کیا ہے! میں نے آج تک یہ نہیں سنا تھا!! پیغمبرؐ نے کب یہ ارشاد فرمایا تھا؟ آیا آپ کے پاس اس کی دلیل یا کوئی گواہ بھی ہے؟''۔

مسعود بن ابی وقاص نے کہا: ''جی ہاں! حضرت ام المؤمنین ام سلمہؓ اس فرمان کے صادر ہونے کی گواہ ہیں''۔

امیر شام سعد کے قول کی تصدیق کے لئے تینوں مذکورہ افراد کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ کی طرف چل پڑے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت ام سلمہؓ پیغمبرؐ کی ایک زوجہ محترمہ ہیں اور قرآنی آیت کی رو سے ''ام المؤمنین'' اور لائق احترام شخصیت ہیں۔

غرض جب سب لوگ حضرت ام سلمہؓ کے گھر پہنچ گئے تو معاویہ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا: ''مومنوں کی ماں! آپ جانتی ہیں کہ ان دنوں جھوٹ بڑی فراوانی کے ساتھ بولا جارہا ہے اور ایسی ایسی باتوں کی نسبت پیغمبر پاکؐ کی طرف دی جارہی ہے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سعد بن ابی وقاص دعویٰ کررہے ہیں کہ انہوں نے رسولخداؐ سے ایسی بات سنی ہے جسے ہم نے آج تک نہیں سنا، بلکہ ان کا تو یہ دعویٰ ہے کہ آپ ام المؤمنین بھی اس کی گواہ ہیں'' ام سلمہ نے پوچھا ''کونسی بات؟'' معاویہ نے کہا: ''سعد دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے رسولخداؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ''عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ وَالْحَقُّ یَدُوْرُ حَیْثُمَا دَارَ عَلِیٌّ'' علی حق کے ساتھ ہے اور حق علی کے ساتھ ہے، اور حق وہیں پر ہوتا ہے جہاں علی ہوتا ہے۔ یہ سن کر حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا: ''اسی جگہ اور اسی مکان میں حضور پاکؐ نے اس حدیث کو ارشاد فرمایا ہے۔

حضرت ام سلمہؓ کی شہادت کے بعد معاویہ بحث میں مغلوب ہو گیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا لیکن حاضرین کو فریب دینے کے لئے کہا: ''میں نے اس حدیث کو نہیں سنا تھا، اگر سنا ہوتا تو مرتے دم تک علی علیہ السلام کی اتباع سے دست کشی نہ کرتا۔''

اگر معاویہ نے یہ حدیث نہیں سنی تھی تو کیا وہ سینکڑوں حدیثیں بھی نہیں سنی تھیں جو علی علیہ السلام کی ولایت اور امامت پر دلالت کرتی ہیں؟ وہ سب کچھ اچھی طرح جانتا تھا اور اس مسئلہ سے بخوبی آگاہ تھا۔ لیکن لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے یوں ظاہر کرتا تھا کہ معاملہ میرے لئے اشتباہ کا سبب بن گیا ہے۔ اور یہ ایک ایسی چال ہے جسے تمام عیار اور مکار لوگ ذلیل ورسوا ہونے اور شکست کھانے کے بعد اپناتے ہیں۔ اور اپنی غلطیوں کی مختلف تاویلیں کر کے خود کو برحق یا دوسروں کے نزدیک خود کو معذور قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ کلام: اصحاب سقیفہ کی کارروائیں کا سارا نچوڑ یہی ہے کہ دین کو سیاست سے الگ رکھا جائے اور اگر یہ کہا جائے کہ اسلام میں ''سیکولرزم'' کے بانی اصحاب کے خلیفہ تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ اور سب سے پہلا شخص دین سے سیاست کو کھلم کھلا الگ کرنے کا مدعی معاویہ تھا۔ جو اس بات کا قائل تھا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف ایک پیغمبر تھے۔ اور ''لا یملك شئیاً غیرہ'' اس کے علاوہ آپ کی چیز کے مالک نہیں تھے۔ اس کے باوجود پھر اپنے مؤقف کی توجیہ وتاویل کرتے ہوئے کہا: ''اگر میں ان احادیث سے مطلع ہوتا جو علی علیہ السلام کی ولایت پر دلالت کرتی ہیں تو علی علیہ السلام کی پیروی کرتا''

پیغمبرؐ کی امامت سے علیؑ کی امامت ثابت ہوتی ہے

دین سے سیاست کی جدائی کے شبہہ کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت

علی علیہ السلام کی خلافت کے اثبات سے پہلے خودسرکار رسالتمآبؐ کی امامت کو ثابت کیا جائے۔ کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت کے ثابت ہو جانے کے بعد ہی علیؑ کی خلافت وجانشینی ثابت ہوگی۔

یاد رہے کہ امامت ایک ایسا منصب الٰہی ہے کہ جس کے اہم امور میں سے ایک اسلامی امہ کی سیاسی سربراہی رہبری اور قیادت ہے۔ بایں معنی کہ صاحب امامت کے تمام اوامر اور نواہی کی اطاعت اور فرمانبرداری تمام افراد امہ پر واجب اور اس کا ہر حکم نافذ العمل ہے۔ چنانچہ اگر حضرت رسالتمآبؐ اس منصب کے حامل نہیں ہیں تو پھر اس بات کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت رسولؐ کے بارے میں کسی قسم کی گفتگو کی جائے۔ کیونکہ پھر لے دے کر صرف یہی کہا جا سکتا ہے چونکہ حضرت رسولخداؐ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے تبلیغ رسالت اور پیام رسانی کے لئے مامور تھے اور بس! تو علی علیہ السلام بھی آپؐ کے خلیفہ اور جانشین ہونے کے عنوان سے دین کی تبلیغ اور لوگوں کی وعظ ونصیحت کے لئے مامور تھے۔ لیکن اگر ابتداء ہی سے اس بات کو ثابت کر دیا جائے کہ حضور سرور کائنات رسالت کے ساتھ ساتھ منصب امامت کے بھی حامل تھے تو پھر ہم ان روایات کو سند بنا کر ثابت کریں گے کہ حضرت علی علیہ السلام بھی آنحضرتؐ کے اسی امر میں خلیفہ اور جانشین تھے۔

ہمارے نقطہ نظر سے سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلم امام برحق تھے۔ اور قرآنی آیات کی روشنی میں اس بات کو دوسروں کے لئے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں بارہا ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْل'' (یہ جملہ قرآن مجید میں سورہ نساء/۵۹، مائدہ/۹۲، نور/۵۴، محمد/۳۳ اور تغابن/۱۲ میں مذکور ہے، علاوہ ازیں اور بھی متعدد تعبیریں ہیں مثلا ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْل'' یا ''اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہ'' قرآن پاک میں مذکور ہیں)

جیسی تعبیریں بارہا قرآن پاک میں ذکر ہوئی ہیں۔ جو اس بات پر روزِ روشن کی طرح دلالت کر رہی ہیں کہ حضرت رسولخداؐ کی امامت اور آپؐ کی اطاعت ابتدائے امر ہی سے لوگوں کے لئے روشن تھی۔ کیونکہ جب دعوت ذی العشیرہ کے موقع پر حضور پاکؐ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دی تو صرف اور اکیلے علی علیہ السلام نے ہی آنحضرتؐ کی دعوت پر لبیک کہی۔ جس کے نتیجہ میں سرور کائنات نے علی کی طرف اشارہ کر کے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''اِنَّ هٰذَا اَخِیْ وَوَصِیِّ وَوَزِیْرِیْ وَخَلِیْفَتِیْ فِیْکُمْ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْا'' یقیناً یہ (علیؑ) میرا بھائی، میرا وصی، میرا وزیر اور تم میں میرا خلیفہ ہے پس تم اس کی باتوں کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (بحار الانوار جلد ۱۸ باب ا روایت ۲۷) جس سے حاضرین نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ آنحضرتؐ نے علی علیہ السلام کو ''امام'' کی حیثیت سے متعارف کرادیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے ابولہب اور دیگر لوگوں نے مذاق اڑاتے ہوئے تمسخر آمیز لہجے میں حضرت ابوطالب علیہ السلام سے کہا: ''اب کے بعد تم نے اپنے نوجوان بیٹے کی اطاعت کرنا ہے''۔ چنانچہ اگر کلام رسالتؐ کا معنی علیؑ کی امامت اور اطاعت امر نہ ہوتا تو وہ کس بنیاد پر اس کنایہ کے ساتھ ابوطالب علیہ السلام کا مذاق اڑاتے؟ اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت رسول گرامیؐ کے فرمان سے یہ سمجھ لیا تھا کہ آنجنابؐ نے علی علیہ السلام کی امامت لوگوں پر فرض کردی ہے اور ان کی اطاعت کو امت پر واجب قرار دیدیا ہے۔

کونسا طرز حکومت: دینی، آمرانہ یا جمہوری؟

قبل ازیں ایک شبہ ذکر کیا گیا تھا لیکن اس کا کچھ حصہ جواب سے رہ گیا تھا، اور یہ وہی شبہ ہے جو آجکل بہت پیش کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ''حکومت صرف دو قسم کی ہوتی ہے اس سے

زیادہ نہیں ایک آمرانہ اور ایک جمہوری! لہٰذا اسلامی حکومت بھی یا آمرانہ ہے یا جمہوری ہے۔ اور واضح سی بات ہے کہ یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی حکومت آمرانہ ہو۔ بنابریں ماننا پڑے گا کہ یہ جمہوری ہے۔ اور جمہوری حکومت کے تقاضے یہ ہوتے ہیں کہ خود عوام ہی اپنے لئے قانون وضع کریں اور خلیفہ یا سربراہ حکومت کا انتخاب کریں۔ اس لحاظ سے پیغمبرؐ اپنے کس استحقاق کی وجہ سے اپنے خلیفہ اور جانشین کا تقرر کر سکتا ہے؟ یہ تو آمرانہ طرزِ حکومت میں ہوتا ہے کہ سربراہ حکومت اپنی مرضی کے مطابق اپنے جانشین کا تقرر کرتا ہے۔ جمہوری حکومت میں یہ بات ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ طرزِ حکومت کو جمہوریت اور آمریت یا استبدادیت میں تقسیم کرنا اس کی صحیح معنوں میں تقسیم نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر جو حکومتیں بندے قائم کرتے ہیں دو حال سے خالی نہیں ہوتیں۔ یا تو وہ دھونس دھاندلی اور طاقت و جبر کے بل بوتے پر قائم کرتے ہیں اسے آمرانہ یا استبدادی حکومت کہا جاتا ہے، یا پھر عوامی آراء و نظریات یا ووٹوں سے منتخب کرتے ہیں۔ یہ ''جمہوری حکومت'' کہلاتی ہے۔ لیکن جو حکومت خدا کی طرف سے متعین کی جاتی ہے اس میں آمریت یا استبداد کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ استبداد اور آمریت اصورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر کسی امر کو بغیر دلیل و برہان کے زبردستی مسلط کردے۔ اور اصول کی بات یہ ہے ذات باری تعالیٰ کے متعلق آمریت یا استبداد کی نسبت دینا صحیح نہیں اور نہ ہی یہ اس کا موضوع بن سکتی ہے۔ کیونکہ خدا کے سامنے انسان کا کوئی حق نہیں ہے وہ اسے جتلائے اور اس پر بحث مباحثہ شروع کردے۔ وہ ذات متعال تمام مخلوق پر فوقیت رکھتی اور تمام طاقتوں اور اقتداروں پر قدرت کاملہ رکھتی ہے۔ جہاں بھی کسی قدرت کی بات ہوتی ہے درحقیقت اسی ہی ذات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کائنات کی ہر چیز کا وجود اس کے وجود ذی جود سے

ہے جو حق بھی انسان کے لئے ثابت ہوتا ہے درحقیقت خدا ہی کی طرف سے مقرر کردہ ہوتا ہے اسی لئے خدا کو بندوں کے ہم پلہ قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا کی حکومت استبدادی یا آمرانہ ہے۔ اسی لئے کہ خدا کی حکومت بندوں کے ووٹوں سے نہیں بنتی۔ البتہ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ خداوند عالم اپنے بندوں کے لئے ''خیر'' اور ''بہتری'' کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ اور نہ ہی کبھی اس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ وہ تمام مخلوقات کا مولا اور رب ہے۔ اور اس کی ربوبیت کا معنیٰ یہ ہے کہ مخلوقات کے تمام امور خواہ وہ تشریعی ہوں یا تکوینی سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ تمام امور کے چلانے والا ہے۔ اور ہر موجود کو اس کی صلاحیت اور لیاقت کے مطابق کمال کی طرف رہنمائی فرماتا ہے لہذا تمام موجودات کا فرض بنتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں اور بس۔

سب سے پہلا منکر ''ابلیس'' تھا

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس بات کا قائل ہونا کہ قانون سازی اور قانون گزاری نیز حاکم اور حکومت عوام کی مرضی اور ان کی منشاء کے مطابق ہو، درحقیقت خدا کی ''تشریعی ربوبیت'' کا انکار ہے۔ جو ایک قسم کا کفر ہے۔ اور اس نکتے کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ شیطان کا خدا کے ساتھ تنازع بھی تشریعی ربوبیت اور اس اوامر کی اطاعت کے بارے میں تھا۔ اور اسی امر نے اسے اس قدر اسے تباہی کے گہرے گڑھے میں جا گرایا کہ تا قیامت لعنت کا سزاوار پایا۔ ورنہ وہ نہ تو خدا کی خالقیت کا منکر تھا اور نہ ہی اس کی ربوبیت تکوینی کا کیونکہ جب خدا نے اس سے پوچھا کہ ''تو نے آدمؑ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟'' تو اس نے جواب دیا: ''خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ'' ''تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (اعراف/١٢) اسی طرح

اس نے سلسلہ کلام کوآگے بڑھاتے ہوئے کہا:''رَبِّ بِمَا اَغْوَیْتَنِی ''پروردگارا!تو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔(حجر/۹۳)اس طرح کی تعبیروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کی خالقیت کا بھی قائل تھا اوراس کی ربوبیت تکوینی کا بھی۔اوراس کے ساتھ ہی وہ معاد(قیامت)پر بھی ایمان رکھتا تھا۔ اس لئے کہ اس نے خدا اسے درخواست کی کہ''فَانْظِرْنِی اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ''مجھے روزِ قیامت تک کے لئے مہلت دے(حجر/۳۶)اور یہ سب کچھ ایسے حال میں تھا کہ بمطابق فرمان حضرت امیرالمؤمنین درنہج البلاغہ،شیطان اس وقت تک خداوندعالم کی چھ ہزار سال عبادت کرچکا تھا۔ ''کَانَ قَدْعَبَدَاللّٰہَ سِتَّۃَالآفِ سَنَۃٍ لَایَدْرِیْ اَمِنَ سِنِّی الدُّنْیَا اَمْ مِّنْ سِنِّی الآخِرَۃ'' نہیں معلوم کہ یہ دنیا کے چھ ہزار سال تھے یا آخرت کے؟(نہج البلاغہ خطبہ قاصعہ ۲۳۴)لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود خداوندعالم ابلیس کو''کافر''کے عنوان سے متعارف کررہا ہے اور فرماتا ہے:''وَاِذْقُلْنَا لِلْمَلآئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّااِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَوَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ ''سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کردیا اور تکبر کا اظہار کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔(بقرہ/۳۴)

اس قدر عبادت کے باوجود''کفر''کی مہراس کی پیشانی پرلگادی گئی،خدانے اسے اپنی بارگاہ سے راندہ درگاہ قرار دیدیا اوراسے تاابدلعنت کا سزاوار قرار دیدیا۔آخرکیوں؟اس لئے کہ خداوندعالم کے''تشریعی حق ربوبیت''کا منکر ہوگیا،اورکہا کہ:''خدانے اسے کسی دلیل کے بغیر آدم کوسجدہ کرنے کاحکم دیا ہے''اورشیطان کا یہ کہنا کہ''میں آدم سے برتر ہوں اور خدا کوحق حاصل نہیں ہے کہ مجھے آدم کوسجدہ کرنے کاحکم دے''درحقیقت خداوندعالم کی ربوبیت تشریعی کا انکاراور خدا کی ذات کا کفرنہیں تواورکیا ہے؟

قرآن مجید میں یہ جومذکورہے''شیاطین الجن والانس''کچھ شیطان جنوں سے

ہیں اور کچھ انسانوں سے ہیں، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ شیطان فقط کسی ایک ہستی کا نام نہیں بلکہ ایک طرز تفکر اور ایک روئداد کا نام ہے جس میں انسان بھی شامل ہیں اور جن بھی۔

اسی لئے __ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "خداوند عالم کو لوگوں کی منشا اور مرضی کے بغیر کوئی وضع نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی ان کی مرضی کے بغیر کوئی حاکم مقرر کرنا چاہئے" خداوند عالم کی ربوبیت تشریعی کا انکار ہے اور شیطان کی اتباع کا ایک نمونہ ہے۔ "توحید اسلامی" یا اسلامی وحدت قائم ہی اس وقت ہو سکتی ہے جب اس میں "تشریعی ربوبیت" کو تسلیم کیا جائے، چنانچہ اگر کوئی چاہتا ہے کہ اس کے پاس اسلامی وحدت نصاب کی حد تک مکمل ہو تو اسے چاہئے کہ قانون سازی اور اوامر و نواہی کے اجراء کے لئے صرف اور صرف ارادہ خداوندی ہی کو کارفرما کی حیثیت سے قبول کرے۔ اور یہ بھی ہر ایک کے پیش نظر رہے کہ خداوند عالم قانون وضع کرنے میں اپنے لئے کچھ بھی نہیں چاہتا بلکہ اس کے پیش نظر صرف اور صرف موجودات عالم کی خیر و صلاح ہوتی ہے "تشریعی ربوبیت" میں "توحید" کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ فقط اور فقط خداوند عالم ہی امر اور نہی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اور یہ توحید اہم ترین ارکان میں سے ایک رکن ہے جس کے بغیر توحید مکمل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ ابلیس کے نظریہ کی توحید ہو گی جس کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔

آیا جس شخص نے خدا کے وجود کو تسلیم کر لیا وہ موحد بن گیا؟ "خالقیت میں توحید" تو، توحید کا ایک مرحلہ ہے جو اکیلے کافی نہیں ہے۔ اسی طرح "ربوبیت تکوینی" میں توحید کا عقیدہ بھی کافی نہیں ہے کیونکہ اس حد تک توحید کو قبول کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے خدا کو "رب" کہہ کر پکارا اس نے جس چیز کا انکار کیا وہ "ربوبیت تشریعی" تھی۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ "میری عقل یہ کہتی ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کروں۔ کیونکہ میں اس سے بہتر ہوں" لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم احکام خداوندی کے مقابلے میں اپنی عقل کو حاکم مانتے ہیں اور خدا کو حق

حاصل نہیں ہے کہ وہ ہماری اجازت کے بغیر قانون وضع کرے۔ایسے لوگوں کا باطنی کفر قطعی اور مسلم ہے ہی لیکن آیا ظاہر میں بھی کفر اور ارتداد حاصل ہوتا ہے یا نہ؟ تو یہ ایک دوسری بات ہے، جس کا تعلق فقہ کے ساتھ ہے۔

ایمان اور کفر کی حقیقت کا تعلق قلب اور باطن کے ساتھ ہے، ممکن ہے کوئی شخص ظاہر میں شہادتین کا حکم بھی زبان پر جاری کرتا ہے اور احکام اسلام کی بھی پابندی اختیار کرتا ہے، لیکن کیا صرف کلمہ شہادتین زبان پر جاری کرنے کے ساتھ اور دل کو اس کے ہم نوا بنائے بغیر انسان اہل سعادت ونجات ہوسکتا ہے؟ قطعاً نہیں۔ عصر رسالت کے منافقین بھی کلمہ شہادتین زبان پر جاری کیا کرتے تھے، نماز بھی پڑھا کرتے تھے لیکن قرآن کہتا ہے: ''وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ''منافقین سستی اور قلبی رجحان کے بغیر نماز پڑھتے ہیں (نساء/۱۴۲) یہ ظاہری اسلام ہے جس کا ثمرہ یہ ہے کہ ایسے شخص پر اسلام کے ظاہری احکام لاگو ہوتے ہیں۔ مثلاً اسے ظاہر میں پاک سمجھا جائے گا، اس کے جان ومال اور عزت اور ناموس کی حفاظت کی جائے گی وغیرہ وغیرہ بشرطیکہ وہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا کھلم کھلا انکار نہ کرے۔

ربوبیت تشریعی میں بحث اس بارے میں ہے کہ اگر کسی شخص کو اس بات کا یقین ہوجائے کہ ایک حکم خداوند عالم کی جانب سے صادر ہو چکا ہے لیکن اسے دل سے قبول نہ کرے تو ایسا شخص اگر زبان سے اس کا انکار نہ بھی کرے، کافر ہے، اس قسم کا انسان قرآن کی اس آیت کا مصداق ہوگا کہ ''نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ''ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں (نساء/۱۵۰) قرآن مجید اس قسم کی طرز فکر کے حامل کے متعلق فرماتا ہے ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ''ایسے لوگ یقینی طور پر کافر ہیں۔ (ایضا/۱۵۱)

اگر احکام دین پر ایمان اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ خداوند عالم کی جانب سے صادر

ہوئے ہیں تو یہی معیار تمام احکام کے بارے میں مدنظر رکھنا ہوگا۔ اور اسی نظریہ کے تحت سب کو قبول کرنا ہوگا۔ بلکہ اگر کچھ احکام اس لئے قبول کر لئے جائیں کہ یہ انسان کے اپنے نفسانی خواہشات کے مطابق ہیں تو یہ بھی خدا پر ایمان نہیں ہوگا۔ بلکہ اپنے نفس اور اپنی ذات پر ایمان ہوگا تو کیا حال ہوگا، ان لوگوں کا جو بعض احکام دین کو قبول کرتے ہیں اور بعض دوسرے احکام کو رد کر دیتے ہیں؟

امامت کی بحث میں بھی اگر کسی کے لئے واقعاً ثابت ہو جائے کہ حضرت پیغمبر خداؐ حضرت علی علیہ السلام کو خدا کی طرف سے اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے اب اگر وہ دل سے انکار کرے گا تو مسلمان نہیں رہے گا۔ اور یہاں پر کافر اور کفر واقعی مومن اور ایمان کے مقابل میں ہونگے تا کہ ظاہری اسلام اور مسلم کے مقابلے میں۔

بحث اس بات میں ہے کہ اگر کسی کے لئے ثابت ہو جائے کہ پیغمبر خداؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو حکم خداوندی کے مطابق خلافت کے لئے مقرر فرمایا ہے لیکن پھر بھی وہ اس کو دل سے قبول نہیں کرتا اور کہے میں انہیں خلیفہ تسلیم نہیں کرتا۔ ایسا شخص باطنی طور پر مسلمان نہیں ہے بلک "نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ" کا مصداق ہوگا۔ البتہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ بعض برادران اہلسنت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی خلافت بلافصل کے بارے میں مکمل طور پر آگاہی نہیں رکھتے اور ان کا انکار علم اور عمل کی بنیاد پر نہیں ہے۔

سقیفہ ___ تاریخ اسلام کی بہت بڑی عبرت

گزشتہ بحثوں میں بیان ہو چکا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے فضائل کی دو قسمیں ہیں ایک قسم تو ان فضائل کی ہے جو خداوند عالم کی طرف سے آپ کو بطور ہدیہ اور بخشش عطا ہوئے ہیں

جنھیں ''وہبی فضائل'' کہتے ہیں جبکہ فضائل کی دوسری قسم وہ ہے جنھیں آپؑ نے خود کسب کیے ان کے حصول کے لئے آپ نے خوب سعی وکوشش کی۔اور پھر وہبی فضائل کی دو قسمیں ہیں ایک تکوینی اور دوسرے تشریعی ۔اور اس وقت ہمارے لئے حضرت علی علیہ السلام کے جن فضائل کی زیادہ اہمیت ہے وہ آپ کے ''تشریعی فضائل'' ہیں۔جن کا واضح ترین مصداق آپ کی خلافت اور امامت کا مسئلہ ہے۔

خلافت علی علیہ السلام کے استحکام کے لئے پیغمبر اسلامؐ کی آخری کوشش

حضرت امیر علیہ السلام کی خلافت اور امامت کا مسئلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے آغاز اور تبلیغ رسالت کے علنی ہونے سے پہلے سامنے آچکا تھا۔اور دوسرے لوگوں کے سامنے اس کا بیان ''دعوت ذوالعشیرہ'' کے دن شروع ہوگیا۔اور اس کے بعد مختلف گوناگوں مناسب موقعوں پر اسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے رہے اور یہ سلسلہ آپ کی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہا۔اور تمام دلائل سے زیادہ واضح اور برجستہ دلیل ''داستان غدیر'' ہے۔جس کے بارے میں لاتعداد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور بے حدوحساب موقعوں پر بحث ومباحثے اور مناظرے ومجادلے انجام پا چکے ہیں،باوجودیکہ واقعہ غدیر سے رحلت رسالتمآبؐ کا ستر دن سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا،پھر بھی حضور پاکؐ نے اس قلیل عرصے میں امیر المومنین علی علیہ السلام کی خلافت اور امامت کے مسئلے کی وضاحت کے لئے بڑی حد تک اہتمام کیا تا کہ لوگوں پر پوری طرح حجت تمام ہوجائے اور اس بارے میں کسی کے لئے کسی قسم کے بہانے کی گنجائش باقی نہ رہے۔لیکن اس کے باوجود کہ حضورؐ نے تاکید کی کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دی پھر بھی عصیان،مخالفت اور سرکشی کا امکان ختم نہ ہوسکا۔کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو خداوند عالم کے دیرینہ

طریقہ کار یا سنت الٰہی کی خلاف ورزی ہوتی یعنی خدا کسی بندے سے آزمائش اور اسی کے امتحان کے تمام مقدمات مہیا ہوں اور اطاعت و نافرمانی کے لئے راہ بطور مساوی صاف ہو۔

حضور اکرمؐ نے اپنی زندگی کے چند آخری دنوں میں ایک تدبیر وسوچی تا کہ اس طرح سے احتمالی طور پر جو لوگ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی خلافت سے موافق نہ ہوں اور ممکن ہے کہ اس کی مخالفت کے لئے کوئی سازش کریں وہ مدینہ ہی میں نہ رہیں، اسی لئے آپؐ نے ایک لشکر کے تیار ہونے کا حکم دیا اور فرمایا: ''جو مسلمان بھی جہاد کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ اس لشکر کے ساتھ جہاد کے لئے روم کی سرحدوں کی طرف جائے۔ جہاں پر حضرت جعفر طیار اور حضرت زید بن حارث نے جام شہادت نوش فرمایا تھا''

اس لشکر کی کمان کے لئے حضرت رسالتمآبؐ نے اسامہ بن زید کو منصوب فرمایا جو نہایت ہی باوقار جوان تھے اور جن کے والد حضرت زید اس سے پہلے جنگ میں شریک ہو کر جام شہادت نوش فرما چکے تھے والد کی جگہ پر حضورؐ نے زید کو سپہ سالار لشکر مقرر فرمایا، ساتھ ہی اس بات کا بڑی شدت سے اصرار فرمایا کہ جو شخص جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اسامہ کی سربراہی میں اس لشکر کے ساتھ ضرور جائے۔

شیعہ سنی مورخین نے نقل کیا ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کی شرکت کے لئے حضورؐ نے اس قدر تاکید بالائے تاکید فرمائی کہ اس سے پہلے کسی بھی جنگ کے اتنا تاکید نہیں فرمائی تھی۔ اس ضمن میں آپؐ نے اس قدر زور دے کر فرمایا: ''نَفِّذُوْا جَيْشَ اُسَامَةَ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ تَاَخَّرَ عَنْهُ'' اسامہ کے لشکر کے ساتھ جاملو، خدا کی اس شخص پر لعنت ہو جو اس لشکر سے پیچھے رہ جائے۔ (بحار الانوار جلد ۲۷ باب ۱۔ روایت ۴۔ جلد ۲۸ باب ۳ روایت ۳)۔ حضور پاکؐ کی یہ ایک ایسی تجویز یا حکمت عملی ان لوگوں کے لئے تھی جن کے متعلق خدشہ تھا کہ ممکن ہے وہ سرکار رسالتمآبؐ

کی رحلت کے موقع پر کوئی فتنہ برپا کردیں۔لہذا وہ مدینہ میں موجود ہی نہ ہوں۔" تا کہ حضرت امیرؑ کی خلافت اور امامت کا مسئلہ مشکل سے دوچار نہ ہونے پائے۔

لیکن افسوس پیغمبر اسلام کے مسلسل اصرار کے باوجود کہ سب لوگ جنگ میں شریک ہوں حضرات شیخین اس لشکر کے ہمراہ ہرگز روانہ نہیں ہوئے اور حضور اقدس کے گھر آگئے حضور انورؐ انہیں دیکھ کر سخت ناراحت ہوئے اور پوچھا: "کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ سب لوگ جہاد کو جاؤ اور کسی بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ لشکر کو چھوڑ کر واپس آجائے۔" تو دونوں حضرات نے جواب میں عرض کیا: "چونکہ آپ کی حالت ٹھیک نہیں تھی لہذا ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ آپ کو مدینہ میں اکیلے چھوڑ کر چلے جائیں۔اور راستوں میں آپ کی صحت وسلامتی کے بارے میں دوسرے لوگوں سے پوچھتے رہیں۔ہم صرف آپؐ سے محبت کے ناتے لشکر کے ہمراہ نہیں گئے۔اور آپ کے پہلو میں رہنا مناسب نہیں سمجھتے۔" (ایضاً جلد ۲۲ باب ا روایت ۱۹)

ان کے اس اقدام سے پیغمبر اکرمؐ کی حکمت عملی کارگر ثابت نہ ہوئی۔جن لوگوں کو اسامہ کے لشکر میں شرکت کرنا تھی وہ واپس آگئے اور رسالتمآبؐ کے حکم کی نافرمانی کی۔اس کے بعد ایک مرتبہ اور حضورؐ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں ایک تدبیر سوچی اور وہ یہ کہ سرکار ختمی مرتبتؐ نے اپنے احتضار ــــ جان کنی ــــ کی حالت میں ارشاد فرمایا: "میرے پاس قلم دوات لے آؤ تا کہ میں تمہارے لئے ایسی بات تحریر کردوں جس پر عمل کر کے تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔" تو اس موقع پر کچھ لوگ حضورؐ کے پاس ایسے بھی موجود تھے جو کچھ نہ کچھ سیاسی سوچ رکھتے تھے اور حالات وواقعات کے بارے میں پیش گوئی کر سکتے تھے، متوجہ ہوئے کہ حضور انورؐ جس چیز کو تحریر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں نہایت قوی احتمال یہ ہے کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی امامت کے بارے میں تحریر فرمائیں گے۔اور یہ چیز ان کے مستقبل کے نقشوں پر عملدرآمد سے مانع ہوسکتی

ہے۔اسی لئے وہ اس کے آڑے آگئے۔اور تحریر لکھنے سے مانع ہوئے۔مکتب خلفاء کے محدثین اور ___ مؤرخین کے مطابق حضرت عمر نے فرمایا:''اِنَّ النَّبِیَّ قَدْ غَلَبَ عَلَیْہِ الْوَجَع ''یعنی آنحضرتؐ پر درد کا غلبہ ہوگیا ہے۔(صحیح بخاری ایضا روایت ۵۲۳۷)

اسی طرح منقول ہے کہ انہوں نے اس سے بھی بڑھ کر جسارت آمیز لہجے میں ارشاد فرمایا:''اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہَ یَھْجُر ''(نعوذ باللہ) رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہذیان فرما رہے ہیں(صحیح مسلم شریف روایت ۳۰۹۰) چنانچہ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسے الفاظ اس شخص کے بارے میں استعمال کئے جاتے ہیں جن کی باتوں کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دی جائے اور اس سے بے پروائی برتی جائے۔

غرض حضور پاکؐ اس طرح کے الفاظ سے سخت ناراحت ہوئے اور نہایت غضبناک ہوئے۔اور حاضرین میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں،آخر میں کچھ لوگوں نے عرض کیا:''حضورؐ!اگر اجازت ہو تو قلم دوات لے آئیں؟''تو اس وقت مظلوم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اَبَعْدَ الَّذِیْ قُلْتُم ''اب یہ سب کچھ کہنے کے بعد؟(بحار الانوار جلد ۲۲ باب ا روایت ۱۹) گویا آپؐ فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ''اس طرح سے اگر میں کچھ لکھ بھی دوں تو تم کہو گے کہ رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہذیان لکھا ہے!!''

سقیفہ میں کیا گزری؟

اس طرح سے گویا پیغمبر اکرمؐ کی امت کے بارے میں لطف وکرم اور مہربانی کی تدبیریں بھی کارگر ثابت نہ ہوسکی۔آخر کار روح مبارک ملأ اعلی کی طرف پرواز کرگئی اور سر مبارک امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی آغوش اطہر میں تھا۔اور سرکار کی رحلت کے فوراً ہی بعد

سقیفہ کی داستان کا آغاز ہو گیا۔ مہاجرین اور انصار سقیفہ میں جمع ہوئے اور حضور گرامیؐ کے جانشین کے بارے گفتگو شروع ہو گئی۔ قبیلہ خزرج کے ایک بزرگ بنام ''سعد بن عبادہ'' سقیفہ میں آئے۔ جن کے قبیلہ کی تعداد مدینہ میں موجود مسلمانوں کی تعداد کا پچاس فیصد تھی، وہ اس وقت بیمار بھی تھے ار بلند آواز کے ساتھ بول بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے کہا: ''چونکہ میں اونچا نہیں بول سکتا لہذا کوئی شخص میری آواز کو بلند آواز کے ساتھ دوسروں تک پہنچائے۔ انہوں نے سب سے پہلے خطبہ ارشاد فرمایا: ابتداء میں مہاجرین کی تعریف کی اور اسلام کے لئے ان کی خدمات کا ذکر کیا۔ اور ان کے احترام کو لازم قرار دینے کے بعد کہا: ''اس کے باوجود، مدینہ ہم انصار کا شہر ہے۔ اور پیغمبر اسلامؐ کو بھی ہمارے ہی شہر میں عزت ملی ہے، اسلام کو بھی ہمارے اسی شہر سے پنپنے کا موقع ملا ہے۔ یہ ہم ہی تھے جنہوں نے مہاجرین کو پناہ دی، ان کی مدد کی، ان کی زندگی کے سروسامان فراہم کیے۔ لہذا اسلامی امہ کی امامت ورہبری ہم انصار ہی کا حق ہے۔''

ادھر دوسری طرف مہاجرین تھے جن میں کچھ ازواج کے پیغمبرؐ کے والد صاحبان بھی موجود تھے۔ ان کے پیش نظر ایک خاص پروگرام تھا جس کی بنا پر انہوں نے سعد کی گفتگو کے مقابلے میں بحث کرنا شروع کر دی۔ انہوں نے بھی پہلے پہل انصار کی تعریف کی ان کی خدمات کو سراہا جو انہوں نے پیغمبر اکرمؐ اور مہاجرین کے حق میں کیں۔ اس کے بعد فرمایا: ''یہ ہم مہاجرین ہی تھے کہ جنہوں نے اسلام کی غربت کے دور میں پیغمبر اسلامؐ کے موقف کی تائید کی ان پر ایمان لائے، اسلام میں ہم ہی سابقون الاولون ہیں جن کی قرآن مجید نے ان الفاظ کے ساتھ توصیف کی ہے: ''اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن '' (توبہ/۱۰۰) اس کے علاوہ حضور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے عزیز اور رشتہ دار مہاجرین ہی میں موجود ہیں۔''

بعض روایات میں ہے کہ مہاجرین میں سے ایک شخص نے کہا: ''ہمارے درمیان ایک

ایسی شخصیت ہے کہ اگر وہ خلافت کے لئے پیش گام ہوتو کوئی بھی اس کی مخالفت نہیں کرے گا اور وہ ہے علی ابن ابی طالب علیہ السلام"

غرض امام اور خلیفہ کے انتخاب کے بارے میں مہاجرین اور انصار کے درمیان بحث کافی طولانی ہوگئی، حتیٰ کہ انہیں کہنا پڑا کہ فریقین میں سے کسی کا حق ضائع نہ ہو لہذا اس وقت دو خلیفے منتخب کئے لیتے ہیں: "مِنّا اَمِیرٌ مِنکُم اَمِیر" "ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے ہونا چاہیئے۔ لیکن قوم کے کچھ بڑوں نے کہا: ایسا نہ کرو اس طرح سے مسلمان کمزور ہو جائیں گے اور ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ جس کے نتیجے میں ہماری رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔ لہذا خلیفہ صرف ایک ہی ہونا چاہیئے۔ آخر کار حضرت ابوبکر کو اٹھنا پڑا، انہوں نے ماہرانہ انداز میں خطبہ "ارشاد" فرمایا اور سب سے پہلے انصار کی ستائش و تعریف شروع کردی، اس کے بعد مہاجرین کی عظمت و بزرگواری کے چرچے چھیڑ دیئے اور ان کے اعزازات و انعامات کے تذکرے کئے اور فرمایا: "اسلامی امہ کی وحدت کی حفاظت کے لئے امیر مہاجرین میں سے ہی ہونا چاہئے جبکہ انصار میں سے اس کا ایک وزیر منتخب کرلیا جائے۔ اور ہم قول دیتے ہیں کہ انصار کے مشورے کے بغیر ہم کوئی بھی اقدام نہیں کریں گے۔"

یہ سن کر کچھ انصار ہی ابوبکر کی طرفداری کے لئے کھڑے ہو گئے اور نعرہ تکبیر بلند کر کے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی، اسی اثنا سعد بن عبادہ کھڑے ہو گئے اور قبضہ شمشیر ہاتھوں میں لے لیا۔ حضرت عمر نے جو دیکھا تو انہوں نے فوراً اور بلا فاصلہ اس کے مقابلے میں تلوار نکال لی انجام کار سقیفہ میدان کارزار نظر آنے لگا، لیکن کچھ دوسرے مسلمان ان کے آڑے آ گئے سعد بن عبادہ کو معرکہ کارزار سے باہر نکال دیا، لڑائی رک گئی اور حضرت ابوبکر کی خلافت "پکی" ہوگئی۔

حضرت علی کا ردعمل

اسی دوران اس واقعہ کی خبر حضرت علی علیہ السلام کو ہوگئی حالانکہ اس وقت پیغمبر اسلام کے جسد اطہر کی تجہیز و تکفین مکمل کرنے کے بعد اسے قبر میں اتار چکے تھے۔ آپ نے جونہی حضرت ابوبکر کی "خلافت" کی خبر سنی تو بیلچہ زمین میں گاڑ کر سر مبارک کو آسمان کی طرف بلند کر کے سورہ عنکبوت کی ان آیات کی تلاوت شروع کر دی۔ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم_ الٓمّٓ_ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَّقُوْلُوْا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ. وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ. اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا سَاءَ مَا يَحْكُمُوْن "یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الف، لام، میم۔ کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور یہ وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟ اور تحقیق ہم ان سے پہلوں کو بھی آزما چکے ہیں کیونکہ اللہ کو بہر حال یہ معلوم کرنا ہے کہ کون سچے ہیں اور یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ کون جھوٹے ہیں۔ کیا جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں انہوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ ہم سے بچ نکلیں گے؟ کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ (عنکبوت/ ۱ تا ۴)

پھر فرمایا: "یہ خدا کا وہی امتحان اور الٰہی فتنہ ہے جس کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ اس سے کوئی امت نہیں بچ سکی۔ (اس ماجرا کو تفصیل کے ساتھ بحار الانوار جلد ۲۷ باب ۴ ص ۱۸۱ میں نقل کیا گیا ہے)

ان آیات میں فتنہ اور امتحان کا ذکر ہے، جو غالباً دو مترادف الفاظ میں اور باہم استعمال ہوتے ہیں، اگرچہ لغوی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہیں قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی یہ

دنوں الفاظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے یہ آیہ شریف ہے: ''وَاعۡلَمُوۡا اَنَّمَا اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَة ''یعنی جان رکھو کہ تمہارا مال و دولت اور تمہاری اولاد خدا کی آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ (انفال/۲۸) ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''وَنَبۡلُوكُمۡ بِالشَّرِ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَة ''یعنی ہم تمہیں اچھائیوں اور برائیوں کے ذریعہ آزمائیں گے۔ (انبیاء/۳۵) سورہ عنکبوت کی ابتدائی آیات بھی _ جنہیں حضرت علی علیہ السلام نے سقیفہ کا ماجرا سن کر تلاوت فرمایا تھا_ اسی بات کی طرف اشارہ کررہی ہیں کہ آیا لوگوں نے صرف یہی سمجھ رکھا ہے کہ صرف ایمان کے زبانی دعوے سے خداوند عالم انہیں چھوڑ دے گا اور ان کی آزمائش نہیں کرے گا؟ ارشاد ہوتا ہے کہ: ''وَلَقَدۡ فَتَنَّا لِلَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِم ''ہم نے تو ان سے پہلے لوگوں کی بھی آزمائش کی ہے، لہذا ان کی آزمائش بھی کریں گے۔ صرف یہ کہ ایمان کا اظہار کرو، نمازیں پڑھو، جہاد کرو، راہ خدا میں خرچ کرو یہ کافی نہیں ہے، بلکہ ایمان کے تمام مختلف مراحل کو طے کرو۔ اور تمہارا تو ہر ہر مرحلہ پر امتحان ہوگا تاکہ اس طرح سے تمہارے ایمان کا رتبہ معلوم ہوسکے۔ خدا کی یہ سنت، اس کی دوسری تمام سنتوں پر غالب ہے۔ اور خداوند عالم کبھی بھی اس سے دستبردار نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی دن سے راہیں روشن کرکے اتمام حجت کرچکا ہے، تاکہ جو لوگ حق کی معرفت کے جویا ہیں ان کے لئے لازمی مقدمات فراہم ہوجائیں۔ لیکن جہاں تک آزمائش اور امتحان کا تعلق ہے وہ ہر حال میں ہونا ہے۔

نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۵ میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی علیہ السلام سے اس ''فتنہ'' کے بارے میں سوال کیا جو اسی آیت میں ہے کہ اس سے کونسا فتنہ مراد ہے؟ تو آپؑ نے اس سے فرمایا: ''اتفاق سے میں نے بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی فتنہ کے بارے میں سوال کیا کہ جس سے مومنین دوچار ہوں گے، تو آنحضرتؐ نے اجمالی طور پر ارشاد فرمایا: ''میرے بعد

اس امت میں کئی طرح کے فتنے رونما ہوں گے" تو میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! آپ کو یاد ہے ناں کہ جنگ احد میں بہت سے مومنین کی شہادت کے بعد میں درجہ شہادت پر فائز نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھا اور آپ کی خدمات میں اسی بات کا شکوہ بھی کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا: "اَلْبُشْرُ فَاِنَّ الشَّھَادَۃَ مِنْ وَرَآئِکَ" "تمہیں خوشخبری ہو کہ شہادت تمہارے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔" تو پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ "ہاں مجھے یاد ہے!! لیکن تم بتاؤ کہ تم کیونکر شہادت کا سامنا کرو گے اور کیسے اس پر صبر کرو گے؟" تو میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا: "یارسول اللہؐ! شہادت پر مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے نا کہ صبر ___ میں شہادت کا عاشق ہوں اور اسے حاصل کرنے کی آرزو رکھتا ہوں"

اس کے بعد پھر ایک مرتبہ حضرت امیر علیہ السلام نے حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان فتنوں اور آزمائشوں کے بارے میں سوال کیا جن سے مسلمان دوچار ہوں گے۔ تو سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میرے بعد بہت سے فتنے رونما ہوں گے، لوگ اپنے دین دار ہونے کا احسان خدا پر جتائیں گے، اس کے باوجود بھی اس کی رحمت کے منتظر ہوں گے۔ وہ دنیا کے فریب کا شکار ہوں گے اور نفسانی خواہشات کی بنا پر دین کے احکام میں تبدیلیاں پیدا کریں گے۔ "رشوت" کو "تحفے" کی صورت میں قبول کریں گے "سودی کاروبار" کو "تجارت" کا نام دیں گے۔ خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیں گے۔ اور ان کے یہ سارے کام دنیا کے ساتھ دوستی کی وجہ سے انجام پائیں گے۔ یہ فتنے میری امت میں واقع ہو کر رہیں گے اور تم بھی ان کے بعد شہادت کا جام نوش کرو گے۔"

بنابریں حضرت رسالتمآبؐ نے امت کے فتنوں اور امتحانوں کی پیش گوئی کر دی تھی اور حضرت امیر المومنینؑ بھی ان کا سامنا کرنے کے لئے خود کو تیار کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب

آپ کے لئے روئیداد سقیفہ کی خبر لائی گئی کہ کچھ لوگوں نے سقیفہ میں اکٹھے ہو کر ''جانشین پیغمبر'' انتخاب کرلیا ہے تو آپؑ نے تعجب نہیں فرمایا بلکہ اپنی پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ گفتگو کے ماجرا کو فوراً یاد کر کے ''آیہ فتنہ'' کی تلاوت شروع کردی کہ ''اَحَسِبَ النَّاسُ......''

روئیداد سقیفہ سے حاصل ہونے والی اہم عبرتناک باتیں

بہر حال مسلمانوں کی آزمائش کا یہ مرحلہ وقوع پذیر ہو گیا اور ابھی تک اس کا دھواں تمام مسلمانوں کی آنکھوں میں پہنچ پہنچ کر انہیں دکھا رہا ہے۔ ابھی اسی فتنہ و آزمائش کا سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔ جب حضرت ولی عصر عجل اللہ فرجہ ظہور فرمائیں گے تو اسے ختم کریں گے۔

اب یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کی دلدوز داستانوں کے نقل کرنے کا کیا مقصد ہے؟ آیا صرف ایسے فتنوں کے وقوع پذیر ہونے پر صرف حسرت اور نا امید کا اظہار کر کے کر کے خاموشی اختیار کر لی جائے اور ان کے افسوس ناک نتائج پر صرف اظہار افسوس کیا جائے؟ اور مولائے کائناتؑ کی مظلومی پر صرف آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر کے آہوں اور سسکیوں کا غم دل میں لے کر خون کے آنسو بہا کر خاموشی اختیار کر لی جائے؟ آیا یہی کچھ کافی ہے؟ یا نہ، ہماری ذمہ داریاں اس سے بڑھ کر ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ یہ سب کام کرنے ضروری ہیں۔ اور جن لوگوں نے اسلام اور مسلمانوں کی مصلحتوں کا مذاق اڑایا ہے ان سے قلبی طور پر ناراض ہوں، اسی طرح علی امیر المومنینؑ کی مظلومیت پر افسوس بھی کریں اور آنسو بھی بہائیں، لیکن یہ سب کچھ مقدمہ میں ان سے بالاتر مقاصد کے لئے۔ اور وہ یہ کہ ہم اسے نصیحت آموز واقعات سے سبق حاصل کر کے دور حاضر میں مسلمانوں کو پیش آنے والے مسائل کے ساتھ کیسے نمٹیں؟ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان

واقعات کا تجزیہ اور تحلیل کریں تا کہ ہمیں معلوم ہو کہ یہ واقعات کیسے رونما ہوئے؟ آیا ان فتنوں کی تعلق اوائل اسلام کے ساتھ تھا یا نہ بلکہ ایسے فتنہ انگیز واقعات ہمیں بھی درپیش آسکتے ہیں؟ آخر کیا وجہ ہے کہ تو گزشتہ اقوام کے قصے کہانیاں، حقائق اور واقعات قرآن مجید میں بار بار کیوں ذکر ہوئے ہیں؟ قرآن تو کہتا ہے کہ ان داستانوں کا تکرار عبرت حاصل کرنے کے لئے ہے۔ تا کہ ہم ہوشیار ہو جائیں اور سابقہ ادوار میں ایسے واقعات سے دوچار ہونے والوں کے اشتباہات سے سبق حاصل کریں اور خود ایسے اشتباہوں کا شکار نہ ہوں۔ بہت سے تاریخی حوادثات ہمیشہ مختلف قالبوں ڈھانچوں میں نیا رنگ اختیار کر کے دہرائے جاتے رہتے ہیں ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم ان حوادثات کی روشن تحلیل کریں اور ان سے عبرت حاصل کریں۔

جن حوادث کا ہم ذکر کر رہے ہیں اور ہماری بحث کا موضوع ہیں ان سے خصوصی طور پر عبرت حاصل کرنے کے لئے دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا سوال:

یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ لوگوں نے علیؑ سے معاندانہ سلوک کیا حالانکہ سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں زبردست سفارشیں کیں۔ لوگوں کو تاکید کی، متوجہ کیا، متنبہ کیا۔ اس کے باوجود بھی لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا؟ ہم نے جو ابھی حضرت علی علیہ السلام کے چند ایک فضائل ذکر کیے ہیں وہ سمندر میں سے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں پھر بھی ہم نے بڑی وضاحت کے ساتھ آپؑ کی امامت اور ولایت کو ثابت کیا، لیکن کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود تاریخ کا عظیم ترین سانحہ رونما ہو گیا؟

حضرت علی علیہ السلام کی ولادت کے پہلے ہی دن سے اور آپ کی خانہ کعبہ میں ولادت کی

وجہ سے دنیا والوں کو معلوم گیا کہ علی علیہ السلام عام شخصیت کے مالک نہیں ہیں بلکہ آپ کی شخصیت ہر ایک سے بالاتر اور والاتر ہے، جس پر خداوند عالم کی خاص عنایت ہے اور پھر حضرت سرکار رسالتمآبؐ نے اپنی رسالت کے 63 سال میں بارہا لوگوں مختلف مناسبتوں اور مختلف مواقع پر علیؑ کے فضائل ومناقب اور مقامات عالیہ کا تعارف کرایا۔ حتی کہ بعض اوقات تو آپؐ ان کی خلافت کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے ان بے شمار دلائل اور بے حد وحساب شواہد وقرآئن کے باوجود بھی اگر کوئی شخص حضرت رسولخداؐ کی رحلت کے بعد صحیح معنوں میں پیغمبر اسلام کے جانشین کی پہچان کا قصد اور ارادہ رکھتا تو اس کے لئے یہ ضروری مقدمات فراہم نہیں تھے اور اس کی شناخت کیلئے نا کافی تھے؟ آیا حضرت علی علیہ السلام کی خلافت وجانشینی کا مسئلہ اس قدر مخفی تھا کہ لوگوں کو از خود جانشین رسالت کے انتخاب کی ضرورت پیش آ گئی تھی؟ آخر کیا وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی اس قدر تاکید اور بار بار یاددہانیوں کے باوجود دنیا والوں نے علی علیہ السلام کی امامت کو بالکل ہی فراموش کر دیا؟ اور اسے اپنی خاطر میں بھی نہیں لائے۔

سقیفہ میں مسلمانوں کے سلوک کی جو خوش فہمی پر مبنی دلیل پیش کی جاسکتی ہے یہ ہے کہ ہم کہیں گے کہ انہوں نے داستان غدیر کو فراموش کر دیا باوجودیکہ اس کے اور رحلت پیغمبرؐ کے درمیان زیادہ عرصہ صرف ستر دن ہی گزرے تھے۔

اس عظیم ترین اور اہم ترین واقعہ کو آخر لوگوں نے اتنا جلدی کیوں بھلا دیا؟ آخر کیا وجہ ہے کہ جب حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنے حق کے حصول کے لئے احتجاج کیا اور حسنین شریفین اور جگر گوشہ رسول الثقلینؐ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہم اجمعین کو ساتھ لے کر ہر ایک مہاجر اور انصاری کے دروازے پر تشریف لے گئے اور ان سے اس بارے میں بحث بھی کی اور

احتجاج بھی کیا مگر کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہیں کر پائے، آخر کیوں؟ یہ ایک سنجیدہ سوال ہے جو عوامل اس وقت حضرت علی علیہ السلام کے لوگوں کے ہم نوا نہ بننے کے تھے شاید وہی ہمارے اندر بھی موجود ہوں اور ہم ان سے بے خبر ہوں۔ ہم اپنے اندر کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ جو اسباب حضرت علی علیہ السلام سے لوگوں کے دور ہونے کے تھے آیا وہ ہم میں بھی ہیں یا نہیں؟ رسول پاک کی لوگوں کو بار بار تاکید کے باوجود حضرت علی علیہ السلام کی اتباع سے سرپیچی اور حضور پاکؐ کی لوگوں کو بار بار تاکید ی سفارشات کی فراموشی ایک کلی مسئلہ ہے جو اس زمانے اور اس دوران کے لوگوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ لہذا ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہئے کہ آیا وہی عوامل واسباب ہمارے اندر ہمارے معاشرے میں موجود نہیں ہیں؟

دوسرا سوال: یہ ہے کہ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی روش اور اپنی زندگی کے آخری لمحات تک لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ کیسا تھا؟ آخر وہ کون سے اسباب تھے کہ کبھی تو مولا علی علیہ السلام دوسرے لوگوں کے ساتھ نہایت ہی سخت رویہ اختیار کرتے ہیں اور کبھی نہایت نرم اور ملائم رویئے کو اپناتے ہیں؟ تو ان دونوں سوالوں کا مفصل جواب اگلی گفتگو میں ملاحظہ فرمایئے۔

۷

امیر المومنین علی علیہ السلام سے مخالفت کے اسباب

سابقہ گفتگو میں ہم نے یہ سوال پیش کیا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کے اس قدر کثیر اور بے نظیر فضائل اور حضرت رسالتمآب کی ۲۳ سالہ نبوی زندگی میں ان کے بارے میں بار بار تاکید اور سفارش کے باوجود سقیفہ کا ماجرا معرض وجود میں آیا؟ اور یہ سوال نہایت ہی اہم اور بالکل بنیادی ہے کہ اس زمانے کے مسلمان خدا پرست بھی تھے، نمازی بھی تھے، روزہ دار بھی تھے، اسلام کیلئے جہاد میں شرکت کرتے رہے، جاں نثاری اور فداکاری کے جوہر بھی دکھاتے رہے، رسول کریمؐ کی رحلت کے فوراً ہی بعد حضرت علی علیہ السلام سے بالکل دور ہو گئے اور انہیں ۲۵ سال تک خانہ نشینی کی زندگی گزارنا پڑی؟ اسی طرح ۲۵ سال کے بعد خود آپؑ ہی کی خلافت کے پنج سالہ دور کو جنگوں کی نذر کر دیا گیا؟

اس سوال کا جواب اس زمانے کے تاریخی حوادث کے تفصیلی تجزیہ و تحلیل پر موقوف ہے اور اس تجزیہ میں اس بات کی طرف خاص توجہ رہے کہ معاشرتی مسائل اور روزمرہ کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھنے والے امور میں عام طور پر معاشرہ کے سرکردہ اور سربراہ لوگوں کا عوام الناس کے کردار سے مختلف ہوتا ہے عموماً ہوتا یہ ہے وہی سرکردہ لوگ امور کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، نقشے بناتے ہیں اور پروگرام ترتیب دیتے ہیں اور عوام الناس اس پر عمل درآمد کرتے ہیں، ان کی نگاہیں اپنے بڑوں پر لگی ہوتی ہیں، چنانچہ سقیفہ کے ماجرا اور امیر المومنین علیہ السلام سے مخالفت کے معاملہ میں ایسے ہی سرگروہ اور سربراہ قسم کے لوگوں کا کردار بہت اہم ہے اور اس زمانے کے مسائل کا تعلق پہلے مرحلہ میں معاشرہ کے ایسے ہی بڑے لوگوں کے ساتھ ہے۔

لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے سرکردہ اور سربراہ لوگوں نے آپؑ کی مخالفت پر کیوں کمر باندھ لی تھی؟ تو اس سوال کے جواب کیلئے ہم پانچ اہم اسباب کی طرف اشارہ کریں گے اور تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

ا: دنیا پرستی اور جاہ طلبی

اس زمانے میں ان سرکردہ اور سربراہ قسم کے لوگوں کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت فرزند ابوطالب علیہ السلام کے ساتھ دشمنی اور سرسخت مخالفت تھی اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ یا تو دنیا اور ثروت کے پیاسے تھے یا پھر جاہ و مقام کے طالب تھے وہ اس نتیجہ تک پہنچ چکے تھے کہ علیؑ کی پیروی کے ساتھ اپنے دلی مقاصد تک ان کی رسائی نہیں ہوسکتی اسی لئے انہوں نے مخالفت کی بنیاد ڈال دی جو لوگ پہلے ہی سے حضرت علی علیہ السلام کو بخوبی جانتے تھے اسی ابتدائی دن ہی سے آپؑ کے مخالفت کا سلسلہ شروع کر دیا اور کچھ لوگ ایسے تھے جو آپؑ کو پہلے سے تو نہیں پہچانتے تھے اور ان کی سوچ یہ تھی کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اپنے ناجائز مقاصد کو حاصل کرلیں گے لیکن جب انہوں نے عملی طور پر تجربہ کرلیا کہ ایسا کرنا بالکل ناممکن ہے تو پہلے تو ساتھ دیا مگر بعد میں مخالفت پر کمر بستہ ہو کر آپ کے ساتھ جنگ کی ٹھان لی۔

بنابریں اس دور کے معاشرتی سربراہوں کی علی علیہ السلام کے ساتھ دشمنی کا ایک اہم عامل دنیا پرستی اور جاہ طلبی تھی۔

۲: نفاق اور مصلحت آمیز ایمان

جنہیں ہم آغاز اسلام کے مومن اور مسلمان سمجھتے ہیں ضروری نہیں ہے کہ سارے کے سارے واقعی مؤمن یا مسلمان ہوں، اس بات کا بہترین گواہ خود قرآن مجید ہے جس میں صاف

لکھا ہے کہ: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّابِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ" کچ
لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں حالانکہ وہ حقیقت میں
مؤمن نہیں ہیں۔ (بقرہ/۸)

یہی وہ منافق لوگ تھے، قرآن میں جن کے بارے میں بہت سی آیات نازل ہوئی ہیں
یہ وہ لوگ تھے جو مسجد میں نمازیں پڑھتے تھے، روزے بھی رکھتے تھے، حج اور جہاد بھی کیا کرتے
تھے راہ خدا میں خرچ بھی کیا کرتے تھے لیکن ان کی یہ نمازیں اور باقی عبادات صرف دکھاوے
ہوتی تھیں اور ان کا کام ظاہر سازی پر مبنی ہوتا تھا ان کا ایمان یا تو مصلحت پر مبنی تھا یا پھر اپنی جا
کے ڈر سے تھا۔ ان لوگوں کی مانند جو حضرت رسول خدا کے سامنے فتح مکہ کے دن اسلام لے آ
اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں "اَنْتُمُ الطُّلَقَاء" کے لقب سے نوازا تھا ان لوگوں
کا ایمان درحقیقت ڈر کی وجہ سے تھا جبکہ کچھ لوگوں کا اسلام اس امید کے تحت تھا کہ اسلام کے ز
سایہ رہ کر اپنے ذاتی اور دلی ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے، اسلام سے پہلے ان لوگوں
کے رابطے یہودی اور عیسائی علماء کے ساتھ تھے اور انہوں نے ان سے سن رکھا تھا کہ "جزیرۃ
العرب میں ایک نبی ظاہر ہوگا جس کے کام کو عروج حاصل ہوگا" اسی وجہ سے انہوں نے خود
مسلمانوں کی صف میں زبردستی داخل کر دیا تھا تا کہ کسی دن موقعہ ملنے پر فرصت سے استفا
کرتے ہوئے اپنے ناجائز مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے ایسے افراد کی شناخت کیلئے تار
سے شواہد کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال ایسے منافقین اس گھات میں تھے کہ جونہی کوئی موقع ملے اور وہ اپنے ناپاک
منصوبوں کو عملی جامہ پہنائیں، اسی لئے سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فو
ہی بعد انہوں نے شیطانی ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوششیں شروع کر دیں اور ام

المومنین علیہ السلام کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور آپ کے خلاف مختلف سازشیں شروع کر دیں۔

۳: قبائلی جھگڑے

کچھ لوگ ایسے بھی جو ایمان لے آئے تھے، مسلمانوں میں بھی شمار ہونے لگ گئے تھے (اور آج مسلمانوں کی اکثریت ان کا بہت احترام کرتی ہے) اس کے باوجود چونکہ ان کا بنی ہاشم سے قومی اور قبائلی اختلاف تھا اور یہی اختلاف دونوں قوموں میں اور دونوں قبیلوں میں دشمنی کا سبب بن گیا اور بہت سے مواقع پر یہ اختلاف کھل کر سامنے آتا رہا اور حساس موقعوں پر رفتار اور گفتار کے اس اختلاف کی گہرائی سامنے آجاتی کہ ان لوگوں کی بنی ہاشم کے ساتھ کس حد تک دشمنی ہے، نمونہ کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے: جنگ جمل کے سرکردہ لوگوں کو تو ہم سب پہچانتے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کے مخالف تھے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس جنگ میں صرف طلحہ، زبیر اور بی بی عائشہؓ ہی نہیں تھیں اور لوگ بھی موجود تھے، آپ کو معلوم ہوگا کہ ''زبیر'' حضرت علی علیہ السلام اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی کے بیٹے تھے اور ساتھ ہی حضرت ابوبکر کے داماد بھی تھے، ان کا ایک فرزند تھا جن کا نام عبداللہ ہے یہی ''عبداللہ'' وہ شخص تھا جس کو جوانی کے ایام سے ہی بنی ہاشم کے ساتھ خاص دشمنی تھی اور وہ کھلم کھلا بنی ہاشم کو ناسزا کہتا تھا جنگ جمل کے مؤثر ترین عوامل میں اس شخص کا شمار ہوتا ہے اسی نے ہی اپنے آپ زبیر کو حضرت علی علیہ السلام سے لڑنے کیلئے آمادہ کیا، حتیٰ کہ بی بی عائشہ کے بصرہ جانے کیلئے بھی دراصل اسی نے راہیں ہموار کیں اور بصرہ کو روانہ کیا۔

بہرحال جنگ جمل کے وقوع پذیر ہونے میں عبداللہ بن زبیر کا بہت بڑا کردار ہے، یہ

شخص حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی شہادت کے وقت بھی زندہ تھا اور عہد امام حسن علیہ السلام اور شہادت امام حسین علیہ السلام کے وقت بھی قید حیات میں تھا، حتیٰ کہ اس نے یزید لعین کی ہلاکت کے بعد مکہ معظّمہ میں خلافت کا دعویٰ کر دیا اس نے جو مقدمات فراہم کئے ہوئے تھے ان کی بنا پر بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے، اس نے تمام حجاز کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور ایک عرصہ تک وہاں پر حکومت کرتا رہا۔

اب ذرا اس کی کیفیت کا تصور کیجئے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی کا نواسہ ہے، خلیفہ اول کا بھی نواسہ ہے خلیفۃ المسلمین اور جانشین پیغمبر کی حیثیت سے مکہ اور مدینہ پر حکمرانی کرتا ہے، چونکہ ساتھ ہی ساتھ ''امام المسلمین'' بھی للہذا نماز جمعہ بھی اسے ہی پڑھانا ہوتی ہے اور نماز جمعہ میں اسلامی آداب کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے جن میں سے خداوند عالم کی حمد وثنا اور پیغمبرؐ اور اولاد پیغمبرؐ پر درود وصلوات پڑھی جاتی ہے بعد میں بعض کو تقویٰ کی ہدایت کی جاتی ہے اور یہی چیزیں خطبہ کے ارکان اور واجبات میں شامل ہیں لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ کی کتابوں کے مطابق اس نے مکہ مکرمہ میں چالیس جمعہ کی نمازیں پڑھائیں اور کسی ایک میں بھی حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام زبان پر نہیں لایا، جب لوگوں نے تنگ آ کر اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ یہ کیسی رسم ہے؟ تم پیغمبرؐ کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہو اور انہی کے خلیفہ کے عنوان سے حکومت کر رہے ہو مگر کسی خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام تک زبان پر نہیں لاتے ہو آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا: ''مَا يَمْنَعُونِيْ اُصَلِّيَ عَلَيْهِ اِلَّا هُنَاكَ رِجَالًا يَشْمَخُوْنَ بِاَنْفِهِمْ'' مجھے کوئی چیز ان پر صلوات سے نہیں روکتی مگر یہاں پر کچھ ایسے بھی لوگ موجود ہیں کہ اگر میں آنحضرتؐ کا نام لوں تو وہ ناک پھلانے لگ جائیں گے۔ (شرح ابن ابی الحدید جلد۴ باب ۵۶، الصوارم المھرقۃ فی نقد الصواعق

الــمــحــرقة ص ۷۹)نوٹ: البتہ عبداللہ کی زبانی جو عربی عبارت اوپر نقل ہوئی ہے وہ ان دونوں کتابوں سے قدرے مختلف ہے۔

بہر حال آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ وہ کہہ رہا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لینے سے کچھ لوگ ناک پھُلانے لگ جائیں گے یعنی وہ اکڑنے لگ جائیں گے اور ان لوگوں سے اس کی مراد بنی ہاشم کے افراد تھے اور وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ جب میں آنحضرت کا نام لوں گا تو وہ پھولنے لگ جائیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے قبیلہ سے تھے، چونکہ آنحضرتؐ کا نام سننے سے بنی ہاشم اکڑنے اور پھولنے لگ جاتے ہیں یہی بات مانع ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کا نام کسی خطبہ میں لے آؤں، مجھے ایسی کوئی بات نہیں کہنی چاہئے جس سے بنو ہاشم خوش ہوں۔

اب آپ تصور کیجئے کہ دشمنی کس حد تک گہری ہے! اس قدر گہری ہے کہ حتیٰ کہ ظاہر داری کے طور پر ہی سہی حضورؐ کا نام نامی اسم گرامی زبان پر لانا صحیح نہیں سمجھا جاتا، اس سے آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ علیؑ کے ساتھ اس کی دشمنی کس قدر گہری ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف علیؑ کا نام ہی نہیں لیتا بلکہ (نعوذ باللہ) ان پر لعنت بھی کرتا ہے، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ بانی اسلام تھے اور وہ ان کی جانشینی کے عنوان سے لوگوں پر حکومت کر رہا تھا لیکن ان کا نام خطبوں میں اس لئے نہیں لیتا تا کہ ان کی قوم کے افراد کو ان کے نام سے خوشی حاصل نہ ہو، علی علیہ السلام کے نام کے ساتھ اس نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا؟۔

یہ باتیں نہ افسانہ ہیں اور نہ ہی مذاق بلکہ تاریخی حقائق ہیں یہ ٹھیک ہے کہ صرف ایک شخص کے دل میں اس طرح کی دشمنی تھی، لیکن یہی ایک فرد اس بات کا سبب بنا کہ پوری ایک امت سعادت سے محروم ہوگئی پاکیزہ خون بے گناہ بہائے گئے اور اسلامی امہ کے مفادات کو

اس قدر دھچکا لگا کہ وہ ہزاروں سال پیچھے چلی گئی۔

۴: بغض اور حسد

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: ''وَاللّٰهِ مَاتَنقِمُ مِنَا قُرَيْشٌ اِلَّا اَنَّ اللّٰهَ اِخْتَارَنَا'' خدا کی قسم! ہم (بنی ہاشم) سے قریش کے دوسرے قبائل کی مخالفت کی کوئی پہل نہیں ہے سوائے حسد کے، کیونکہ خداوند عالم نے ہمیں دوسرے تمام عربوں پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام ائمہ علیہم السلام کا تعلق خاندان بنو ہاشم سے ہے۔ قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے: ''اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَتَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيْمًا'' آیا لوگ اس وجہ سے ان سے حسد کرتے ہیں کہ خدا نے انہیں اپنا خاص فضل عطا فرمایا ہے در حقیقت ہم نے آل ابراہیمؑ کو کتاب اور حکمت دی اور انہیں ایک بہت بڑے ملک سے نوازا۔ (نساء/۵۴)

جس شخص میں جس قسم کی لیاقت تھی ہم نے اسے وہی کچھ دیا، اسی قاعدہ کی بنیاد پر ہم نے آل ابراہیم علیہ السلام کو کتاب، حکمت اور نبوت عطا کی تو کیا دوسرے لوگ ان سے اس لئے دشمنی کریں کہ ہم نے انہیں یہ سب کچھ کیوں دیا اور انہیں کیوں نہیں دیا؟ یہ تو ان کی لیاقت اور شائستگی تھی کہ ہم نے انہیں یہ چیزیں عطا فرمائیں ہیں اور ''اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ'' خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کس خاندان اور کس شخص میں قرار دے! (انعام/۱۲۴) لیکن جو لوگ حسد کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ان چیزوں کو نہیں سمجھتے اور جب یہ شیطانی احساس کسی کے اندر پیدا ہو جاتا ہے تو وہ تمام خوبیوں کو برائی کی صورت میں پیش کرتا ہے اس کی نگاہوں میں

ہر حسن عیب ہوتا ہے اور ہر زیبائی بدصورتی میں جلوہ گر ہوتی ہے حاسد شخص تو اس حد تک تیار ہو جاتا ہے کہ اپنی جان تک کو ہلاک کر دے تا کہ صاحب نعمت اس سے محروم ہو جائے یا اسے کسی قسم کا نقصان پہنچے! یہی ''حضرت عبداللہ'' تھے کہ جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے جنگ جمل میں چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے ''اُقْتُلُونِی وَمَالِكًا مَعًا'' مجھے اور مالک کو باہم قتل کر دو۔ یعنی میری جان جانے سے مالک (بن اشتر) کی جان جاتی ہے تو آؤ مجھے قتل کر دو میں اس بات کیلئے حاضر ہوں کہ مارا جاؤں بشرطیکہ مالک کو بھی میرے ساتھ قتل کر دیا جائے یہ ہے نامراد حسد کا انجام!!۔

بنا بریں حضرت علی علیہ السلام اور ان کے خواص بلکہ بطور کلی تمام اہل بیت رسالتؑ سے لوگوں کی مخالفت کے جو اسباب تھے ان میں سے ایک عامل ''حسد'' بھی تھا۔

اس زمانے میں جو لوگ فقط مال و دولت اور جاہ و مقام اور دنیاوی لذائذ کے ذریعہ ہی خود کو پہچانتے تھے جن کی جنگ اور صلح صرف انہی چیزوں کی وجہ سے ہوتی تھی گویا جن کا تمام مطمع نظر یہی چیزیں تھیں وہ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی سوچتے تھے کہ وہ بھی دنیا اور حکومت کیلئے جیتے اور مرتے ہیں، اسی لئے وہ کہا کرتے تھے کہ: ''علیؑ نے یہ جو جنگیں چھیڑ رکھی ہیں کبھی جمل والوں کے ساتھ لڑتے ہیں تو کبھی صفین اور نہروان والوں کے ساتھ، یہ تو سب کچھ حصول دنیا کیلئے ہے، حتیٰ کہ خود جناب امیر علیہ السلام کو اس بارے میں کہنا پڑا: ''فَاِنْ اَقُلْ یَقُولُوا حَرَصَ عَلَى الْمُلْكِ وَاِنْ اَسْكُتْ یَقُولُوا جَزِعَ مِنَ الْمَوْتِ'' اگر کچھ بولتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ خلافت کا حریص ہے اور اگر خاموش رہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ موت سے ڈرتا ہے۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۵)

آج بھی ہم اپنے سماج میں دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کی ہر قسم کی رفتار و گفتار کو غلط نظریہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں ''دین

کے نام سے دنیا طلبی'' کی تہمت سے نوازتے ہیں ان کا یہ نظریہ اس وجہ سے ہے کہ وہ خود دنیا داری، حکومت طلبی اور جاہ و مقام پرستی کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتے وہ اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ کوئی شخص خدا کی رضا کیلئے اور اپنے شرعی فریضہ کی ادائیگی کی خاطر کوئی نصیحت آمیز بات کرر ہا ہے۔ وہ فوراً یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ مال و دولت کی خاطر یہ بات کر رہا ہے یا پھر کسی مقام و منصب کا خواہاں ہے لہٰذا جو شخص بھی دنیا کی کوئی بات بھی کرتا ہے تو فوراً اسے اس تہمت سے متہم کرتے ہیں کہ دین کی آڑ میں دنیا کما رہا ہے ایسا وہ لوگ کہتے ہیں جو جو اس بات کیلئے حاضر ہوتے ہیں کہ چاہے خود ہلاک ہو جائیں لیکن مالک اشتر جیسے انسان بھی زندہ نہ رہیں، یہی لوگ صرف حکومت، دولت دنیا اور جاہ و مقام کو ہی پہچانتے ہیں اور بس!۔

بہر حال حسد بری بلا ہے اس سے ہر حالت میں ہوشیار رہنا چاہئے اور معلوم ہونا چاہئے کہ حسد اگر چہ کسی ایک شخص کے دل میں ہوتا ہے لیکن اسی ایک شخص کا حسد پوری امت یا پوری قوم کو آگ کے شعلوں میں جھونک سکتا ہے، یہ تجربہ ایک مرتبہ تو حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں عمل میں آیا لیکن اس کے بعد بارہا دہرایا جانے لگا۔

عبداللہ بن زبیر ایک شخص تھا نا کہ ایک لاکھ، اس ایک کے دل میں حسد تھا نا کہ لاکھوں لوگوں کے دلوں میں لیکن اس ایک شخص کا حسد کن کن آفات و مصائب و موجب نہیں بنا؟ اگر اس وقت کسی کا حسد کسی فساد کا موجب نہیں بنتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی کسی حد تک رسائی ہو پاتی، یہ تو آستین کا سانپ ہے جب بھی اسے موقع ملا فوراً اپنا زہر انڈیل دے گا۔ تمام لوگوں کو خاص کر جوانوں اور نوجوانوں کو اس سے خبردار رہنا چاہئے جو ابھی زندگی کی ابتدائی منزلوں میں ہیں اور

اخلاقی آفات میں بہت کم مبتلا ہیں انہیں اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ اس نہایت ہی خطرناک رذالت سے زیادہ سے زیادہ دور رہیں۔

یقین جانئے حسد ایک خطرناک آفت ہے جو نہ صرف خود انسان کے اپنے لئے مضر ہے بلکہ اس کے ایمان کو بھی برباد کر کے رکھ دیتی ہے اور ایسی ایسی معاشرتی مصیبتیں معرض وجود میں لے آتی ہے جن سے قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم یہ بات نہ بھی کہیں کہ جنگ جمل کے معرض وجود میں آجانے کا بہت بڑا عامل عبداللہ بن زبیر کا حسد تھا، کم از کم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بزرگ ترین عوامل میں سے ایک تھا۔

۵: جذبہ انتقام اور کینہ

حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ لوگوں کی دشمنی کا ایک اور اہم عامل کینہ اور جذبہ انتقام تھا، اسلام ابھی تازہ تازہ ترقی کر رہا تھا اور اسلامی معاشرے کی بنیاد مدینہ میں رکھی گئی تھی تو اس وقت مسلمان افرادی قوت کے لحاظ سے بھی اور مالی طاقت کے لحاظ سے بھی نہایت ہی کمزور حالت میں تھے اور ایسے ہی حالات میں جنگ بدر شروع ہوگئی ادھر کفار و مشرکین کے مورچوں میں شجاعات عرب، طاقتور ترین پہلوان اور قریش کے صنادید شریک تھے جبکہ ادھر مسلمانوں کی صفوں میں چند ایک غریب، افلاس زدہ اور بے یار و مددگار مسلمان تھے، جن کی نہ تو تعداد اس قدر تھی کہ اسے اہمیت دی جاتی اور نہ ہی جنگی وسائل اس قدر زیادہ تھے جس سے دشمن کچھ سوچنے پر مجبور ہوتا۔

اس جنگ میں امیر المومنین علی علیہ السلام نے خوب داد شجاعت دی، اپنی بہادری کے پورے جوہر دکھائے صرف اکیلے علی علیہ السلام نے ہی دشمن کے چھکے چھڑا دیئے اور دشمن کی قابل

توجہ تعداد کو موت کے گھاٹ اتارا، بڑے نامی گرامی پہلوانوں کو قتل کیا، جن میں معاویہ کے خاندان کے تین افراد بھی تھے اور وہ تینوں حنظلہ بن ابی سفیان (معاویہ کا بھائی) ولید (معاویہ کا ماموں) اور عتبہ (معاویہ کا نانا) ہیں جس شخص کے تین قریبی رشتہ دار ایک ہی جنگ میں علی علیہ السلام کے ہاتھوں مارے جائیں تو کیا وہ علی بن ابی طالب علیہم السلام کی حکومت کو خوشی سے قبول کر لے گا؟ اور ان کی برضا ورغبت اطاعت کرے گا؟ مگر یہ کہ اس کا ایمان نہایت قوی ہو اور جنگ کے حساب کو ایمان اور کفر کے میزان میں پرکھے اور اس کا یہ نظریہ ہو کہ کفار مارے گئے اور اسلام کامیاب ہوا، لیکن اس قسم کا ایمان معاویہ جیسے لوگوں کے دل میں پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس قسم کا ایمان علی علیہ السلام جیسی شخصیتوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں: ''وَلَقَدْ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نقتل آ بائَنَا وَاَبْنَائَنَا وَاِخْوَانَنَا وَاَعْمَامَنا'' ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں جنگ کرتے رہے اور باپ داداؤں، بیٹوں، بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کرتے تھے (نہج البلاغہ خطبہ ۵۵) ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے مقابلے میں کون ہے؟ بلکہ قرآن کریم کی منطق کی پیروی کرتے ہوئے چونکہ وہ کفر کے مورچوں میں تھے لہٰذا ہم ان کے ساتھ جنگ کیا کرتے تھے چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے: ''قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَائُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ وَتَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبُّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ'' کہہ دیجئے! تمہارے آباء، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارے وہ اموال جو تم کماتے ہو اور تمہاری تجارت جس کے بند ہو جانے کا تمہیں خوف ہے اور تمہاری پسند کی رہائش گاہیں، اگر تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور راہ خدا میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو پھر انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے

(توبہ/۲۴) مسلمان کیلئے خدا کے مقابلے کسی اور چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے چاہے ماں باپ ہوں اولاد ہو یا شریک زندگی خواہ کوئی بھی شخصیت ہو، جب یہ کافر ہوں اور خدا کے دشمن ہوں تو ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔

لیکن معاویہ کا ایمان اس قدر پختہ نہیں تھا، ایک ہی جنگ اس کے نانا، ماموں اور بھائی کے علی کے ہاتھوں مارے جانے کا کینہ اس کے دل سے نہیں نکلا تھا، یہ کیفیت صرف معاویہ کی ہی نہیں تھی بلکہ اس جیسے اور بھی بہت سے لوگ تھے، ایسے لوگ کہ جن کے قریبی رشتہ دار مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں مختلف جنگوں میں مارے گئے تھے، اسی بنا پر خود حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: ''اَلَا اِنَّهَا اِحَنٌ بَدرِيَّةٌ وَ ضَغَائِنُ اُحُدِيَّةٌ وَ اَحْقَادُ جَاهِلِيَّةٌ'' یہ جو لوگ میرے ساتھ جنگ کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سینوں میں میرے بارے بدر، خیبر حنین اور احد کے کینے نیز زمانہ جاہیت کی کدورتیں ہیں (بحار الانوار جلد ۲۳ باب ۱۲ روایت ۲۷۴) اور ہم عموماً دعائے ندبہ میں میں پڑھتے ہیں کہ: ''اَحْقَادُ بَدرِيَّةٌ وَ خَيْبَرِيَّةٌ وَ حُنَيْنِيَّةٌ وَ غَيْرَهُنَّ فَاَضَبَّتْ عَلٰى عَدَاوَتِهِ وَ اَكَبَّتْ عَلٰى مُنَابَذَتِهِ'' یہ سب بدر، خیبر، احد اور حنین وغیرہ کے کینے تھے جنہوں نے لوگوں کو علی علیہ السلام کی دشمنی پر اکسایا اور مقابلے پر آمادہ کیا اگر چہ یہ سب کینے ایک شخص کے دل میں تھے لیکن سب نے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ایکا کر لیا کہ علی علیہ السلام کو حکومت نہیں کرنے دیں گے۔

اسلام میں دوستی اور دشمنی کا معیار

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے نکتے کی طرف اشارہ کریں جو نہایت ہی اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کی دوستی اور دشمنی کا معیار فقط اور فقط خدا، دین اور ایمان ہو

اسی معیار کی بنا پر آج کے دور میں ہم ان لوگوں کے ساتھ دوستی رکھیں جو اسلام کے مطابق اور اسلامی نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں، چاہے وہ کوئی بھی ہوں، ہم ان کی حمایت کریں اور انہیں خود اپنی جان کی طرح دوست رکھیں اور جو اسلامی نظام کے مخالف ہیں، اس کی نیستی و نابودی کے درپے ہیں، اس کے خلاف ہر وقت سازشوں میں لگے رہتے ہیں ان سے اپنی دشمنی کا اظہار کریں، ان کی ڈٹ کر مخالفت کریں جو لوگ اسلامی احکام کے اجرا کو نہیں چاہتے اور کھلے بندوں کہتے ہیں کہ ہم تو سیکولرازم کے حامی ہیں اور دین کو سیاست سے جدا سمجھتے ہیں، دین کو اپنی روزمرہ کی زندگی کے معمولات سے نکال چکے ہیں، ایسے لوگوں کی مخالفت ضروری ہے۔

بہر حال اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلام ہو تو ہمیں اپنی دوستی اور دشمنی کا معیار کو خدا کی ذات کو قرار دینا ہوگا، اس بارے میں ہر شخص کو اپنے دل کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور دیکھنا ہوگا کہ جسے وہ دوست بنا رہا ہے آیا وہ مومن اور خدا پرست ہے یا صرف ذاتی مفادات اور پارٹی کی بنیاد پر دوستی کی جارہی ہے؟ یا اس لئے دوستی کی جارہی ہے کہ وہ میری خواہش اور مرضی کے مطابق چلتا ہے یا نہ بلکہ اس کے سامنے احکام اسلام کا اجراء اور دین کی سربلندی اور سرفرازی ہے؟۔

علی علیہ السلام کی مخالفت کے دو اصلی عوامل

ایک کلی تجزیہ و تحلیل کے نتیجہ میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ مخالفت کے اصل اسباب دو چیزیں ہیں ایک تو ہے دنیا کے ساتھ محبت، جس میں سب سے پہلے مال اور حکومت کی محبت ہے، البتہ اس عامل کی شدت تمام لوگوں میں ایک جیسی نہیں ہوتی، بعض افراد میں دوسروں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے، جیسا کہ ہم ابتدائے بحث میں بتا چکے ہیں کہ ہر معاشرے میں محدودے چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو معاشرہ کے سرغنہ اور برجستہ لوگوں کا کردار

ادا کرتے ہیں، سیاسی اور سماجی اصطلاح میں انہیں سر کردہ، سر براہ اور برجستہ افراد کہا جاتا ہے اگر چہ عام طور پر معاشرتی سرگرمیوں کو عوام اور ملت کی طرف نسبت دی جاتی ہے، لیکن اگر امور کے انجام پانے کا طریقہ کار غور سے دیکھا جائے تو یہ نتیجہ حاصل ہوگا کہ ان تمام امور کی بازگشت دراصل ان محدودے چند افراد کی طرف ہوتی ہے جن کے بارے میں ابھی بتایا جا چکا ہے۔

اس منش کے لوگ عام طور پر معمول سے زیادہ ہوش و ذکاء کے مالک ہوتے ہیں، خلاقیت اور منصوبہ بندی کے لحاظ سے مہارت تامہ رکھتے ہیں ان ہی لوگوں میں۔جن کی تعداد کبھی کم نہیں رہی۔وہ بھی ہیں جو کسی اصول اور قاعدہ کے پابند نہیں ان میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن بڑی حد تک پایا جاتا ہے وہ ہر قسم کے لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرنے کا بھی فن جانتے ہیں اور ہر مکتب و مسلک اور ہر نوع مقصد کے حامل افراد کو خواہ وہ الٰہی مقاصد رکھتے ہوں یا شیطانی اپنے گرد جمع کر کے انہیں مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

اسلام کے ابتدائی دور میں بھی حالات اسی طرح کے تھے کہ محدود قسم کے افراد حوادث کو وجود میں لانے کی منصوبہ بندی کیا کرتے تھے اور ان حوادث کا اصل کردار وہی ہوتے تھے اور عوام الناس کی اکثریت اپنے خاص مرام و مقاصد کی وجہ سے آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی میں جُڑ جاتی اور یہ وڈیرے اور سردار قسم کے لوگ عام طور پر یا تو مال و دولت کے بھوکے ہوتے ہیں یا پھر مقام و منصب کے لالچی۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ مال و دولت اور جاہ و مقام کے دلدادہ لوگوں میں سے جو لوگ جاہ و مقام یا عہدہ حکومت کے عاشق ہوتے ہیں ان کی فکری سطح مال و دولت کے دلدادہ سے زیادہ بلند ہوتی ہے، کیونکہ مال و دولت کی خواہش ہر شخص کو ہوتی ہے اور یہ تو واضح سی بات ہے کہ مال و دولت کے ذریعہ عیاشی کے وسائل مہیا کر کے خواہشات نفسانی کی بہتر طریقے سے تکمیل کی

جا سکتی ہے اسی لئے ہر شخص زر و دولت کا طلبگار رہتا ہے اور ایسے لوگوں کے درمیان کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو دکھاوے کیلئے زاہدانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور سادگی سے رہتے ہیں حتیٰ کہ اگر ان کے پاس مال و دولت آجائے تو وہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور زندگی کو بھی ترک کر دیتے ہیں اس سے ان کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ اس طرح سے کسی مقام منصب کو حاصل کریں اور لوگوں کے دلوں میں اپنی محبوبیت پیدا کریں۔

حتیٰ کہ کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو حکومت اور منصب کیلئے سارا سرمایہ خرچ کر ڈالتے ہیں اور عہدہ حکومت میں جانے کے بعد بھی خرچ شدہ رقم کو واپس لینے کی نہیں سوچتے ان کیلئے حکومت کی سربراہی، جاہ و مقام اور عہدہ و منصب کافی ہوتا ہے، اصول کی بات ہے کہ حکومت و منصب کا عشق، روپے پیسے کے عشق سے کہیں بڑھ کر ہے۔

بہر حال حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے ساتھ مخالفت، بلکہ تمام تاریخ میں مطلقاً حق کے ساتھ مخالفت کا اصلی عامل دنیا سے محبت، مال سے محبت اور حکومت سے محبت، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں پر اس بارے میں چند شواہد پیش کریں تا کہ ہماری بحث صرف دعووں اور ذہنی تحلیل پر ہی مبنی نہ ہو۔

حضرت امیر علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں جو خطبہ ''شقشقیہ'' کے نام سے مشہور ہے اور نہج البلاغہ کا تیسرا خطبہ ہے، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جو کارستانیاں کی گئیں اور آپ علیہ السلام پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے گلے شکوے کے ضمن میں فرماتے ہیں: ''فَصَبَرْتُ وَفِي الْعَيْنِ قَذًى وَفِي الْحَلْقِ شَجًى ''میں نے ان تمام مصیبتوں پر اس انداز میں صبر کیا کہ گویا آنکھوں میں کانٹے اور حلق میں ہڈی اٹکی ہوئی ہو۔ حضرت علیہ السلام اپنی فرمائشات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جب تمام لوگوں نے میری بیعت کر لی تو کچھ لوگوں

نے بیعت کو توڑ ڈالا اور مجھ سے مخالفت اور میرے ساتھ جنگ کی ٹھان لی، آیا ان لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کو نہیں سنا کہ: ''تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ'' ہم اس سرائے آخرت کو ان لوگوں کیلئے قرار دیں گے جو زمین میں نہ تو برتری کے خواہاں ہیں اور نہ ہی فساد کے اور (نیک) انجام تو پرہیز گاروں ہی کا ہے۔ (قصص/۸۳)

اس کے بعد خود آپ علیہ السلام ہی جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''بَلٰى وَاللّٰهِ سَمِعُوهَا وَوَعَوْهَا وَلٰكِنَّهُمْ حَلِيَتِ الدُّنْيَا فِي أَعْيُنِهِمْ وَرَاقَهُمْ زِبْرِجُهَا'' یقیناً انہوں نے اس آیت کو بخوبی سنا بھی ہے اور اسے درک بھی کیا ہے، اس کے معانی کو بھی اچھی طرح سمجھا ہے اور حجت ان پر مکمل ہوگئی ہے لیکن کیا کیا جائے، دنیا ان کی آنکھوں میں خوبصورت بن کر جلوہ گر ہوئی اور دنیا کے زیورات اور حسن نے انہیں فریب میں پھنسالیا۔

مولا علی علیہ السلام- بلکہ حق کے تمام- مخالفین کی اصلی مشکل کو دنیا کی محبت اور اس سے دل بستگی میں تلاش کیا جا سکتا ہے، البتہ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس بات کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ انسان ہر اس چیز کے ساتھ دشمنی رکھے جو دنیا میں ہے اور خداوند عالم کی نعمتوں کی نعمتوں سے کسی قسم کا استفادہ نہ کرے ایسا ہرگز نہیں ہے کیونکہ دنیا کے ساتھ دل لگا لینا اور بات ہے اور الٰہی نعمتوں سے مناسب استفادہ کرنا اور بات ہے دنیا اور اس کی نعمتوں اور لذتوں سے استفادہ ہمیشہ اور ہر جگہ مذموم اور قابل نکوہش نہیں ہے بلکہ بعض مقامات پر واجب یا مستحب بھی ہوتا ہے دنیوی نعمتوں سے استفادہ کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ''دنیا کے ساتھ محبت'' ہوگئی ہے۔

انسان اپنی طبیعت کے مطابق لذت رکھنے والے امور سے محبت کرتا ہے اسی لئے دنیا اور اس کی نعمتوں سے لذت اٹھانا قابل مذمت نہیں ہے جو چیز قابل مذمت ہے وہ یہ کہ دنیوی

امور سے دل کا لٹکا دیا جائے اور وہ بھی اس طرح سے کہ اسے اس سے جدا کرنا مشکل ہو، اگر کسی موقع پر ایسا اتفاق ہو جائے کہ ایک طرف شرعی فریضے کی ادائیگی لازم ہو اور دوسری طرف دنیا کی لذتیں ہوں تو شرعی فریضے کو دنیا کی لذتوں پر قربان کر دینے کا نام دنیا سے دل بستگی اور اس پر فریفتگی ہے اور یہی چیز مذموم ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے سلسلے میں ''ناکثین'' ان لوگوں کا نمونہ ہیں جن کیلئے دنیا کی محبت اس بات کا سبب بن گئی کہ حق کو فراموش کر دیں اور آپ علیہ السلام کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائیں اور ان میں سے تین لوگ سب سے نمایاں ہیں کہ جن کے ذریعہ جنگ کی آگ بھڑکائی گئی۔

ایک تو حضرت ''زبیر'' ہیں جو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے پھوپھی زادے اور حضرت ابو بکر کے داماد ہیں، دوسری حضرت ''عائشہ'' ہیں جنہیں پیغمبر گرامی قدر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت کا شرف حاصل ہے اور تیسرے حضرت ''طلحہ'' ہیں جو حضرت عائشہ کے پھوپھی زادے ہیں۔

حضرت زبیر کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ابتدا میں حضرت ابو بکر کی بیعت نہیں کی اور چاہتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کریں مگر ''کچھ مجبوریاں'' آڑے آگئیں جن کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت سے باز رہے باوجودیکہ حضرت علی علیہ السلام کے پھوپھی زادہ تھے لیکن ادھر حضرت ابو بکر کے داماد بھی تو تھے نا، زمانہ رسالت مآب میں جنگوں میں شرکت کرتے رہے اور بہادری کے ''جوہر'' بھی دکھاتے رہے خلافت سوم کے بعد یہی زبیر اور طلحہ حضرت علی علیہ السلام کی سب سے پہلے بیعت کرنے والے تھے، انہوں نے آپ علیہ السلام کی بیعت کرنے کے بعد اپنے دو مطالبے حضرت کے پیش کر دیئے:

ا۔ بیت المال میں سے ان کا وہی حصہ مقرر کیا جائے جو حضرت عمر نے مقرر فرمایا تھا۔

معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت عمر نے مسلمانوں کے درمیان بیت المال کی تقسیم کیلئے ایک خصوصی طبقہ بندی مقرر کر رکھی تھی مہاجرین اولین اور دوسری معروف شخصیتوں کا دوسروں سے زیادہ حصہ مقرر کیا ہوا تھا، جبکہ معاشرے کے دوسرے درجہ کے اور معروف قسم کے لوگ تھے ان کو بہت کم حصہ ملتا کرتا تھا۔

جبکہ مولائے کائنات علی بن ابی طالب علیہم السلام ابتدا ہی سے اس تفریق کے مخالف تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ: ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت المال کو مسلمانوں کے درمیان بطور مساوی تقسیم فرمایا کرتے تھے'' اسی طرح جب لوگ پہلے پہل آپ کی بیعت کرنے لگے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''میں تمہاری بیعت اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق سلوک کروں گا''۔

طلحہ اور زبیر نے امیر المومنین علی علیہ السلام کی بیعت کے بعد آپ کی خدمت میں عرض کیا: ''ہم مومنین سابقین میں سے ہیں اور رسول پاکؐ کے ساتھ ہماری قریبی رشتہ داری ہے، ساتھ ہی ہم نے اسلام کے شایان شان خدمات انجام دی ہیں لہٰذا جس طرح خلیفہ ثانی بیت المال کی تقسیم سے ہمیں خصوصی حصہ دیا کرتے تھے آپ بھی اسے برقرار رکھیں''۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا: ''تم پہلے ایمان لائے ہو یا میں؟'' انہوں نے کہا: ''یقیناً آپ!'' پھر پوچھا: ''تم پیغمبر کے زیادہ قریب رشتہ دار ہو یا میں؟'' کہا: ''آپ!'' امام علیہ السلام نے فرمایا: ''بیت المال سے میرا بھی وہی حصہ ہے جو دوسرے مسلمانوں کا لہٰذا میں تمہیں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا میں تو سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کروں گا، عمر کی طبقہ بندی مجھے قبول نہیں کیونکہ یہ شریعت کے خلاف اور بدعت ہے''۔

۲۔ ان لوگوں کی دوسری درخواست یہ تھی کہ: ''عراق کی حکومت زبیر کو اور یمن کی حکومت طلحہ کو دی جائے'' امیر المومنین علی علیہ السلام نے ان کی اس درخواست کے بارے میں فرمایا: ''اس بارے میں مجھے غور و فکر کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ مصلحت کا کیا تقاضا ہے، جو زیادہ صلاحیت رکھتا ہوگا اسے مقرر کروں گا''۔

امیر المومنین علیہ السلام کے ان دو جوابات کے ساتھ ہیں وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ آپ کے ساتھ ساز باز ناممکن ہے، اسی لئے انہوں نے ''جنگ جمل'' کی بنیاد رکھی جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ ''جمل والوں'' کا اصل مقصد مسلمانوں کے بیت المال سے اضافی حصہ اور ریاست کی حکمرانی - البتہ یہ بات ہمارے لئے یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ ان کی ریاست طلبی کی یہ ہوس زیادہ سے زیادہ مال کیلئے تھی یا بذات خود یہ مقام اور ریاست ہی ان کیلئے مطلوب و مرغوب چیز تھی لیکن یہاں پر جو چیز نہایت ہی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ان کا امیر المومنین علی علیہ السلام سے اس قسم کا مطالبہ اس لئے تھا کہ آپ علیہ السلام ان لوگوں کی دنیا کے بدلے اپنے دین سے دستبردار ہو جائیں کس قدر زعم باطل!! علی علیہ السلام جو خود اپنی ذات کیلئے ذرہ برابر دنیا و ریاست و حکومت کی فکر میں نہیں کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ وہ دوسروں کی دنیا کیلئے اپنے دین کی قربانی دیدیں؟ اس شخص کا حال نہایت ہی برا ہوتا ہے جو اپنا دین اس لئے ضائع کردے تاکہ دوسرا شخص لذت کام و دین کا سامان فراہم کرے۔

• بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے دین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کسی گناہ کا اس لئے مرتکب ہوتا ہے کہ وہ کسی لذت سے بہرہ اندوز ہو، یہ کام حماقت ہے جہالت ہے، نادانی ہے اور بے وقوفی ہے جس کسی کے ایمان کی کمزوری پر دلالت کرتی ہے لیکن اس بڑھ کر جہالت، حماقت نادانی اور بے وقوفی یہ ہے کہ اپنے دین کو دوسروں کی ہوا و ہوس اور دنیا پر قربان کردیا جائے

"بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان کو" زندہ باد" یا" مردہ باد" کہتا ہے تا کہ اس طرح سے دوسرے لوگوں کا مال اور مقام حاصل ہو۔ جس طرح سیاست دانوں کے جلوس نکلتے ہیں اور سبک سر لوگ ان کی موافقت یا مخالفت میں زندہ باد یا مردہ باد کے نعرے لگاتے ہیں (از مترجم)" حق کو ناحق اور ناحق کو حق میں تبدیل کر دیں، مسلمانوں کے بیت المال کو فضول خرچیوں اور ذاتی انا کی تسکین میں خرچ کر دیں، حق داروں کے حق کو نظر انداز کر دیں اور احکام خداوندی کو معطل کر دیں۔

اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ انسان دوسروں کی ناجائز خواہشات کی تکمیل کیلئے اپنی آخرت کو قربان کر دے، تاریخ عالم پر نگاہ دوڑائیں۔ بلکہ آج کل اپنے اطراف پر نظر دوڑائیں۔ آپ کو اس قسم کے لوگوں کی تلاش میں مشکل پیش نہیں آئے گی بلکہ "ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں" کے مصداق ہر دور میں اور ہر طرف میں آپ کو ایسے لوگ آسانی سے مل جائیں گے

آیا ہم تو ایسے نہیں ہیں؟ آیا ہم کسی سیاست دان کی دنیا سنوارنے اور اسے مسند اقتدار تک لانے میں تو اپنے دین کو نہیں بیچ رہے؟ بلکہ مفت میں رائیگاں تو نہیں کر رہے؟ دین ہم ضائع کر رہے ہوں اور عیاشیاں دوسے دوسرے کر رہے ہوں م کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ جب لوگ ہماری آراء سے منتخب ہو کر ایوان اقتدار میں پہنچ جاتے ہیں اس وقت دونوں ہاتھوں سے ملک کی دولت کو تو وہ لوٹ رہے ہوتے ہیں اور اس کا گناہ ہمارے کھاتے میں لکھا جاتا ہے اور ہمارا دین داغدار ہوتا رہتا ہے اور ہماری آخرت برباد ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ ہم ہی ہوتے ہیں جو اسے اس منزل تک پہنچاتے ہیں، دنیا اس نے کمائی دین ہمارا برباد ہو گیا۔ (از مترجم)

بہر حال یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ قوم کے برجستہ اور سرکردہ قسم کے لوگوں کی مخالفت کا اصل عنصر" دنیا کی محبت" کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اور دنیا کی محبت

کے پہلے مرحلہ میں مال و مقام سے خصوصی تعلق تھا، طلحہ اور زبیر اس زمانے میں اسلامی اُمہ کے سر کردہ اور برجستہ قسم کے لوگوں میں سے تھے ان سرکردگی اور برجستگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں حضرات انتخاب خلیفہ کیلیے حضرت عمر کی تشکیل کردہ اس چھ رکنی کمیٹی کے رکن بھی تھے جس کے ایک رکن حضرت علی علیہ السلام تھے، اس طرح سے اس دور میں یہ دونوں حضرات، امیر المومنین علی علیہ السلام کے ہم پلہ شمار کیے جاتے تھے، لیکن افسوس کہ سالہا سال تک اسلام کیلیے جہاد اور فداکاری اور مسلمانوں کی اس قدر خدمت کے بعد ان کا انجام یہ ہوا کہ مال و حکومت کی محبت میں علی علیہ السلام جیسی عظیم ہستی کی مخالفت اور جنگ پر کمر بستہ ہو گئے۔

مال و دولت اور حکومت و ریاست سے دل بستگی انسان کی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے، اگر انسان مال جمع کرے لیکن اس کے اہل تک اسے نہ پہنچائے تو یہ مال پرستی ہے اور اگر کوئی شخص کسی عہدے اور منصب کا اہل نہیں لیکن اس پر براجمان ہو جائے اور اسے اس کے اہل تک نہ پہنچائے تو عہدے اور منصب کی محبت اس کے دل میں راسخ ہو چکی ہے ایسا انسان اسلامی امہ کی مصلحت کو اپنے ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھاتا ہے اور خطا کا مرتکب ہوتا ہے البتہ ایک طرح سے انسان، مال و مقام سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے بھائی بندوں کی خدمت کرتا ہے اور مال ا منصب کو خدمت کا ایک وسیلہ سمجھتا ہے تو اس کا یہ کام عبادت ہوگا اگر ایسا ہو تو مال کا حصول بھی ممدوح و مطلوب ہے اور منصب کا بھی ان سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

○ ایک نکتہ ○

اس بات کو کبھی دل سے نہ نکالیں کہ سنت الٰہی ازل سے یہی چلی آ رہی ہے کہ تمام انسانوں کا امتحان کیا جائے اور انہیں آزمایا جائے، اس کیلیے کوئی شخص مستثنٰی نہیں ہے، لیکن بعض

اوقات سادہ لوح قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ایسے مسائل کیوں نہیں فراہم کئے جن سے حضرت علی علیہ السلام خلیفہ مسلم ہوجاتے؟ اللہ تعالیٰ نے کسی معجزہ کے ذریعہ علی علیہ السلام کی حمایت کیوں نہیں کی؟'' اس قسم کا سوال بالکل سادہ اندیشی پر مبنی ہے اور خدا کی حکمت کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ خداوند عالم نے اس دنیا کو میرے اور آپ کے امتحان کیلئے پیدا کیا ہے، وہ فرماتا ہے: ''اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ '' اس نے موت اور حیات کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ تمہیں آزمائے (ملک/۲) اس کے باوجود آیا امتحان سے کوئی راہ چارہ ہے؟

البتہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش وامتحان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ کسی کے باطن سے آگاہ ہو کیونکہ وہ تو ہر ایک کے باطن سے واقف اور آگاہ ہے، بلکہ امتحان سے اس کا مقصد انسانوں کیلئے ایک راہ ہموار کرنا ہے جس سے ہر شخص اپنے اپنے جوہر دکھا سکے اور آگاہانہ طور پر سوچ اور سمجھ کر راستے کا انتخاب کر سکے اسی لئے ایسی صورت حال پیدا ہو اور وسائل مہیا ہوں کہ ہر شخص کافی حد تک پہچان پیدا کرے اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور اپنے مکمل ارادہ واختیار سے خداوند عالم کے اوامر اور نواہی کی اطاعت کر کے فائز المرام ہو یا مخالفت کر کے اپنی عاقبت خراب کرے، لیکن اگر مخالفت کی راہیں مسدود ہوں اور فقط حق اور حقیقت کی پیروی کے ہی امکانات موجود ہوں تو پھر ایسی صورت میں آزمائش وامتحان بے معنی ہوجائیں گے اور حقیقی مومن کی اور ظاہری ودکھاوے کے مومن کی پہچان نہیں ہو سکے گی اسی طرح افراد کے ایمان کے درجات کی بھی شناخت نہیں ہو سکے گی۔

خلاصہ کلام اس دور کے سرکردہ افراد کی حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ مخالفت کی وجہ دنیا کی محبت تھی جب انہیں معلوم ہوگیا کہ حضرت علی علیہ السلام اپنے دین کو دوسروں کی ہوا وہوس

اور نفسانی خواہشات پر قربان کرنے کیلئے تیار نہیں تو سب ایکا کر کے آپ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے، جبکہ حضرت علی علیہ السلام خود اپنی ذات کیلئے لذت اور جاہ و مقام کے طلبگار نہیں تھے وہ دوسروں کی دنیوی لذتوں کی خاطر اپنے دین کو کیسے قربان کر سکتے تھے؟

۸

علی علیہ السلام کا طرز حکومت اور اصولوں کی پاسداری

حکومت اسلامی کی مخالفین کے ساتھ قاطعانہ طرز عمل

ابتدائے اسلام میں جب مسلمان دوسروں کی خلافت سے تنگ آگئے تو اس کے سوا چارہ نہ دیکھا کہ علی علیہ السلام کی طرف دست نیاز دراز کریں اور ان سے استدعا کریں کہ ''حکومت اور خلافت کے امور اپنے ہاتھ میں لیں اور انہیں خود سنبھالیں اور خود ہی چلائیں''۔

اس موقع پر بہت سے جوانوں اور نوجوانوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب صورت حال یہ تھی تو پھر علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے آغاز ہی سے مختلف گروہوں کے ساتھ جنگ کی کیوں ٹھان لی؟ بلکہ اصولی طور پر خلافت کے دوران آپ علیہ السلام کا جنگیں کرنے کا کیا مقصد تھا؟

قطع نظر اس کے کہ ہم ائمہ علیہم السلام کی عصمت کے قائل ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارے ائمہ علیہم السلام جو بھی کام انجام دیتے ہیں وہ ان کا خدائی وظیفہ ہوتا ہے لیکن ایک غیر جانبدار کی حیثیت سے ہم حضرت امیر علیہ السلام کی حکومت کے زمانے پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اس بارے تحقیق وجستجو کرتے ہیں تو خود سے سوال کرتے ہیں کہ ''آیا بہتر نہیں تھا کہ آنجناب علیہ السلام اپنے مخالفین کے ساتھ کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیتے جس کے تحت آپ کو اپنی خلافت کی پوری مدت کے دوران پیش آنے والی جنگوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا، اور اگر جنگیں پیش نہ آتیں تو اس قدر مسلمان نہ مارے جاتے، اس قدر مال غارت نہ ہوتا، اس قدر بچے یتیم نہ ہوتے، اس قدر عورتیں بیوہ نہ ہوتیں، اسلامی معاشرہ کو اس قدر اقتصادی نقصان برداشت نہ کرنا پڑتا، اس کے باوجود

امیر المومنین علیہ السلام نے مسائل جنگ کا کیوں انتخاب کیا؟''

جس طرح آج کے دور میں لوگ یہی باتیں کرتے ہیں اسی طرح اس زمانے میں بھی کئی گروہ تھے کہتے تھے کہ: ''علی علیہ السلام ویسے تو اچھے آدمی ہیں لیکن سیاست کرنا نہیں جانتے اور انہیں حکومت چلانے کا طریقہ نہیں آتا''

حضرت علی علیہ السلام بھی بعض اوقات اس طرح کے سطحی اور غیر منصفانہ فیصلے پر دردمندانہ شکایت بھی کیا کرتے تھے، اس کا جواب بھی دیا کرتے تھے کہ جس کا کچھ حصہ نہج البلاغہ میں بھی مذکور ہے۔

اس بحث کی اہمیت اس لئے ہے تاکہ ہم تاریخ کے اس حصہ میں رونما ہونے والے حوادثات اور مولا علی علیہ السلام کی فرمایشات، ان کی عملی سیرت اور ان حودثات کے ساتھ مقابلے کی طرف توجہ دیں اور اپنے زمانے کے درد کی دوا تلاش کریں، یعنی یہ دیکھیں کہ اگر حضرت علی علیہ السلام آج کے دور میں ہوتے تو کیا کرتے؟ اور یہی وہ چیز ہے کہ ہم علی علیہ السلام کے شیعہ کے طور پر اور جو شخص یہ چاہتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے تو ہم سب کو چاہئے کہ دور حاضر کی منطق کے پیش نظر آپ علیہ السلام کے کردار کو سمجھیں اور اسے اپنے عمل کیلئے اپنائیں۔ تو اب سنئے:

حضرت عثمان کے قتل ہو جانے کے بعد مسلمانوں نے حضرت علی علیہ السلام سے سخت اصرار کیا کہ خلافت کی باگ ڈور آپ علیہ السلام سنبھالیں، خود حضرت علی علیہ السلام کی نہج البلاغہ میں فرمائش کے مطابق کہ لوگوں نے آپ کے دروازے پر اس قدر ہجوم کیا اور اس قدر کثیر تعداد میں حاضر ہوئے کہ قریب تھا کہ حسن اور حسین علیہما السلام ان کے پاؤں تلے روندے جائیں، ان لوگوں میں جہاں اور بھی بہت سے افراد تھے وہاں حضرت طلحہ بھی موجود تھے، جو خود خلافت کے

متمنی بھی تھے، اور سالہا سال سے اس فرصت کی تلاش میں تھے کہ انہیں خلافت مل جائے اور ان لوگوں میں بھی شامل تھے جو حضرت عثمان کے قتل کی تحریک چلا رہے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر حضرت عثمان مارے جائیں گے تو لوگ انہی -طلحہ- کی بیعت کرلیں گے اور وہ "خلیفۃ المسلمین" کے راج سنگھاسن کو شرف عطا کریں گے۔

چنانچہ حضرت عثمان کے قتل ہو جانے کے بعد جو صورت حال پیدا ہوگئی وہ اس قابل نہیں تھی کہ حضرت طلحہ کے خوابوں کی تعبیر ظاہر ہوتی، جب انہوں نے دیکھا کہ جب حالات ان کے حق میں سازگار نہیں ہیں تو انہیں مجبوراً حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا اور مصلحت اسی میں سمجھی کی صبر کیا جائے اور حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرلی جائے۔

منقول ہے کہ حضرت عثمان کے مارے جانے کے بعد امیر المومنین علی علیہ السلام کی بیعت کرنے والے سب سے پہلے شخص آپ -حضرت طلحہ- ہی ہیں، چنانچہ ان کی بیعت کر لینے کے بعد ان کے جیسے دوسرے لوگوں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامی گرامی صحابیؓ، اسلام کے خدمت گار مشہور و معروف شخصیتیں، مُسن افراد، حُفّاظ قرآن اور دوسرے لوگوں غرضیکہ تمام مسلمانوں نے آپ دست حق پرست پر بیعت کی۔

اس موقع پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا بہتر نہیں تھا کہ ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام ایسے لوگوں کی دل جوئی فرماتے، تھوڑا سا ان کی باتوں کو بھی سن لیتے، ان کی پیشکش پر توجہ دیتے، ان کی خواہشات کو کسی حد تک اہمیت دیتے؟ طلحہ اور زبیر آپؑ سے چاہتے ہی کیا تھے؟ یہی نا کہ بیت المال میں سے ان کے اسی حصے کو عطا کرتے جو حضرت عمر نے ان کے کیلئے مقرر کیا تھا اور حضرت عثمان کے دور حکومت میں بھی وہی ملا کرتا تھا، یہ کوئی زیادہ اہم بات تو تھی نہیں تھی! جو حکومت کرنا چاہتا ہے اسے اس حد تک تو لچک پیدا کرنی چاہیئے!! آیا بہتر

نہیں تھا کہ امیر المومنین علیہ السلام ان کی اس درخواست کو قبول کر لیتے اور بیت المال سے ان کے اس حصے کو بحال رکھتے جو حضرت عمر نے مقرر کیا تھا اور حضرت عثمان نے بھی اسے بحال رکھا تھا؟ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جنگ سے بچایا جا سکتا تھا؟ آپ علیہ السلام کم از کم یہ تو کر سکتے تھے ابتدا میں ان کی پیش کش کو قبول کر لیتے، لیکن عمل کا موقع آتا تو ہزار حیلے بہانے بنائے جا سکتے تھے اور اس دوران میں آپ علیہ السلام ان مشکلات سے نکلنے کی راہیں پیدا کر لیتے!

نوٹ: یاد رہے حضرت طلحہ و زبیر کا بیت المال سے اضافی وظیفے کا تقاضا ایسی حالت میں تھا جب دونوں بزرگوار ثروت مند تھے، حضرت طلحہ تو آج کل کی اصطلاح کے مطابق فیوڈل (بہت بڑے جاگیردار) میں شمار ہوتے تھے اور جنہوں نے بہت سے علاقوں میں زیرِ کاشت زمین اپنے قبضہ میں لی ہوئی تھیں اور ان کے کارندے وہاں ان کیلئے کھیتی باڑی کیا کرتے تھے، ان زمینوں کی بہت بڑی آمدنی کے مالک تھے، جبکہ جناب زبیر بھی ان سے پیچھے نہیں تھے وہ اپنے دور کے متمول ترین افراد میں شمار ہوتے تھے، اس کے باوجود بھی وہ بیت المال سے اپنے لئے اضافی وظیفے کی رقم کا مطالبہ کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں وہی حصہ ملے جو ان کیلئے حضرت عمر نے مقرر کیا تھا اور حضرت عثمان نے بحال رکھا تھا جبکہ حضرت علی علیہ السلام نے اِن کے مطالبے میں فرمایا: ''میری کچھ ذاتی جائداد ہے اگر چاہو تو وہ میں تمہیں دیدوں؟'' انہوں نے جواب میں کہا: ''ہم کوئی گداگر نہیں کہ ہمیں آپ کے مال کی کوئی احتیاج ہو ہم اپنے اس امتیاز کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہیں جو ہمارے لئے خلیفہ ثانی نے مقرر کیا تھا اور تیسرے خلیفہ نے اسے برقرار رکھا تھا'' حضرت علیہ السلام نے فرمایا: ''میں ایسا ہر گز نہیں کر سکتا کیونکہ یہ خلاف سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور سابقہ خلفاء کے اس قسم کے طریقہ کار کو میں پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اسلام کے مطابق اسے صحیح سمجھتا ہوں''۔

۲۔ان کا دوسرا تقاضا یہ تھا کہ حضرت زبیر عراق کی حکومت کے خواہش مند تھے انہیں دیدی جائے اور حضرت طلحہ یمن کی حکومت کے متقاضی تھے وہ انہیں دیدی جائے۔

اس تقاضے کے ضمن میں ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ ان دونوں علاقوں کی حکومتوں کیلیئے ان حضرات سے اور کون بہتر ہوسکتا ہے؟ کیونکہ حضرت زبیر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے پھوپھی زادہ تھے، رسول خداؐ کے زمانے میں اسلام کی خدمات کیلیئے اور راہ خدا میں جہاد کیلیئے ان کے کارنامے روز روشن کی طرح جگمگا رہے تھے، اسی لئے بہتر تھا کہ حضرت علی علیہ السلام عراق کی حکومت ان کے سپرد کردیتے، اگر ان سے کوئی خلاف ورزی سرزد ہوتی تو اس کا مواخذہ کرتے۔

ادھر حضرت طلحہ بھی آپ سے یمن کی حکومت کے اس لئے خواستگار تھے کہ حضرت عثمان کے دور میں ان کے عزیز رشتہ داروں میں سے ایک شخص کو وہاں کا عامل مقرر کیا گیا تھا، اس نے وہاں سے ایک قابل توجہ ثروت اینٹھ لی اور اپنی ذاتی جائیداد میں شامل کرلیا- اور اسی ثروت سے ہی جنگ جمل کے اخراجات پورے کیئے گئے۔

اگر حضرت علی علیہ السلام یمن کی حکومت حضرت طلحہ کو دے دیتے تو کیا ہو جاتا؟ زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ اگر وہ وہاں چلے جاتے اور غیر شرعی طریقے سے مال و دولت حاصل کرتے اور بیت المال میں حرام مال کی کچھ مقدار جمع کردیتے، لیکن اس سے تو بہتر تھا کہ جنگ میں اس قدر بے گناہ لوگوں کا خون تو نہ بہایا جاتا!!۔

اسی بنا پر سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ امیر المومنین علیہ السلام ابتدا میں طلحہ و زبیر کے ساتھ سمجھوتہ کرلیتے اسی طرح سیاسی عقل کا تقاضا یہ بھی تھا کہ حضرت علی علیہ السلام اپنی حکومت کے مظبوط و مستحکم ہونے تک حضرت معاویہ کو بھی اجازت دیدیتے کہ مرکز اسلام سے دور از ایک

گوشے میں روم کی سرحدات کے قریب ملک شام میں حکومت کرتے رہیں، جب تک آپ علیہ السلام کی حکومت مستحکم نہ ہوجاتی اور معاویہ سے مقابلہ کیلئے لشکر وسپاہ کی تعداد کثیر جمع نہ ہوجاتی اس وقت انہیں نہ چھیڑتے، پھراس ی طرف متوجہ ہوتے اور بڑے آرام کے ساتھ اسے اپنے منصب سے معزول کردیتے۔

یہ تھے وہ مسائل جو حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے دور میں بھی حضورؑ کی خدمت میں عرض کئے گئے اور بڑا اصرار کیا گیا کہ آپ اپنی سیاسی حکمت عملی پر نظرثانی فرمائیں۔

آپ علیہ السلام نے جہاں اس طرح کی پیش کشوں کو ہی نہیں فرمایا بلکہ انہیں مسترد بھی کیا ہے اور فرمایا ہے کہ: ''تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں ان مسائل کونہیں جانتا؟ یا معاویہ کی ذکاوت اور سیاست مجھ سے بہتر ہے؟ یا وہ فرمانروائی کے اصول اور حکومت چلانے کے انداز مجھ سے بہتر جانتا ہے؟ میں نے ان مسائل کے بارے میں کافی غوروخوض کیا ہے اوران مسائل کا کافی حدتک تجزیہ کیا ہے اور جس حتمی نتیجے تک پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اب میرے سامنے صرف اورصرف دو راستے ہیں تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے، ۱۔ یا تو ان کے ساتھ جنگ کروں اور یا ۲۔ کافر ہوجاؤں تیسرا کوئی راستہ موجود نہیں ہے ''فَمَا وَجَدْتُنِي اِلَّا قِتَالُهُمْ اَوِالْجُحُوْدُ بِمَا جَاءَ بِهِ مُحَمَّدٌ (ص) فَكَانَتْ مُعَالَجَةُ الْقِتَالِ اَهْوَنُ عَلَيَّ مِنْ مُعَالَجَةِ الْعِقَابِ'' پس میں نے اپنے آپ کواس وسعت سے زیادہ میں موجود نہ پایا مگر یہ کہ یا توان لوگوں کے ساتھ جنگ کروں یا پھر جو چیزیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی طرف سے لائے ہیں ان کا انکار کردوں، چنانچہ میں نے جنگ کی راہ کوعذاب الٰہی کی راہ سے زیادہ آسان سمجھا ہے''۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۵۳)

اس کے باوجود نام نہاد جمہور طرزفکر اور عوامی رائے اور سوچ کے احترام کے دلفریب

نعروں سے یہ سوال ہمارے عزیز نوجوانوں کے ذہن میں تقویت پکڑ رہا ہے کہ حضرت امیرؑ نے مسائل کو صلح آمیز طریقے سے حل کرنے کی بجائے جنگ اور سختی کا راستہ کیوں منتخب کیا؟ اس مقام پر اس موضوع کی تحقیق کیلئے خود حضرت امیر علیہ السلام کی فرمائشات پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خود آنجناب علیہ السلام کا اس بارے میں کیا موقف ہے؟۔

حضرت علی علیہ السلام کا مقصد اسلامی حکومت کا مکمل عملی نمونہ پیش کرنا تھا

حضرت سول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اور حضرت علی علیہ السلام کی خلافت سے پہلے بالترتیب حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان نے مسند خلافت کو رونق عطا فرمائی، حضرت ابوبکر براہ راست لوگوں کی رائے سے اس مقام پر پہنچے، حضرت عمر، حضرت ابوبکر کے منصوب کر دینے سے خلیفہ بنے جبکہ حضرت عثمان چھ رکنی کمیٹی کے ''خصوصی انتخاب'' کے ذریعے اس کیلئے منتخب ہوئے، لیکن ان تینوں میں سے کوئی بھی حکومت صحیح معنوں میں ''اسلامی حکومت'' کا نمونہ نہ بن سکی۔

ادھر امیر المومنین علی علیہ السلام بھی خداداد ی علم اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمائشات کی بنا پر جانتے تھے کہ ان کے بعد کسی بھی معصوم امام علیہم السلام کے ہاتھوں کوئی اور اسلامی حکومت تشکیل نہیں پا سکے گی، اور تاریخ بھی گواہی دیتی ہے کہ آپ علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے حضرت امام حسن علیہ السلام کی خلافت، معاویہ کی ان سے جنگ آخر کار امام حسنؑ کی معاویہ سے صلح اور خانہ نشینی کی داستان پیش آئی، ان کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت، اسی طرح باقی ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی کے واقعات ہیں کہ ان مقدس ہستیوں میں سے کوئی بھی شخصیت حکومت تشکیل نہیں دے پائی، اسی بنا پر صحیح معنوں میں ایک اسلام حکومت

حضرت امیر علیہ السلام کے مختصر عرصہ اقتدار میں معرض وجود میں آئی اور آپ علیہ السلام نے بے انتہا مشکلات اور مجبوریوں کے باوجود اسے نمونہ کی اسلامی حکومت بنانے میں کامیاب ہوئے جس سے آپ علیہ السلام اسے ایک واقعی اسلامی حکومت دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے اور بتانا چاہتے تھے کہ اس طرح کی حکومت کے سربراہ اور کارندوں کو کس طرح حکومت چلانا چاہیئے؟ اگر چہ اس قسم کی حکومت کا نقشہ اور اس کے کلی اصول وقواعد تو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی زبانی بیان ہو چکے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا جائے، کیونکہ اگر اس قسم کی حکومت کا کوئی مصداق خارج میں نہ ہوتو اذہان میں اس فکر کو تقویت ملتی کہ اسلامی حکومت صرف تمناؤں، آرزوؤں اور خیالوں کی حسب دلخواہ حکومت تو ہوسکتی ہے مگر اس کو عملی طور پر قائم نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کہ اس طرح کی حکومت کا قیام ممکن ہے اور اسے زمانے کے کسی حصے میں قائم کیا جا سکتا ہے، چنانچہ دنیا کسی میں اسلامی حکومت کا نمونہ کسی معصوم امامؑ کے ہاتھوں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف امیر المومنین امام علی علیہ السلام کی حکومت کا دورانیہ ہے۔

البتہ یہ مسئلہ فقط شیعی عقیدہ کے لحاظ سے ہے، دوسرے مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے، ان کے نزدیک ابتدائے اسلام کی تمام حکومتیں ''اسلامی حکومت'' کی نوعیت کی ہیں، حتیٰ کہ بہت سے حضرات علماء تسنن نے ''حکومت'' کی بحث میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ: ''اگر کوئی شخص کسی برحق اسلامی حکومت کے خلاف خروج کرے تو اس کے ساتھ لڑنا واجب ہے اور اس کا قتل جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے، لیکن اگر وہ شخص کامیاب ہو جائے اور ''اسلامی حاکم'' کو قتل کر دے اور خود مسند نشین حکومت ہو جائے تو اس کی اطاعت سب پر واجب ہو جاتی ہے''۔

نوٹ: اس گفتگو کی بنیاد نظریہ استیلاء پر رکھی گئی ہے، اور یہ نظریہ حکومت اور سیاست کے بارے ان چند نظریات میں سے ایک ہے جسے امام شافعی، غزالی، ماروی، ابن تیمیہ وغیرہ جیسے جید علمائے اہل سنت کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، مثلاً امام شافعی سے منقول ہے کہ: "مَنْ وَلِیَ الْخِلَافَةَ فَاجْتَمَعَ عَلَیْهِ النَّاسُ وَرَضُوْا بِهٖ فَهُوَ خَلِیْفَةٌ، وَمَنْ غَلَبَهُمْ بِالسَّیْفِ حَتّٰی صَارَ خَلِیْفَةً فَهُوَ خَلِیْفَةٌ" یعنی جو شخص خلافت کو اپنے ہاتھوں میں لے لے اور لوگ بھی اس پر اکٹھے ہو جائیں اور راضی بھی ہو جائیں تو وہ خلیفہ ہوتا ہے اور جو ان پر چڑھائی کر کے تلوار کے ذریعے غالب آجائے تو وہ خلیفہ ہو جاتا ہے۔ اس بارے مزید مطالعہ کیلئے ملاحظہ ہو محمد ابوزہرہ کی کتاب "تاریخ المذاهب الاسلامیة والعقائد و تاریخ المذاهب الفقهیة" جلد اول

بہر صورت اس وقت ہمارا مقصد آراء پر تنقید و تبصرہ نہیں ہے ہم تو بس یہی چاہتے ہیں کہ جس مذہب کو صحیح جان کر اختیار کیا ہوا ہے اس کے مطابق گفتگو کریں۔

ہمارے عقیدے کے مطابق ایک صحیح معنوں میں اسلامی حکومت کا سربراہ سربراہ ایک ایسا فرد ہو کہ جس کی ہر رفتار، گفتار اور کردار حجت ہو اور دوسروں کیلئے نمونہ عمل کی حیثیت رکھتا ہو وہ صرف اور صرف امام علی علیہ السلام کی حکومت میں ہی دکھائی دیتی ہے البتہ یہ بات بھی درست ہے کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام جو کام بھی انجام دیتے تھے وہ امر خداوندی اور کتاب الٰہی کی بنیاد پر ہی ہوتا تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر کیا تھا، لیکن یہ سب کچھ ایک معیار اور معنیٰ کے مطابق تھا جن میں سے کوئی بھی بے مقصد اور بغیر کسی اساس کے نہیں تھا۔

نوٹ: معتبر روایات کی بنا پر خداوند عالم نے ہر ایک معصوم علیہ السلام کیلئے ایک مکتوب مقرر کیا ہے جس میں اس امام کی امامت کے دوران متعلقہ مسائل کا ذکر ہے اور اس میں اس امام کے شرعی فریضے کی ادائیگی کا طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے، البتہ روایات میں اس مکتوب کی ماہیت و

کیفیت کو بیان نہیں کیا گیا بلکہ ائمہ علیہم السلام خود ہی اس امر کی حقیقت حال سے واقف ہیں۔

جو پروگرام حضرت علی علیہ السلام کے لئے متعین تھا وہ یہ کہ وہ ایک اسلامی حکومت کا نمونہ پیش کریں اب طلحہ وزبیر ان کے پاس یہ مطالبہ لے کر آتے ہیں کہ عراق اور یمن کی حکومت ان کے سپرد کردی جائے، اگر امیر المومنین علیہ السلام ان کے ساتھ سمجھوتہ کر کے مصلحت سے کام لیتے ہوئے یا آج کی اصطلاح میں سیاست کے تحت ان کی درخواست کو قبول کر لیتے ہیں اور وہ بھی وہاں جا کر ایک عرصے تک اپنی نفسانی خواہشات کے تحت حکمرانی میں مشغول ہو جاتے تو عراق اور یمن میں تو اسلامی حکومت اپنا وجود قائم نہ کر پاتی، کیونکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ہاتھوں قائم نہیں ہو سکی ان کے ہاتھوں تو اول طریقے سے قائم نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ طلحہ اور زبیر ثابت کر چکے تھے کہ وہ کس حد تک دنیا کے دلدادہ ہیں، جبکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بظاہر بہت سے مسائل کا لحاظ رکھتے تھے البتہ اُس وقت کے تقاضے ہی کچھ ایسے تھے کہ وہ بہت ہی زاہدانہ زندگی بسر کریں اور ناجائز استفادہ، اسراف اور تبذیر سے کام نہیں لے سکتے تھے، لیکن طلحہ وزبیر ایسے نہیں تھے، مثلاً بوقت وفات حضرت زبیر کے ایک ہزار غلام اور لونڈیاں تھیں، مال ودولت اور زر و جواہر اس کے علاوہ تھے، لوگ ایسے شخص کو تارک دنیا اور دنیوی زرق و برق سے بے نیاز شخصیت کی حیثیت سے انہیں نہیں پہچانتے تھے، ایسی صورت حال کے پیش نظر اگر امیر المومنین علی علیہ السلام ان لوگوں کو اپنی حکومت میں شامل فرماتے تو دنیا علی علیہ السلام کی حکومت میں "اسلامی حکومت" کا نمونہ پیدا کر سکتی تھی؟۔

علی علیہ السلام کی حکومت میں "مصلحت" کا عنصر

سچ مچ اگر حضرت علی علیہ السلام طلحہ، زبیر اور معاویہ کے ساتھ مل کر ایک شوریٰ تشکیل

دیتے اور حکومت کو اپنے درمیان میں تقسیم کر لیتے، جب اجلاس ہوتا کچھ اپنے دل کی کہتے کچھ ان کے دل کی سنتے، راز و نیاز کی یوں گفت وشنید ہوتی۔

ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتہ کر کے ہنستے مسکراتے خوش ہوتے تو آج آپ اور ہم حضرت علی علیہ السلام کے متعلق کیا فیصلہ کرتے؟ آیا ان کی حکومت اور ان کے قبل و بعد کی حکومتوں کے درمیان کسی قسم کا فرق محسوس کرتے؟ چاہئے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام دوسری تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر صرف ایک مصلحت کو پیش نظر رکھیں جو سب سے بالاتر ہے اور وہ ہے ''اسلامی حکومت کا حقیقی نمونہ'' یہ وہ مصلحت ہے جس کے ساتھ کسی دوسری مصلحت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ارادہ خداوندی یہی تھا کہ ان کی حکومت کی تشکیل سے دنیا پر واضح کر دے کہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی حکومت کی تشکیل اور اس کا اجراء ممکن ہے اور امام عصر عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور پر نور تک۔ معلوم نہیں آپ علیہ السلام کی غیبت کا عرصہ کب تک جاری رہتا ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام کی حکومت ہم سب پر حجت ہے اور ہمیں بتا رہی ہے کہ صحیح اسلامی حکومت کا قیام صرف ایک ذہنی نظریہ ہی نہیں جو قابل عمل نہ ہو، اگر آنجناب علیہ السلام کی حکومت نہ ہوتی تو خداوند عالم کی حجت لوگوں پر تمام نہ ہوتی۔

اسی لئے اس قسم کی حکومت میں نہ تو ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی گنجائش اور نہ ہی کسی قسم کی ''ساز باز'' کی اور کماحقہٗ ایک صحیح اور خالص اسلامی حکومت ہی قائم ہو اور اس کا اجراء کیا جائے، اسی وجہ سے حضرت امیر علیہ السلام نے اسی پہلے ہی دن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ: ''میں اپنے شرعی فریضہ اور شرعی تکلیف کو اسی طرح انجام دوں گا جس طرح سرکار رسالت مآبؐ انجام دیا کرتے تھے'' اب ان کے اس مدعا کے ثبوت میں خود امیر المومنین علی علیہ السلام کی زبانی ہم شاہد پیش کرتے ہیں۔

جنگوں کے بارے میں پیغمبر خداؐ کی پیش گوئی

ابن ابی الحدید معتزلی اپنی کتاب شرح نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اِنَّ اللّٰہَ قَدْ کَتَبَ عَلَیْکَ جِھَادَالْمَفْتُوْنِیْنَ کَمَا کَتَبَ عَلَیَّ جِھَادِ الْمُشْرِکِیْنَ قَالَ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَاھٰذِہِ الْفِتْنَۃُ الَّتِیْ کُتِبَ عَلَیَّ فِیْھَاالْجِھَادُ؟قَالَ: قَوْمٌ یَشْھَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَھُمْ مُخَالِفُوْنَ لِلسُّنَّۃِ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَعَلَامَ اُقَاتِلُھُمْ وَھُمْ یَشْھَدُوْنَ کَمَا اَشْھَدُ؟ قَالَ عَلَی الْاِحْدَاثِ فِی الدِّیْنِ وَمُخَالَفَۃِالْاَمْرِ'' اللہ تعالیٰ نے مجھ پر مشرکین کے ساتھ اور تمہارے اوپر فتنہ پردازوں کے ساتھ جہاد فرض کیا ہے، جس طرح میں مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے پر مامور تھا اسی طرح میرے بعد ایک ایسا زمانہ آئے گا تم ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرو گے جو فتنے برپا کریں گے، امیر المومنین علیہ السلام نے سوال کیا: ''جس فتنے کا آپؐ نے ذکر فرمایا ہے' اس کا شکار کون لوگ ہوں گے' آپؐ نے فرمایا: ''وہ ایسے لوگ ہوں گے جو کلمہ شہادتین کو زبان پر جاری کریں گے یعنی کہیں گے کہ ہم خداوند وحدہٗ لاشریک کو مانتے ہیں، رسول پاک کی رسالت کو بھی تسلیم کرتے ہیں، ہم مسلمان ہیں، وہ اسلام کے ظاہری احکام پر بھی عمل کرتے ہوں گے لیکن میری سنت کے مخالف ہوں گے، یعنی میرے نقش قدم پر نہیں چلیں گے، تم نے ان سے جنگ کرنا ہے'' میں نے عرض کیا ''یارسول اللہؐ! جب یہ لوگ مسلمان ہوں گے خدا کی توحید کی اور آپ کی نبوت کی گواہی دیں گے تو پھر ان کے ساتھ کیونکر جنگ کروں گا؟ جو مسلمان ہوں گے نماز پڑھتے ہوں گے، روزے رکھتے ہوں گے پھر بھی ان سے جنگ کروں گا؟'' حضور انورؐ نے فرمایا: ''ہاں! ان کی ایک چیز تو ان کے

ساتھ تمہاری جنگ کا سبب بنے گی یہ ہوگی کہ وہ دین میں بدعت کی بنیاد رکھیں گے دوسرے وہ تمہارے مخالف ہوں گے، یعنی وہ تمہارے برحق امام اور خلیفہ ہونے کی مخالفت کریں گے جس کی حقانیت اور خلافت ثابت ہو چکی ہوگی اور قبول بھی ہو چکی ہوگی، یہ امام برحق کے خلاف خروج ہوگا جس کا مقابلہ ضروری ہوگا''۔

اسی لئے حضرت رسول اکرم صلی اللہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو پہلے سے خبر دار کر دیا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ جب آپ کو مسلمانوں کے بدعتی گروہ سے لڑنا پڑے گا، اس طرح سے آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کے اندر ایک روحانی آمادگی پیدا کر دی تا کہ اس طرح کے دور کیلئے آپ پہلے سے تیار رہیں۔

خود حضرت امیر علیہ السلام نہج البلاغہ میں دین کے اندر بدعتوں کے ظہور کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''وَاِنَّ الْمُبْتَدَعَاتِ الْمُشَبَّهَاتِ هُنَّ الْمُهْلِكَاتُ اِلَّا مَا حَفِظَ اللّٰهُ مِنْهَا'' بدعتیں اور شبہ میں ڈالنے والے امور جو چیزیں دین نہیں ہیں لیکن دین کے نام سے اس میں داخل کر دی گئی ہیں اور لوگوں کیلئے ان کی توجیہیں گھڑی جاتی ہیں وہ ان کی ہلاکت کا سبب ہیں، مگر یہ کہ خدا مہربانی کرے اور ان کے فسادات کے آگے بند باندھ دے اور معاشرہ کو ہلاکتوں سے بچالے۔

نیز فرماتے ہیں کہ: ''وَاِنَّ فِيْ سُلْطَانِ اللّٰهِ عِصْمَةً لِاَمْرِكُمْ'' یہ جو الٰہی قدرت اور حکومت (میرے پاس) ہے اس میں یہ برکت پائی جاتی ہے کہ تم ہر طرح سے محفوظ رہو، تمہارے تمام کام صحیح سمت انجام پائیں اور تم کسی قسم کے شبہات میں مبتلا ہو کر ہلاک نہ ہو جاؤ ''فَاَعْطُوْهُ طَاعَتَكُمْ غَيْرَ مَلُوَّمَةٍ وَلَا مُسْتَكْرَهٍ بِهَا'' اب جبکہ میری حکومت تمہاری ہلاکتوں سے نجات کا سبب ہے لہٰذا کسی جبر و کراہ کے بغیر مکمل اختیار کے ساتھ بقائمی ہوش و حواس میری حکومت کے

ساتھ مکمل تعاون کرو اور تہیہ کرلو کہ اسے دل وجان سے قبول کر رہے ہوتا کہ ایک تو دنیا میں تمہاری عزت محفوظ رہے دوسرے آخرت میں نجات اور سعادت کی سر بلندیوں تک جا پہنچو۔ ساتھ ہی فرماتے ہیں: ''یا تو تم یہ کام انجام دے کر خود کو میری حکومت حقّہ کے ساتھ مکمل اطاعت اور رغبت کے ساتھ ہم آہنگ کرلو گے یا پھر خدا تم سے یہ قدرت وطاقت واپس لے لے گا'' وَاللّٰهِ لَتَفْعَلُنَّ اَوْلَيَنْقُلَنَّ اللّٰهُ عَنْكُمْ سُلْطَانَ الْاِسْلَامِ ثُمَّ لَا يَنْقُلُهُ اِلَيْكُمْ اَبَدًا حَتّٰى يَاْذِرَ الْاَمْرُ اِلٰى غَيْرِكُمْ ''اگر میری حکومت حقہ کا ساتھ نہیں دو گے تو خداوند عالم اسلامی سلطنت اور اسلامی حکومت تم سے واپس لے لے گا اور دوسروں کے سپرد کر دے گا۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۱)

دیکھا آپ نے! امیر المومنین علی علیہ السلام نے اس حقیقی راہ کی نشاندہی کی ہے جس سے اسلامی معاشرہ کی قدرت وعزت محفوظ رہے وہ یہ کہ لوگ الٰہی حکومت کی پیروی کریں، خدائی احکامات کی پابندی کریں اور انہیں معاشرہ میں رائج کر کے ابدی سرخروئی اور سر بلندی حاصل کریں۔

پھر حضرتؑ نے قسم کھا کر فرمایا کہ: ''اگر بدعتوں اور خود ساختہ قوانین کی پیروی کرو گے اور مختلف تاویلیں اور حیلے بہانے بنا کر احکام الٰہی کے اجرا سے جان چھڑانے کی کوشش کرو گے مثلاً یہ کہو کہ ''زمانہ کے حالات کا تقاضا کچھ اور ہے، ہم نے دنیا کے ساتھ چلنا ہے اور دنیا ہم سے یہ باتیں قبول نہیں کرتی تو یاد رکھو کہ تم سے یہ قدرت شوکت، وقار اور سطوت چھین لی جائے گی''۔

رسول خداؐ - اور - علی مرتضیٰ علیہ السلام کی جنگوں میں فرق

حضرت امیر علیہ السلام نہج البلاغہ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دور کے جنگوں کے بارے میں فرماتے ہیں: ''لَقَدْ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (ص) وَاِنَّ الْقَتْلَ لَيَدُوْرُ

عَلَى الْآبَاءِ وَالْأَبْنَآءِ وَالْإِخْوَانِ وَالْقَرَابَاتِ فَمَا نَزْدَادُ عَلٰى كُلِّ مُصِيْبَةٍ وَشِدَّةٍ إِلَّا إِيْمَانًا وَمُضِيًّا عَلَى الْحَقِّ وَتَسْلِيْمًا لِلْأَمْرِ وَصَبْرًا عَلٰى مَضَضِ الْجِرَاحِ'' جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایسی صورت حال بھی پیش آجاتی تھی کہ ہم اپنے آباء واولاد، بھائیوں اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ بھی جنگ کیا کرتے تھے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ ہم ان کو قتل کردیں ابتدائے اسلام کے دور میں نوبت یہاں تک پہنچ جاتی تھی کہ باپ بیٹا ایک دوسرے کے مدِ مقابل آجاتے تھے اور ایک دوسرے کو قتل کردیا کرتے تھے اور یہ سخت مصیبتیں اور آزمائشیں اس بات کا موجب نہیں ہوتی تھیں کہ ہم ایمان سے دستبردار ہوجائیں یا اپنی راہ وروش میں کسی قسم کی سستی کا مظاہرہ کریں یا جنگ سے راہ فرار اختیار کرجائیں بلکہ اس طرح سے ہمارے ایمان میں مزید پختگی اور استحکام پیدا ہوجایا کرتا تھا۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۱)

لیکن اس کے باوجود زمانہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگوں میں خوبی یہ تھی کہ حق اور باطل دونوں کے محاذ واضح اور روشن تھے، ایک طرف ایمان تھا اور دوسری طرف کفر تھا، ایک محاذ پر پیغمبر اکرمؐ اور مسلمان تھے جبکہ ان کے مقد مقابل یا کفار تھے یا مشرکین، یہی وجہ ہے کہ جس نے اسلام کو قبول کرلیا تھا، اس کیلئے پوری طرح واضح تھا کہ وہ کفار کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے بھی آمادہ رہے، غرض کسی قسم کا ابہام، اضطراب اور شک وشبہ نہیں پایا جاتا تھا۔

مگر افسوس کہ امیر المومنین علیہ السلام کے دور میں حضرت رسالتمآبؐ کے زمانے سے زیادہ سخت مشکلات درپیش تھیں، حالات یہ رخ اختیار کرچکے تھے کہ مسلمان، مسلمانوں سے لڑیں، اسی سلسلے میں مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''وَلٰكِنَّا إِنَّمَا أَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ إِخْوَانَنَا فِي الْإِسْلَامِ عَلٰى مَا دَخَلَ فِيْهِ مِنَ الزَّيْغِ وَالْإِعْوِجَاجِ وَالشُّبْهَةِ وَالتَّاوِيْلِ'' حضور اکرمؐ کے بعد اب دور آگیا کہ ہم اپنے ہم مذہب اور مسلمان بھائیوں کے ساتھ جنگ کریں جو گمراہی اور

کجروی کا شکار ہو چکے تھے اور احکام الٰہی کی تاویلیں اپنی مرضی اور منشا سے کیا کرتے تھے۔

یہی وہ چیز ہے جس کے بارے میں سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو جس کی پیش گوئی فرمادی تھی اور فرمایا تھا کہ: ''ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ میں نے جس طرح قرآن کی ''تنزیل'' پر جنگیں لڑیں، آپؑ لوگوں سے قرآن کی ''تاویل'' پر جنگ کریں گے'' اور حضور گرامیؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو ان کی گمراہی کے کچھ نمونے بھی بتائے، چنانچہ حضرت علیؑ نے بھی نہج البلاغہ کے خطبات میں سے ایک میں قول رسالتمآبؐ کو نقل فرمایاھیکہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا: ''میرے بعد میری امت میں جو فتنے ظاہر ہوں گے ان میں سے کچھ یہ بھی ہوں گے کہ ''فَيَسْتَحِلُّونَ الْخَمْرَ بِالنَّبِيْذِ وَالسُّحْتَ بِالْهَدِيَّةِ وَالرِّبَا بِالْبَيْعِ'' ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ شراب کو انگوروں کا پانی سمجھ کر، رشوت کو ہدیہ سمجھ کر اور سود کو تجارت سمجھ کر حلال قرار دے دیں گے۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۵)''۔

''تاویل'' اور ''تنزیل'' کی بنیاد پر جنگ

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: کہ ایک دن حضرتِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک جوتے کا بند ٹوٹ گیا، آپؐ نے اسے ٹھیک کرنے کیلئے حضرت علی علیہ السلام کو دیا، پھر آپؐ ایک پاؤں کے جوتے کے بغیر ہی اپنے اصحاب کرامؓ کے مجمع میں تشریف لائے اس دن مسجد میں لوگوں کی تعداد بھی زیادہ تھی جن میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بھی تشریف فرما تھے حضور اکرمؐ نے اپنا رخ ان کی طرف کر کے فرمایا: ''إِنَّ مِنْكُمْ مَنْ يُقَاتِلُ وَعَلَى التَّأوِيْلِ كَمَا قَاتَلَ مَعِيَ عَلَى التَّنْزِيْلِ'' تمہارے درمیان ایک شخص وہ بھی ہے جو میرے بعد ''تاویل'' پر جنگ کرے گا، جس طرح اس نے میرے ساتھ مل کر ''تنزیل'' پر

جنگ کی تھی۔

یہ سن کر حضرت ابوبکر نے پوچھا: ''یَارَسُوْلَ اللّٰہ! اَنَاذَاکَ'' وہی جنگجو دلاور میں ہوں گا؟'' فرمایا''نہ!'' حضرت عمر نے سوال کیا: ''حضورؐ! وہ میں ہوں گا؟'' فرمایا: ''نہ تم بھی نہیں ہو گے!'' یہ سن کر تمام صحابہ کرامؓ خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے پھر حضورِ اکرمؐ نے فرمایا: ''وَلٰکِنَّهٗ خَاصِفُ النَّعْلِ'' بلکہ وہ جوتا گانٹھنے والا ہے''وَاَوْمَأَ بِیَدِهٖ اِلٰی عَلِیّ'' اور ساتھ حضور ہی اپنے ہاتھ سے علیؑ کی طرف اشارہ فرمایا۔ یعنی جو شخص میرے بعد تاویل قرآن پر جنگ کرے گا وہ وہی ہے جو اس وقت میرا جوتا گانٹھ رہا ہے'' (بحار جلد ۳۲ باب ۷ روایت ۲۶۰)

تو اس طرح سے حضور پاکؐ نے اپنی زندگی ہی میں بتا دیا تھا کہ میرے بعد علی ہی جنگ کریں گے اور ان کی جنگ حق پر اور قرآن مجید کی بنیاد پر ہوگی، لہٰذا اس پر یہ اعتراض ہرگز نہ کرنا کہ: ''وہ آیات قرآنی کی صحیح تطبیق نہیں کرتا''۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام جمل والوں کے ساتھ جنگ کی تیاری کر رہے تھے تو اس وقت قرآن مجید کی اس آیت کی تلاوت کر رہے تھے''وَاِنْ نَکَثُوْا اَیْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ فَقَاتِلُوا اَئِمَّةَ الْکُفْرِ اِنَّهُمْ لَا اَیْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَنْتَهُوْنَ'' اس آیت کا مضمون یہ ہے کہ مشرکین تم (مسلمان) لوگوں کے ساتھ عدم جارحیت کے معاہدے کرتے ہیں اور اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ حرمت والے چار مہینوں اور دیگر اوقات میں تمہارے ساتھ جنگ نہیں کریں گے، جب تک وہ اپنے معاہدوں پر کاربند رہیں، تم بھی ایفائے عہد کرو، لیکن وہ عہد شکنی کرنے لگیں تو تم کفر کے پیشواؤں کے ساتھ خوب لڑو.....

اس دن حضرت علی علیہ السلام نے اس آیت مجیدہ کی تلاوت کے بعد فرمایا: ''ان

پیشواؤں'' سے مراد جنگ جمل کے ''بڑے بڑے سربراہ'' ہیں اور جس دن سے یہ آیت نازل ہوئی ہے اس دن سے آج تک اس پر عمل نہیں ہوا اور ہم آج جنگ جمل میں اس پر عمل کریں گے''۔ (بحارالانوار جلد ۳۲ باب ۳ روایت ۱۴۰)

یہ دراصل اس آیت کی تاویل ہے اور اس کا ان تاویلات سے تعلق ہے جن کے متعلق حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے فرمایا تھا کہ ''وہ قرآن کی تاویل پر جنگ کریں گے''۔

یہ صحیح ہے کہ جناب طلحہ اور زبیر ایک زمانے میں پیغمبر اسلامؐ کے اصحاب خاص میں شمار ہوتے تھے اور زبیر تو وہ شخص تھے جنہوں نے سالہا سال تک جنگوں میں بھی شرکت کی تھی ان کیلئے اور ان کی تلوار کیلئے پیغمبر اکرمؐ نے دعا بھی فرمائی تھی، لیکن ایک وہ وقت بھی آ گیا کہ انہی جنابؐ کے جانشین کے مقابلے میں آ کھڑے ہوئے اور مذکورہ ''پیشواؤں'' کی قطار میں آ گئے۔

زبیر حضرت رسالتمآبؐ کے پھوپھی زادے اور اس شخصیت کے مالک تھے کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا انہیں وصیت کرنا چاہتی تھیں اور حضرت علی علیہ السلام سے عرض کیا تھا: ''اگر کسی مجبوری کی بنا پر آپ میری وصیت کو قبول نہیں کر سکتے تو میں زبیر سے یہ وصیت کرتی ہوں!!'' یہ زبیر وہی تو تھے جنہوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی تھی اور حضرت علی علیہ السلام کے خواص میں شمار ہوتے تھے لیکن ایک وقت وہ بھی آ گیا انہی حضرت علی علیہ السلام کے مقابلے میں خم ٹھونک کر آ گئے اور حضرت علی علیہ السلام نے انہیں مذکورہ ''پیشواؤں'' کا مصداق قرار دیا اور ان عہد شکنوں میں انہیں ذکر فرمایا ''نَکَثُوْا اَیْمَانَهُمْ'' جن کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

مذکورہ روایت میں ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ فرمایا کہ: ''جو شخص ''تاویل'' پر جنگ کرے گا وہی ہے جو میرے جوتے ٹھیک کر رہا ہے'' ساتھ ہی اس بات

کا اضافہ بھی فرمایا کہ: ''اِنَّہٗ یُقَاتِلُ عَلَی التَّاوِیْلِ اِذَا تُرِکَتْ سُنَّتِیْ وَنُبِذَتْ وَحُرِفَ کِتَابُ اللّٰہِ وَتَکَلَّمَ فِی الدِّیْنِ مَنْ لَیْسَ لَہٗ فِی ذَالِکَ فَیُقَاتِلُھُمْ عَلِیٌّ عَلٰی اِحْیَاءِ دِیْنِ اللّٰہِ تَعَالٰی'' حضور انورؐ نے حضرات ابوبکر، عمر اور دیگر صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں فرمایا: ایک دن ایسا آئے گا کہ لوگ میری سنت کو پس پشت ڈال دیں گے اور اپنی خواہشات و آرا کے پیچھے بھاگیں گے، آجکل کی اصطلاح میں ''جمہوریت'' پر عمل کریں گے، اس دوران میں کتاب خدا میں تحریف کی جائے گی اور آیات خداوندی کی کسی اور طریقے سے تفسیر کریں گے۔ البتہ واضح ہے کہ اس تحریف سے آپؐ کی مراد قرآن مجید کی تحریف لفظی نہیں ہے، کیونکہ خداوند عالم فرماتا ہے: ''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ'' بے شک ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور یقینی طور پر ہم ہی اس کے محافظ اور نگہبان ہیں۔ (حجر/۱۵)

پس بنابریں تحریف سے آپؐ کی مراد ''تحریف معنوی'' ہے جسے دوسرے لفظوں میں تفسیر بالرائے کہتے ہیں، حضورؐ فرماتے ہیں کہ ایک دن آئے گا جس میں قرآن میں تفسیر بالرائے کی جائے گی اور اس کے وہ معنی مراد نہیں لئے جائیں گے جو خداوند عالم کو منظور ہیں اور وہ اس کی دلیل یہ دیں گے کہ ان اصلی معانی کا چاہنے والا کوئی نہیں ہے خود امیر المومنین علیہ السلام نہج البلاغہ میں اس بارے میں فرماتے ہیں کہ: ''وَاِنَّہٗ سَیَاْتِیْ عَلَیْکُمْ مِنْ بَعْدِیْ زَمَانٌ... لَیْسَ لَیْسَ عِنْدَ اَھْلِ ذَالِکَ الزَّمَانِ سِلْعَۃٌ اَبْوَرَ مِنَ الْکِتَابِ اِذَا تُلِیَ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ وَلَا اَنْفَقَ مِنْہُ اِذَا حُرِّفَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ'' ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب قرآن صحیح پڑھا جائے گا تو بازار علم و عمل میں قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی دوسرا مال و متاع بے قیمت اور بے وقعت نہیں ہوگا، لیکن اگر قرآن کی تحریف کی جائے گی اور اپنی اصل اور صحیح معنی کی بجائے غلط معنی پر محمول کیا جائے گا تو

قرآن سے بڑھ کر کوئی اور جنس قیمتی نہیں ہوگی۔

حضرت علی علیہ السلام ہی کے دور میں حالات اس حد تک بدل گئے تھے کہ پیغمبر اسلامؐ کی قرآئت متروک ہوچکی تھی اوراس کی جگہ نئی نئی قرائتیں متعارف ہوچکی تھیں ''حُرِفَ کِتَابُ اللّٰهِ وَتَكَلَّمَ فِي الدِّيْنِ مَنْ لَيْسَ لَهُ فِي ذَالِكَ'' دین کے بارے ایسے ایسے لوگ زبان کشائی کرنے لگ گئے تھے جو اس کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

ہمارے زمانے میں کیا حالات ہیں؟ آیا صرف حقیقی علماء، مراجع اور اسلام شناسی ہی دین کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور دوسرے لوگ اس دین کے بحث طلب امور اور تخصصی کے مسائل پر لب کشائی نہیں کرتے؟ اور اپنی آراء ونظریات کو اس میں داخل نہیں کرتے؟ غیر متخصص لوگ اس خوف سے کہ مبادا کوئی احتیاط اور حقیقت کے خلاف بات ہوجائے دینی مسائل میں مداخلت نہیں کرتے؟ حضور رسالتمآبؐ نے فرمایا تھا کہ: ''ایک دن آئے گا کہ دین سے متعلقہ مسائل کے احاطہ میں وہ لوگ دخل انداز ہوں گے جو اس کی صلاحیت نہیں رکھتے ہوں'' تَكَلَّمَ فِي الدِّيْنِ مَنْ لَيْسَ لَهُ فِي ذَالِكَ فَيُقَاتِلُهُمْ عَلِيٌّ عَلٰى اِحْيَاءِ دِيْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى '' یہی وہ موقع ہے جہاں پر علی علیہ السلام کو جنگ کرنا چاہیے، تاکہ دین خداوندی زندہ رہے اور میری متروکہ سنت از سر نو زندہ کی جائے۔

اَقدار کی جنگ یا اقتدار کی جنگ؟

ان وجوہات کی بنا پر کہ پیغمبر اسلامؐ کی متروکی سنتیں ایک مرتبہ پھر زندہ ہوں، خودساختہ قرائتیں ایک طرف ہٹا کر اصلی قرائت کو رائج کیا جائے تاکہ معنوی تحریف اور تفسیر بالرائے قرآن مجید کا خاتمہ کرکے اس کے صحیح معانی پیش کرکے ان پر عمل درآمد کیا جائے، حضرت علی علیہ السلام کو

اپنے مخالفین کے ساتھ جنگ کرنا چاہئے، چنانچہ آپؑ خود ہی جنگ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: "اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ تَعْلَمُ اَنِّی لَمْ اُرِدِالْاِمْرَۃَ وَلَا عُلُوَّ الْمُلْکِ وَالرِّئَاسَۃِ" خداوندا! تو خود بہتر جانتا ہے کہ اگر میں ان لوگوں کے ساتھ اس لئے جنگ نہیں کر رہا کہ میں ان کا امیر بنوں اور ان کی حکومت اور ریاست اپنے قبضے میں لے لوں "وَاِنَّمَا اَرَدْتُ الْقِیَامَ بِحُدُوْدِکَ وَالْاَدَاءَ لِشَرْعِکَ" میں اس لئے جنگ کر رہا ہوں تا کہ تیری مقرر کی ہوئی حدود کو معاشری میں نافذ کروں اور تیرے قوانین کا نفاذِ عمل میں لاؤں "وَوَضْعَ الْاُمُوْرِ فِی مَوَاضِعِھَا" اور اس لئے بھی تا کہ تمام امور اپنے صحیح رخ پر چلتے رہیں "وَتُوْفِیرُ الْحُقُوْقِ عَلٰی اَھْلِھَا" اور لوگوں کے حقوق کو اپنی اصل جگہ تک لوٹا دوں، چونکہ سابقہ حکومتوں کی غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے لوگوں کے حقوق ضائع ہو چکے تھے من پسند اور نزدیک و دور کے رشتہ داروں کے خصوصی نوازشات سے نوازا گیا تھا، میں اس لئے جنگ کر رہا ہوں تا کہ لوگوں کے حقوق کو واپس لوٹاؤں اور بیت المال کو اہل لوگوں کے درمیان برابر تقسیم کروں "وَالْمُضِیَّ عَلٰی مِنْھَاجِ نَبِیِّکَ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" تیرے پیغمبرؐ کے بتائے ہوئے ان اصولوں پر عمل کروں جو انہوں نے واضح طور پر متعین فرمائے تھے، ان لوگوں کے اصولوں پر نہیں جو انہوں نے حضور پاکؐ کے بعد اپنی مرضی سے مقرر کر لئے تھے "وَاِرْشَادِ الضَّالِّ اِلٰی اَنْوَارِ ھِدَایَتِکَ" میں اگر جمل والوں کے ساتھ لڑ رہا ہوں یا کسی اور گروہ کے ساتھ صرف اس لئے کہ گمراہوں کو ہدایت کروں"۔

(شرح ابن ابی الحدید جلد ۲۰ باب ۴۱۴)

اگر امیر المومنین علیہ السلام جنگ نہ کرتے جو لوگ ہدایت کے متلاشی تھے وہ راہ ہدایت سے کوسوں دور چلے جاتے، کیونکہ جمل والوں کے طور طریقے ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ جن کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوئے جا رہے تھے، اسی لئے تو حضرت فرما رہے ہیں کہ تا کہ ان لوگوں کے واسطے

راستہ کھول دوں جو ہدایت کی طلب میں ہیں اور جنہیں صراط مستقیم کی تلاش ہے۔

اب ہمارا فرض بنتا ہے کہ تاریخ میں پیش آنے والے واقعات سے اپنے زمانہ کیلئے استفادہ کریں، ظاہر ہے کہ یہ مسائل صرف حضرت علی علیہ السلام کے دور کے ساتھ مخصوص نہیں تھے، حضرت علی علیہ السلام کی جنگوں کا مقصد وہی تھا جو خود انہوں نے اپنی زبانی ارشاد فرمایا کہ کچھ لوگوں کی خواہش تھی کہ انہیں حکومت علوی سے زیادہ سے زیادہ حصہ ملنا چاہئے اور ساتھ ہی ایک اسلامی معاشرے میں بدعتوں کی ترویج تھی، جب حضرت علی علیہ السلام نے اقتدار حاصل کرلیا اور ''حُضُوْرُ الْحَاضِرِ وَقِیَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ ''(نہج البلاغہ خطبہ ۳) کے حکم کے مطابق انہی نمازی اور مسجدوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کریں جو سالہا سال تک بدر، احد اور حنین کی جنگوں میں شرکت کرتے رہے، مجروح ہوتے رہے، اسلام کی ترویج کیلئے مال خرچ کرتے رہے، کیوں؟ اس لئے تا کہ دین خدا کا احیاء ہو اور بدعتیں مٹ جائیں، آیا یہ امر صرف حضرت علی علیہ السلام کے زمانے کے ساتھ مخصوص تھا؟ اب اس کا مصداق باقی نہیں رہا؟ اگر کسی زمانے میں اسلامی معاشرے میں بدعتیں، سنت بن جائیں اور بدعت کی ترویج کرنے والے وعظ ونصیحت سے بھی راہ راست پر نہ آئیں اور کچھ لوگوں کے پاس اقتدار بھی ہو جو اسے استعمال کر سکتے ہوں تو کیا وہ انہیں طاقت کے ذریعہ روکیں نہیں؟

۹

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد علی علیہ السلام کا کردار

۲۵ سال تک صبر کس لیئے؟

ہماری سابقہ گفتگو میں یہ بات موضوع بحث رہی کہ کیا وجہ تھی کہ خلافت کی مسند پر بیٹھنے کے بعد حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کچھ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رہے اور آپ کی خلافت کا تقریباً سارا عرصہ ایسے لوگوں سے لڑتے گزر گیا؟ - پہلے جمل والوں کے ساتھ پھر صفین والوں اور بعد میں نہروان والوں کے ساتھ -

جیسا کہ خود آنجناب علیہ السلام نے بارہا اپنی فرمائشات میں اسی بات کی تاکید کی ہے، ان جنگوں میں ان فرائض کی ادائیگی اور واجبات کی انجام دہی کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں تھا جو خداوند عالم نے ان کے ذمہ عائد فرمائے تھے اور جو لوگ حضرت علیہ السلام کے ان اقدامات کی دوسری توجیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ علیہ السلام کا مقصد کشور کشائی تھا اور آپ جنگوں کے ذریعہ اپنی حکومت کی توسیع اور اقتدار کا وسعت تھا، ان کی نظروں میں معاویہ کے ساتھ آپؑ کی جنگ حکومت کی توسیع کیلئے تھی اور آپ چاہتے تھے کہ آپ کی ایک عظیم اور وسیع ترین حکومت ہو اور سرحدات شام بھی آپ کے زیرِ نگین آجائیں، یا طلحہ وزبیر کے ساتھ آپ کی جنگ اس لئے تھی کہ مبادا عراق کی زرخیز زمین آپ کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

ادھر دوسری طرف پہلے تین خلفاء کے دور میں اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی بیعت سے کچھ پہلے لوگ آپ کو جنگ پر اکساتے تھے اور کہتے تھے کہ: ''آپ خاموش کیوں بیٹھے ہیں؟

خلافت پر آپؑ کا حق بنتا آپؑ اپنا حق ان بزور چھین لیں، اگر سیدھے ہاتھوں نہیں دیتے جنگ کر کے حاصل کریں، اس بات کی اجازت نہ دیں کہ دوسرے لوگ آپ کے حقوق پایمال کر دیں"۔

جب یہ لوگ آپ علیہ السلام سے منفی جواب سنتے تھے تو کہتے: "علیؑ کو اپنی جان کا ڈر ہے، مارے جانے کے خوف سے اپنے حق کے حصول کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھاتے، اس لئے خاموش ہیں"۔

(نوٹ: اس گفتگو کے تسلسل میں آگے چل کر حوالہ جات کی طرف اشارہ ہوگا۔)

اسی بنا پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کس وجہ سے آپ نے اپنے حق کے حصول کیلئے کوئی اقدام نہیں کیا جبکہ خلافت آپ کا صحیح معنی میں حق بنتی تھی؟ آیا آپ سچ مچ اپنی جان کے خوف سے چپ رہے یا اصولی طور پر اس اصل میں آپ کو شک تھا کہ آپ کا یہ اقدام صحیح بھی ہے یا نہیں؟ آیا علیؑ واقعاً نہیں جانتے تھے کہ آپ کا شرعی فریضہ کیا بنتا ہے؟ ایک وہ اعتراض جو اس دور میں بھی آپ کو درپیش تھا وہ یہی تھا اور نہج البلاغہ میں جناب کی فرمائشات کے ضمن میں اسے یوں ذکر کیا گیا ہے کہ: "مجھے لوگ کہتے ہیں کہ کیا آپؑ کو اپنی حقانیت کے بارے شک ہے کہ اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھاتے؟"۔

آیا واقعاً ایسا تھا اور جنابؑ کو اس امر میں کسی قسم کا شک وشبہ تھا؟ آیا جان کا خطرہ اس بات کا باعث ہوا کہ اس دور میں آپ خاموش رہیں؟ جس طرح کہ "حکمیت" کی صورت حال پیش آجانے کے بعد آپ علیہ السلام نے معاویہ سے جنگ بند کر دی تو خوارج اعتراض کرنے لگے کہ: "آیا آپ نے اپنی جان کے خوف سے جنگ بند کر دی ہے؟"۔

بہر حال یہ سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ایک وقت میں تو آپ علیہ السلام اپنے مخالفوں

کے مقابلے میں ڈٹ گئے حتیٰ کہ جنگ کی حد تک آگے چلے گئے اور جنگ بھی کی اور اپنے مخالفوں کو تہ تیغ بھی کیا، جبکہ ایک زمانے میں آپؑ بالکل خاموش ہو کر بیٹھ گئے بلکہ مخالفوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے رہے، اس کی کیا وجہ ہے؟۔

اگر چہ تاریخی شواہد کی تحقیق ہی اس سوال کی تحلیل و تجزیہ کیلئے کافی ہے، لیکن مزید تسلی کیلئے بہتر ہے کہ اس سوال کا جواب خود آنجناب علیہ السلام کے کلمات میں تلاش کریں تا کہ کسی کیلئے شک کی یہ گنجائش باقی نہ رہ جائے کہ ہمارا تجزیہ صرف ذاتی حدس اور گمان پر مبنی ہے۔ لیجئے:

جواب

حاضر ہے اور وہ یہ کہ اس زمانے میں بھی بعض لوگ کہا کرتے تھے کہ ''امیر المومنین علیہ السلام خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بہتر تھا کہ ۲۵ سال پہلے کی طرح - اپنے مخالفوں سے جنگ نہ کرتے یا اگر ایسا کرنا ناگزیر بھی ہو گیا تھا تو کم از کم جنگ کے مسئلے کو التوا میں ڈال دیتے'' گویا ایسے لوگوں کے نظریہ کے مطابق یہ جو حضرت امیر علیہ السلام نے خود کو جنگوں میں الجھا لیا تھا، سب سے پہلے جنگ جمل پھر ساتھ ہی صفین میں الجھ گئے تو آپ علیہ السلام کی یہ سیاست صحیح نہیں تھی، صاف اور سیدھے لفظوں میں ''حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے ایام میں جو راستہ اختیار کیا تھا وہ صحیح نہیں تھا اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ علیہ السلام سیاست نہیں جانتے تھے اور حکمرانی اور فرمانروائی کے اصولوں سے باخبر نہیں تھے''۔

لوگوں کے اس قسم کے ''فیصلوں'' کے جواب میں خود حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہی ارشاد فرماتے ہیں: ''وَلَقَدْ اَصْبَحْنَا فِی زَمَانٍ قَدِاتَّخَذَ اَکْثَرُو اَھْلِہِ الْغَدْرَ کَیْسًا '' ہم ایسے زمانے میں رہ رہے ہیں جس میں اکثر لوگوں نے دھوکہ بازی اور فریب کاری کو عقلمندی اور

کے مقابلے میں ڈٹ گئے حتیٰ کہ جنگ کی حد تک آگے چلے گئے اور جنگ بھی کی اور اپنے مخالفوں کو تہ تیغ بھی کیا، جبکہ ایک زمانے میں آپؑ بالکل خاموش ہو کر بیٹھ گئے بلکہ مخالفوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے رہے، اس کی کیا وجہ ہے؟۔

اگر چہ تاریخی شواہد کی تحقیق ہی اس سوال کی تحلیل و تجزیہ کیلئے کافی ہے، لیکن مزید تسلی کیلئے بہتر ہے کہ اس سوال کا جواب خود آنجناب علیہ السلام کے کلمات میں تلاش کریں تا کہ کسی کیلئے شک کی یہ گنجائش باقی نہ رہ جائے کہ ہمارا تجزیہ صرف ذاتی حدس اور گمان پر مبنی ہے۔ لیجئے:

جواب

حاضر ہے اور وہ یہ کہ اس زمانے میں بھی بعض لوگ کہا کرتے تھے کہ "امیر المومنین علیہ السلام خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بہتر تھا کہ ۲۵ سال پہلے کی طرح - اپنے مخالفوں سے جنگ نہ کرتے یا اگر ایسا کرنا ناگزیر بھی ہو گیا تھا تو کم از کم جنگ کے مسئلے کو التوا میں ڈال دیتے" گویا ایسے لوگوں کے نظریہ کے مطابق یہ جو حضرت امیر علیہ السلام نے خود کو جنگوں میں الجھا لیا تھا، سب سے پہلے جنگ جمل پھر ساتھ ہی صفین میں الجھ گئے تو آپ علیہ السلام کی یہ سیاست صحیح نہیں تھی، صاف اور سیدھے لفظوں میں "حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے ایام میں جو راستہ اختیار کیا تھا وہ صحیح نہیں تھا اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ علیہ السلام سیاست نہیں جانتے تھے اور حکمرانی اور فرمانروائی کے اصولوں سے باخبر نہیں تھے"۔

لوگوں کے اس قسم کے "فیصلوں" کے جواب میں خود حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہی ارشاد فرماتے ہیں: "وَلَقَدْ اَصْبَحْنَا فِي زَمَانٍ قَدِاتَّخَذَ اَكْثَرُ اَهْلِهِ الْغَدْرَ كَيْسًا" "ہم ایسے زمانے میں رہ رہے ہیں جس میں اکثر لوگوں نے دھوکہ بازی اور فریب کاری کو عقلمندی اور

سمجھداری کا نام دیتے ہیں۔

حضرت امیر علیہ السلام، معاویہ کی کارستانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرما
ہیں کہ: ''لوگ خیال کرتے ہیں کہ معاویہ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے مختلف حیلوں بہانوں کو کا
میں لاتا ہے اور یہ اس کی عقلمندی اور سیاست ہے ''وَنَسبَھُمْ اَھْلُ الْجَھْلِ فِیْہِ اِلٰی حُسْ
الْحِیْلَۃِ'' جو لوگ حقیقت الامر سے آگاہ نہیں ہیں وہ ان امور کو سیاست، حسن تدبیر اور دوراندی
سمجھتے ہیں جن کی بنیاد مکر اور فریب پر ہوتی ہے ''مَالَھُمْ قَاتَلَھُمُ اللّٰہُ'' خدا انہیں غارت کر
آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟ ''قَدْ یَرَی الْحُوَّلُ الْقُلَّبُ وَجْہَ الْحِیْلَۃِ وَدُوْنَہٗ مَانِعٌ مِنْ اَمْرِ اللّٰ
وَنَھْیِہٖ'' بسا اوقات ایک شخص سیاست دان اور مصلحت اندیش ہونے کی حیثیت سے بڑا طاق
ہے اس کے پاس کسی قسم کی کمی نہیں ہے۔ یاد رہے ''حُوَّلُ الْقُلَّبُ'' اسے کہتے ہیں جو جوڑ تو
کرنے کا ماہر ہو اور تہ و بالا کرنے کا گر جانتا ہو۔ لیکن خداوند عالم کے امر و نہی اور حدود و ضوا
شرعیہ اس کے آڑے آجاتے ہیں اور وہ ایسا نہیں کرسکتا، وہ دشمن کو پچھاڑنے کے تمام گر جانتا
کہ کس طرح اسے نیچا دکھایا جا سکتا ہے لیکن اسے خداوند عالم، شریعت مقدسہ اسلام اور تقوا
الٰہی ایسا نہیں کرنے دیتے ''فَیَدَعُمَا رَأیَ عَیْنٍ بَعْدَ الْقُدْرَۃِ عَلَیْھَا'' وہ سارے طر
جاننے کے باوجود، اطاعت خداوندی اور اقدار کی حفاظت کیلئے ایسی باتوں کی طرف توجہ نہیں کر
لیکن فرصت کے متلاشی اور ذاتی مفادات کے پجاری ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کر
''وَیَنْتَھِزُ فُرْصَتَھَا مَنْ لَّا حَرِیْجَۃَ لَہٗ فِی الدِّیْنِ'' جو دین کی پرواہ نہیں کرتے جنہیں اح
شریعت کا احساس نہیں اور اقدار اسلامی کا پاس نہیں وہ ہر قسم کے حیلے حربے سے کام لیتے ہیں
اپنے مقاصد کے حصول کیلئے ہر ذریعہ کو قابل توجیہ جانتے ہیں، لیکن میں اس طرح نہیں ہوں
مجھے چاہئے کہ احکام الٰہی کا خیال رکھوں اور شریعت مطہرہ کی پاسداری کروں، اسی لئے میں ا

مقاصد کے حصول اور فتح و کامرانی کیلئے ہر طریقے سے کام نہیں لے سکتا، کیونکہ تقویٰ اور اطاعت الٰہی مجھے مانع ہیں"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۴۱)

علی علیہ السلام کی خاموشی کے پچیس سالہ دور میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آپؑ کو خلافت کے حصول کیلئے پیش کش کر رہے تھے کہ "آپ اٹھئے ہم آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کیلئے حاضر ہیں" جو لوگ آپ کو اس قسم کی تشویق و ترغیب دلا رہے تھے ان میں سے ایک معاویہ کا باپ بھی تھا جو اسلام اور اہلبیت علیہم السلام کا شدید مخالف تھا البتہ اس کی اس قسم کی پیش کش کا سبب اس کا اپنا دکھ درد تھا، جب اس نے دیکھا کہ لوگوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی ہے اور خلافت خاندان امیہ کے ہاتھوں میں نہیں آئی اور وہ اس "سعادت" سے محروم ہو گئے ہیں تو اس نے حضرت امیر علیہ السلام کی "ہمدردی" کا راستہ اختیار کیا، اس سے اس کا مقصد اسلامی اُمہ میں انتشار پیدا کر کے اپنا مقصود حاصل کرنا تھا اور اپنے خاندان کو "کچھ" دلانا تھا، اسی لئے وہ فریب کاری کی صورت میں حضرت علی علیہ السلام کو ترغیب و تشویق دلانے لگا اور کہنے لگا: "یا علیؑ! آیئے آپ اپنا حق حاصل کرنے کیلئے اٹھئے کیونکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ ہی کو خلافت کیلئے منصوب کیا تھا، اپنا ہاتھ بڑھایئے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں"۔

البتہ ان لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو حقیقی طور پر خیر خواہی کرتے ہوئے اس قسم کی پیشکش کرنے لگے، جیسا کہ منقول ہے کہ آنحضرتؐ کے چچا جناب عباسؓ نے آپ کو اس طرح کی پیش کش کی علاوہ ازیں سلمان، ابوذر، مقداد اور عمار یاسر رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی تھے، کہ جنہوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی تھی لیکن امیر المومنین علیہ السلام کو بھی اس قسم کی پیش کش نہیں کی تھی کہ اپنا حق حاصل کرنے کیلئے اٹھئے، کیونکہ یہ لوگ صحیح معنوں میں آنجناب علیہ السلام کے یار، وفادار اور مطیع و فرمانبردار تھے، انہوں آپ کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا، وہ اچھی طرح

سمجھتے تھے کہ جو بھی مصلحت ہو گی امیر کائنات علیہ السلام وہی کریں گے۔

بہر حال امیر علیہ السلام نے ان لوگوں کے جواب میں اور اپنے حق کے ثابت کرنے کیلئے فرمایا: ''اَیُّھَا النَّاسُ! شُقُّوْا اَمْوَاجَ الْفِتَنِ بِسُفُنِ النَّجَاۃِ '' لوگو! فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں کے ذریعہ پھاڑ ڈالو!! اس وقت اسلامی اُمہ کو فتنہ کی موجیں ڈرا رہی ہیں لہٰذا ان موجوں کا مقابلہ کرنے کیلئے نجات کی کشتی کا سہارا لو اور ان موجوں کو پھاڑ ڈالو اور ختم کر دو، امت اسلامی کے درمیان اختلاف و انتشار نہ ڈالو اور اس اختلاف کا نتیجہ اسلامی معاشرہ کی تباہی میں نکلے گا۔

امیر المومنین علیہ السلام ملاحظہ فرما رہے تھے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نو بنیاد اسلامی معاشرے میں، پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے فوراً بعد آتش جنگ کے شعلے بھڑکا کر مسلمانوں میں اختلاف و انتشار پیدا کر دیں جس سے اسلامی معاشرے میں دراڑیں پڑ جائیں کہ پھر کبھی بھی اسے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکے، اسی لئے آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''وَعَرِّجُوْا عَنْ طَرِیْقِ الْمُنَافَرَۃِ '' نفرت اندوزی اور دشمنی پیدا کرنے کی راہوں سے دور ہٹ جاؤ'' وَضَعُوْا تِیْجَانَ الْمُفَاخَرَۃِ '' اور فخر و غرور کا جو تاج تم نے اپنے سروں پر سجایا ہوا ہے کہ ہم فلاں قوم سے ہیں اور فلاں قبیلے سے ہیں یا ہمیں فلاں فخر حاصل ہے ان سے تم دوسروں پر اپنی بڑی جتاتے ہو غرور کے اس تاج کو اتار پھینکو، بلکہ یہ دیکھو کہ اس حساس دورانیے میں اسلام اور مسلمین کے کیا تقاضے ہیں؟ ''ھٰذَا مَاءٌ آجِنٌ وَلُقْمَۃٌ یَغُصُّ آکِلُھَا '' یہ خلافت کا مسئلہ ایک بدمزہ پانی اور گلے میں اٹک جانے والا لقمہ ہے جو اسے نگل لے گا وہ اسے جان سے مار دے گا'' فَاِنْ اَقُلْ یَقُوْلُوْا حَرَصَ عَلَی الْمُلْکِ وَاِنْ اَسْکُتْ یَقُوْلُوْا جَزِعَ مِنَ الْمَوْتِ '' اگر میں کہتا ہوں کہ خلافت میرا حق ہے لہٰذا ان لوگوں کو چھوڑ کر میرا ساتھ دو تو کہیں گے کہ یہ باتیں دنیا، حکومت اور سلطنت کیلئے

کرر ہا ہوں اور اگر خاموش رہتا ہوں تو تمہارے جیسے لوگ کہیں گے کہ جان کے ڈر سے خاموشی اختیار کر چکا ہوں، آیا تم واقعی یہی سمجھتے ہو کہ مجھے جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں؟ ''هَيْهَاتَ بَعْدَ اللَّتَيَّا وَالَّتِيْ وَاللّٰهِ لَابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ اَنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْيِ اُمِّهٖ '' آپ لوگوں نے تو دیکھا ہوا ہے کہ میں پیغمبر اکرمؐ کے دور میں ہونے والی جنگوں میں شریک رہا اور فدا کاری کے جوہر دکھائے، اب تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں موت سے ڈرتا ہوں؟ خدا کی قسم! ابو طالب علیہ السلام کا بیٹا موت سے اس قدر مانوس ہے کہ ایک شیر خوار بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے مانوس نہیں ہوگا، مجھے اس بات کی قطعاً پروانہیں ہے بلکہ میں تو موت سے بہت مانوس ہوں، میں تو موت سے کھیلتا ہوں اور اس کے ساتھ رہ کر اپنی زندگی کے دن گزار رہا ہوں، مجھے تو ہر لمحے شہادت کا انتظار رہتا ہے، پھر بھی تم کہتے ہو کہ میں موت سے ڈر سے کوئی قدم نہیں اٹھاتا! نہ بالکل نہیں! میں تو اسلام اور مسلمانوں کے حال کو دیکھتے ہوئے خاموش ہوں۔

جبکہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کہتے تھے ''معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ کو اپنے حق کا یقین نہیں ہے، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جنگ سے بالکل نہیں ڈرتے کیونکہ وہ ایک شجاع اور بے باک انسان ہیں انہیں کسی کا خوف نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر وہ کسی قسم کا اقدام نہیں کرتے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ خلافت ان کا حق ہے اور وہ پیغمبرؐ کے برحق خلیفہ ہیں''۔

تو اس بارے میں خود امیر المومنین علیہ السلام ہی فرماتے ہیں کہ: ''مَا شَكَكْتُ فِي الْحَقِّ مُذْ اُرِيْتُهٗ '' جب سے مجھے حق دکھایا گیا ہے تب سے اب تک اس کے بارے میں لحہ بھر کیلئے شک نہیں کیا۔

آپؑ کے اس قول کی یہ تعبیر نہایت ہی قابل غور ہے وہ یہ کہ آپؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ

''مُذْ عَرَفْتَهٗ'' جب سے مجھے حق کی پہچان ہوئی ہے تب سے اب تک اس بارے شک نہیں کیا، بلکہ فرماتے ہیں: ''جب سے اسے دیکھا ہے شک نہیں کیا'' اور یہ آپ کے اس نورانی مقام و منزلت کی طرف اشارہ ہے جس کے آپؑ حامل ہیں۔

گزشتہ گفتگو میں ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام وہ ہستی ہیں جو فرشتہ وحی کو دیکھتے اور اس کی آواز کو بھی سنا کرتے تھے اور آپ ہی فرمایا کرتے تھے کہ: ''لَوْ کُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ یَقِیْنًا'' اگر تمام پردے ہٹادیئے جائیں تو بھی میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا کیونکہ مجھے کسی بارے میں شک ہی نہیں ہے، اسی لئے حضرت علی علیہ السلام وہ نہیں تھے جنہوں نے اگر اپنے حق کے حصول کیلئے اقدام نہیں کیا تو انہیں کہا جائے کہ وہ اپنے حق کے بارے میں شک رکھتے تھے۔

اس بات کو مزید واضح کرنے کیلئے آنجنابؑ اپنے حق کے حصول کیلئے کوئی قدم کیوں نہیں اٹھاتے تھے اور انہیں کس بات کا اندیشہ تھا؟ تو اس بارے خود حضرت امیر علیہ السلام ہی داستان حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پہلی زمین پر پھینکا اور وہ اژدھا بن گیا، چونکہ انہوں نے اب تک ایسی کوئی صورت حال نہیں دیکھی تھی، اسی لئے فطری طور پر قدرے خوف محسوس کیا، واقعہ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے پوچھا: ''یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا: ''یہ میرا عصا ہے، میں اس پر تکیہ لگاتا ہوں اور اس کے ذریعہ اپنی بکریوں کیلئے درختوں سے پتوں کو جھاڑتا ہوں'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اپنے اسی عصا کو زمین پر ڈالو!'' انہوں زمین پر ڈالا تو اچانک لکڑی اژدھا میں تبدیل ہوگئی، چونکہ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی دوچار نہیں ہوئے تھے اور مکمل طور پر ناگہانی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق آپؑ کو

قدرے پریشانی ہوئی، قرآن اس منظر کی یوں تصویر کشی کرتا ہے: ''فَلَمَّا رَأٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ '' پس جب انہوں نے دیکھا تو وہ سانپ کی مانند حرکت کر رہا تھا تو موسیٰ علیہ السلام پشت پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (قصص/۳۱) یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ تو پیچھے ہٹ گئے اس پر خداوند عالم کی طرف سے ارشاد ہوا: ''اَقْبِلْ وَلَاتَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ '' واپس آجاؤ اور ڈرو نہیں کیونکہ تم امان میں ہو۔ (قصص/۳۱)

اس کے علاوہ ایک اور موقع بھی ہے جہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں کے ساتھ مقابلہ کیلئے سامنا ہوا، اس بارے میں قرآن فرماتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں بھی ڈر گئے تھے اور وحشت میں مبتلا ہو گئے تھے، اس مقام پر جادوگروں نے اپنے جادو میں کمال کا مظاہرہ کیا اور قرآن مجید نے اسے ''سحر عظیم'' کے نام سے یاد کیا ہے اور کہا کہ: ''وَجَـآءُوْا بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ '' اور وہ ایک عظیم جادو لے آئے (اعراف/۱۱۶) وہ یوں کہ وہ لوگ اپنے ساتھ جادو کیلئے رسیاں اور لکڑیاں لائے تھے وہ ساری زمین پر پھینک دیں جو وہ ان کے جادو کی وجہ سے سانپ اور اژدھا کی شکل میں تبدیل ہو گئے موقع پر موجود لوگ ڈر گئے اور سوچنے لگے کہ ابھی یہ سانپ اور اژدھے ان پر حملہ کر کے انہیں اپنا شکار کیا چاہتے ہیں، یہ بڑا خطرناک منظر تھا، اسی سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے کہ، حضرت موسیٰؑ بھی ڈر گئے۔ ملاحظہ ہو: ''فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى '' پس موسیٰؑ نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا۔ (طٰہٰ/ ۶۷)

یہ ''اَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً '' وہ نہیں تھا جو پہلی مرتبہ عصا اژدھا بنتے دیکھا تھا پہلی مرتبہ چونکہ پہلا اور انوکھا واقعہ تھا اس سے قبل کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا وہ ڈر فطری اور طبعی تھا، اس لئے کہ لکڑی یکدم اژدھا بن گئی اور یہی چیز طبعی اور فطری طور پر انسان کے خوف اور ڈر کا موجب ہوتی ہے، یہ ڈر آج کل کی اصطلاح میں ایک عمل کا ردعمل یا ریفلکس (Reflex) تھا

لیکن دوسرا واقعہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے کوئی نیا نہیں تھا کہ اس سے خوف ایک فطری امر ہوتا، اس لئے کہ وہ اس سے پہلے اس طرح ایک منظر دیکھ چکے تھے اور انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا عصا اژدھا بھی بن سکتا ہے اور وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جو کچھ جادوگروں نے کیا ہے وہ جادو ہے اور اس میں حقیقت نہیں ہوا کرتی، اس کے باوجود بھی موسیٰؑ ڈر گئے، قرآن کہتا ہے: ''فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً''۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس دوسری مرتبہ ڈر گئے؟۔

تو امیر المومنین علی علیہ السلام اس سوال کا یوں جواب ارشاد فرماتے ہیں: ''لَمْ یُوْجِسْ مُوْسٰی خِیْفَۃً عَلٰی نَفْسِہٖ اَشْفَقَ مِنْ غَلَبَۃِ الْجُھَّالِ وَدِوَلِ الضَّلَالِ'' اس مرحلے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان کا خوف نہیں تھا، اور نہ ہی اپنی جان کے لئے خائف ہوئے تھے، بلکہ وہ ڈر اس بات سے گئے تھے کہ یہ عظیم جادو کہ جو ان جادوگروں نے دکھایا ہے، مبادا لوگوں کو گمراہ کردے اور ان کی ہدایت سے مانع ہو جائیں اور وہ بھی ایک وسیع وعریض میدان میں اس لئے کہ ان لوگوں کیلئے یہ عید کا دن تھا جو وہ ہر سال منایا کرتے تھے اور ایک کھلے میدان میں جمع ہو کر جشن برپا کیا کرتے تھے آج کیا دیکھ رہے ہیں کہ رسیاں اور لاٹھیاں اچانک سانپ اور اژدھے بن کر ان کے درمیان دوڑ رہے ہیں، یہ تو ایک بہت ہی عجیب اور موثر منظر تھا تو موسیٰ علیہ السلام کو ڈر اس بات کا محسوس ہوا کہ عوام الناس محض اس منظر کو دیکھ کر ہی فرار کر جائیں اور اس بات کا بھی انتظار نہ کریں کہ دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ کون غالب آتا ہے کون مغلوب؟ کون حق پر ہے اور کون باطل پر؟ ''لَمْ یُوْجِسْ مُوْسٰی خِیْفَۃً عَلٰی نَفْسِہٖ اَشْفَقَ مِنْ غَلَبَۃِ الْجُھَّالِ وَدِوَلِ الضَّلَالِ'' (نہج البلاغہ خطبہ ۴) وہ ڈرے اس بات سے تھے مبادا وہ جاہل کامیاب

ہو جائیں اور گمراہی عام ہو جائے اور اس بات کی نوبت ہی نہ آئے کہ آنجناب اس بات کو ثابت کریں اور ان کے سامنے واضح کر دیں کہ ان لوگوں کا یہ کام سب جادو ہے اور میرا کارنامہ ایک معجزہ ہے اور میں ہی حق پر ہوں اور یہی وہ موقع تھا جب انہیں پروردگار عالم کی طرف سے خطاب ہوا: ''ڈرو نہیں! تم بھی فوراً اپنے عصا کو زمین پر ڈالو جو اژدھا بن کر ان سب کو نگل جائے گا''۔

❖ حضرت علی علیہ السلام کا فلسفہ سکوت و جنگ ❖

حضرت علی علیہ السلام کا اس جملہ کے نقل کرنے کا مقصد اس بات کی طرف اشارہ کرنا تھا کہ مسئلہ خلافت میں میرا سکوت، موت کے ڈر سے نہیں تھا، جب میں نے دیکھا کہ خلافت دوسرے لوگوں کے پاس چلی گئی ہے مجھے اپنی جان کا خوف نہیں تھا کہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور تلوار نہیں اٹھائی، بلکہ میں تو لوگوں کے گمراہ ہونے سے ڈر گیا اور مجھے اس بات کا خوف لاحق ہو گیا کہ لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ: ''ہر شخص مُلک و مال کی دوڑ میں ہے اور اقتدار کا بھوکا ہے، حق یا ناحق والی کوئی بات ہی نہیں ہے، اگر یہ آپس میں لڑ رہے ہیں تو اس لئے کہ ہر کوئی ''رئیس مملکت'' بننا چاہتا ہے'' میرا ڈر تو اس لئے تھا کہ یہ مسئلہ لوگوں کی گمراہی کا باعث بن جائے گا، اور دین اپنی حقیقت کھو بیٹھے گا، اسی لئے میں نے خاموشی اختیار کر لی اور ایک گوشے میں بیٹھ گیا نہ اس لئے کہ میں موت سے ڈر گیا تھا۔

خود آپ ہی ایک جگہ پر فرماتے ہیں کہ: ''اَمَّا قَوْلُکُمْ اَکُلُّ ذَالِکَ کِرَاهِیَةً لِلْمَوْتِ فَوَاللّٰهِ مَااُبَالِی دَخَلْتُ اِلَی الْمَوْتِ اَوْخَرَجَ الْمَوْتُ اِلَیَّ'' تمہاری یہ باتیں کہ میں نے جو خاموشی اختیار کر لی ہے، صلح و سکوت کے ساتھ رہ رہا ہوں اور تلوار نہیں اٹھائی، اس لئے ہیں کہ میں موت سے ڈرتا ہوں اور اس بات کا خوف ہے کہ کہیں مارا نہ جاؤں، خدا کی قسم علیؑ کو

اس بات کا خوف نہیں ہے کہ وہ موت کی طرف چل دے یا موت اس کی طرف آ جائے، میرے لئے اس بات میں فرق نہیں ہے کہ میں موت کی طرف چلا جاؤں اور اسے گلے لگا لوں یا موت میری طرف آ جائے اور مجھے اپنی لپیٹ میں لے لے تو پھر ایسی صورت میں کوئی شخص موت کے خوف سے اپنے فریضہ کی انجام دہی میں کسی قسم کی کوتاہی کر سکتا ہے؟ تم ایک اور بات بھی کرتے ہو وہ یہ کہ ''اَمَّا قَوْلُكُمْ شَكًّا فِي اَهْلِ الشَّامِ'' تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ ''آیا آپ شامیوں اور معاویہ سے ساتھ جنگ کرنے میں کسی قسم کے شک وشبہ کا شکار ہوں؟ نہیں تو پھر جلد ہی لشکر تیار کر کے شام اور صفین کو جائیں اور جلد ہی معاویہ کا کام تمام کر دیں'' تو حضرت ان لوگوں کے جواب میں فرماتے ہیں: ''اگر میں اس کام میں تاخیر کر رہا ہوں، جلد کوئی قدم نہیں اٹھاتا خط و کتابت اور بحث و مباحثہ میں وقت گزار رہا ہوں اس وجہ سے نہیں کہ مجھے ان کے ساتھ جنگ کرنے میں کسی قسم کا شک وشبہ ہے، یہ ٹھیک ہے کہ مجھے اس بات کا حق حاصل ہے کہ جو لوگ اسلامی حکومت کے خلاف خروج کریں میں ان کے ساتھ جنگ کروں اور ان کا کام تمام کر دوں، لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے افراد ہدایت پا جائیں۔ خواہ ایک فرد ہی کیوں نہ ہو۔ میں انہیں غور و فکر کرنے کیلئے وقت دوں، تا کہ جن لوگوں کیلئے حقیقت حال ابھی تک واضح نہیں ہو سکی وہ آگاہ ہو جائیں اور بصیرت کی بنا پر ہی آگے بڑھیں، شاید ان لوگوں میں ایسے بھی ہوں جنہوں نے ابھی تک حق ہی کو ٹھیک صورت میں نہ پہچانا ہو اور ان پر حجت تمام نہ ہوئی ہو، میری ساری کوشش یہی ہے کہ میں لوگوں کو راہ راست کی ہدایت کروں لیکن مجھے یقین ہو جائے گا کہ یہ لوگ قابل ہدایت نہیں ہیں، تو پھر جنگ کیلئے ہی اقدام کروں گا''۔

رہی تمہاری یہ بات کہ ''اَمَّا قَوْلُكُمْ شَكًّا فِي اَهْلِ الشَّامِ فَوَاللّٰهِ مَادَفَعْتُ الْحَرْبَ يَوْمًا اِلَّا وَاَنَا اَطْمَعُ اَنْ تَلْحَقَ بِي طَائِفَةٌ فَتَهْتَدِيَ بِي وَتَعْشُوْا اِلٰى ضَوْئِي''

میں جس قدر بھی جنگ کو التوا میں ڈال رہا ہوں اس لئے نہیں کہ مجھے ان کے ساتھ جنگ کے بارے میں کوئی شک ہے بلکہ اس امید پر کہ شاید کوئی فرد راہ راست پر آجائے اور تاریکی سے نکل کر روشنی میں چلنے لگے، یہ لوگ اندھیری رات کے گھپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارہ رہے ہیں اور گمراہ ہو چکے ہیں، مجھے یہ امید ہے کہ شاید رات کی اس تاریکی میں حق کو پہچان لیں اور میری جانب آجائیں" وَذَالِکَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَقْتُلَهَا عَلٰی ضِلَالِهَا وَاِنْ کَانَتْ تَبُوْءَ بِـآثَامِهَا " میرے لئے نہایت ہی پسندیدہ ہے یہ بات کہ ان میں سے کوئی ایک شخص راہ ہدایت پر آجائے، بجائے اس کے کہ میں اسے گمراہی کی حالت میں تہ تیغ کروں، اگر چہ زمین پر ان کا بوجھ ان کے گناہوں سے زیادہ بوجھل ہے اور وہ قتل کئے جانے کے حقدار ہو چکے ہیں۔

بنابریں اگر حضرت امیر علیہ السلام کسی موقع پر صلح وسکوت کی راہ کو اختیار کرتے ہیں اور جنگ کا نام نہیں لیتے، تو ان کا نظریہ صرف اور صرف یہی ہوتا ہے کہ "اسلام" اور "اسلامی اُمّہ" محفوظ رہیں، لیکن جب دیکھتے ہیں کہ صرف جنگ ہی راہ چارہ رہ گئی ہے اور یہی تشخیص دیتے ہیں تو پھر کسی قسم کی رورعایت کے بغیر اس کیلئے اقدام کرتے ہیں۔

اس بارے میں ہم آنجنابؑ کا قول پہلے ہی نقل کر چکے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا اب حالات یہ رخ اختیار کر چکے ہیں اگر میں جنگ کیلئے کوئی اقدام نہیں کرتا تو پھر کفر کے سوا کوئی اور راستہ باقی نہیں ہے: "وَلَقَدْ ضَرَبْتُ اَنْفَ هٰذَاالْاَمْرِ وَعَیْنَهٗ وَقَلَّبْتُ ظَهْرَهٗ وَبَطْنَهٖ فَلَمْ اَرَلِی اِلَّا الْقِتَالَ اَوِالْکُفْرَ بِمَا جَاءَ مُحَمَّدٌ صلی اللّٰہ علیه و آله وسلم اَنَّهٗ قَدْکَانَ عَلَی الْاُمَّةِ وَاِنْ اَحْدَثَ اَحْدَاثًا وَاَوْجَدَ لِلنَّاسِ مَقَالاً فَقَالُوْا ثُمَّ نَقَمُوْا فَغَیَّرُوْا "(نہج البلاغہ خطبہ۴۳)

یہ تعبیر تو بہت ہی عجیب ہے، خاص کر ان افراد کے مذاق کے تو بالکل ہی خلاف ہے جو

دورِ حاضر کے افکار اور مغربی ثقافت کے دلدادہ ہیں، انہیں تو یہ بات قطعاً پسند نہیں آئے گی کیونکہ ان کے نظریہ کے مطابق دین کے بارے میں تو کبھی دست و گریبان نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ چاہیے کہ ہمیشہ، ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ دشمنان دین کے ساتھ ملنا چاہیئے اور چشم پوشی سے کام لینا چاہیئے اور اگر ان حضرات کے ساتھ کوئی شخص سیاست اور اقتدار کے مقابلے میں آتا ہے تو اس کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں وہاں پر چشم پوشی اور ہنسی مسکراہٹ کی بات بھول جاتی ہے، صرف دینکے بارے میں مغربی ثقافت کے مقلد ہیں وہ یہ سبق دیتے ہیں کہ دین کے بارے میں چشم پوشی سے کام لیا جائے، دین کو جنگ کا پیش خیمہ نہ بنایا جائے، ایک دوسرے سے بنا کر رہا جائے بگاڑ کر نہیں، آپس میں مل کر رہو، ہنسو مسکراؤ، سنو اور سناؤ مگر دین کے مسئلے پر جنگ نہ کرو۔

اس زمانے میں بھی کچھ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ: ''حضرت علی علیہ السلام اور طلحہ و زبیر آپس میں رشتہ دار ہیں انہیں چاہیئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں، آپس میں کیونکر لڑتے ہیں؟ اس قدر خون کیوں بہاتے ہیں؟'' حضرت امیر علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں: ''وَلَقَدْ ضَرَبْتُ اَنْفَ هٰذَا الْاَمْرِ وَعَيْنَهُ'' میں نے اس مسئلے کی آنکھوں اور کانوں کو اوپر نیچے کر کے دیکھا ہے کہ مجھے ان حالات میں کیا کرنا چاہیئے؟ ''وَقَلَّبْتُ ظَهْرَهُ وَبَطْنَهُ'' اس کے پچھلے اور سامنے والے حصے کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا ہے اور اس کی ہر طرح سے تحقیق اور جانچ پڑتال کی ہے، ایسا نہیں ہے کہ میں نے کسی جلد بازی سے کام لیا ہے اور کسی غور و فکر اور تدبیر و تدبر سے کام نہیں لیا اور نہ ہی کسی عجلت میں فیصلہ کیا ہے: ''فَلَمْ اَرَلِی اِلَّا الْقِتَالَ اَوِ الْكُفْرَ'' ہزار بار سوچنے اور جائزہ لینے کے بعد اور مسئلے کی تمام اطراف کو جانچنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے سامنے صرف اور صرف (۲) دو راہیں ہیں ا۔ جنگ ۲۔ کفر۔

اگر میں چاہتا ہوں کہ دین اسلام پر باقی رہوں تو اس نابکار ٹولے کے ساتھ جنگ کے

سوا کوئی چارہ نہیں ہے، کیونکہ یہ لوگ جو بدعتیں اور تحریفیں دین میں لا رہے ہیں اس سے تو وہ بتدریج دین اسلام کا ستیاناس کر دیں گے اور اسے تباہ و برباد کر دیں گے لہٰذا میرا شرعی فریضہ بنتا ہے کہ میں ان لوگوں کے ساتھ جنگ کروں، اگر کوتاہی کرتا ہوں تو اسلام کا منکر بنتا ہوں اور حکم خداوندی کا انکار کرتا ہوں۔

اس طرح کے الفاظ ایک اور خطبہ میں فرماتے ہیں: ''وَلَقَدْ قَلَّبْتُ هٰذَا الْاَمْرَ بَطْنَهُ وَظَهْرَهُ حَتّٰى مَنَعَنِي النَّوْمُ'' میں نے اس معاملے میں اس قدر غور و خوض سے کام لیا ہے کہ میری رات کی نیندیں اڑ گئی ہیں، راتوں کو جاگ جاگ کر اس بارے میں سوچتا ہوں اور اس فکر میں تھا کہ آیا کوئی راہ چارہ ہے کہ جسے اختیار کر کے جنگ کی تباہ کاریوں سے بچا جا سکتا ہے؟ ''فَمَا يَسَعُنِيْ اِلَّا قِتَالُهُمْ اَوِالْجُحُوْدُ بِمَا جَاءَ بِهٖ مُحَمَّدٌ صلی اللّٰه علیه وآله وسلم'' میں جس قدر بھی جستجو کی ہے مجھے دو سے زیادہ راستے نظر نہیں آئے، جنگ یا جحود۔

یہاں پر آپ علیہ السلام نے عجیب و غریب ارشاد فرمایا ہے جو پہلے خطبہ کے جملہ سے زیادہ شدید ہے کیونکہ اُس میں آپ نے فرمایا جنگ یا کفر، یہاں فرماتے ہیں جنگ یا جحود!!۔

کفر اور جحود میں فرق ہے اور وہ یہ کہ کفر مطلق انکار اور نہ ماننے کو کہتے ہیں، جبکہ جحود کے معنی ہیں سوچتے، سمجھتے، جانتے بوجھتے ہوئے عناد و دشمنی پر ڈٹے رہنا اور سب حقائق کا انکار کرنا، گویا آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر جنگ نہیں کرتا تو پھر دین خداوندی کے ساتھ دشمنی برتوں اور جان بوجھ کر دین کو پامال کروں ''فَكَانَتْ مُعَالَجَةُ الْقِتَالِ اَهْوَنَ مِنْ مُعَالِجَةِ الْعِقَابِ'' میرے میدان جنگ میں اترنا عذاب خداوندی کے مول لینے سے زیادہ آسان ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی سب سے بڑی مشکل

وہی دوا ۔ اور ۔ وہی ناسور

جنگ صفین میں جب معاملہ ''حکمیت'' تک جا پہنچا اور حضرت علی علیہ السلام ابتدا میں چونکہ اس تجویز کو ٹھکرا چکے تھے مگر اس کے برعکس نادان، سادہ لوح تقدس مآب جو کہ عمرو بن عاص کے دام فریب میں پھنس چکے تھے انہوں نے آپؑ پر دباؤ ڈالا کہ آپ حکمیت کو قبول کرلیں اور آپ نے اسے مجبوراً قبول بھی کرلیا اور اس طرح کے سادہ لوح تقدس مآب ہمیشہ سے چلے آرہے ہیں ایران میں شاہی دور حکومت میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو کہتے تھے کہ ''محمد رضا شاہ کی غیبت نہ کرو کیونکہ وہ شیعہ ہے'' (از مترجم:۔ ہمارے ملک میں بھی اس قسم کے لوگوں کی کمی نہیں، جو علماء کی تو مخالفت کرتے ہیں لیکن بدکردار لوگوں کے قصیدے گاتے اور گمراہ کن لوگوں کی ثنا خوانی میں رطب اللسان رہتے ہیں) اور آج بھی ایسے لوگ ہیں جو علی الاعلان اسلامی احکام کی خلاف ورزی کی طرف داری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''روزے کی حالت میں ان کی غیبت نہ کرو کیونکہ یہ اسلامی کابینہ کا وزیر ہے''۔

ایسے ہی ''مقدس'' قسم کے لوگ جنگ صفین میں حضرتؑ کے گرد جمع ہوگئے اور اس قدر آپؑ پر دباؤ ڈالا نزدیک تھا کہ آپ شہید کردیئے جاتے، یہی وجہ ہے کہ حضرت نے مالک اشترؓ کو پیغام بھیجا کہ:

''اگر علیؑ کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو فوراً واپس آجاؤ''

یہی مقدس لوگ کہتے تھے کہ ''ہم قرآن کے ساتھ جنگ نہیں کرسکتے'' لشکر شام نے قرآن کو نیزوں پر اٹھایا ہوا ہے اور قرآن کے فیصلے پر راضی ہو چکے ہیں، للہذا آپ بھی اسے قبول کرلیں''۔

حضرتؑ نے ان سے فرمایا: "اَنَا الْقُرْآنُ النَّاطِقُ" "قرآن ناطق اور مفسر قرآن میں ہوں اور یہ جو نیزوں پر اٹھایا ہوا ہے وہ کاغذ اور سیاہی کے علاوہ اور کچھ نہیں"۔

ان لوگوں نے کہا: "ہم اور کچھ نہیں جانتے، جو قرآن کہے گا وہ ہمیں قبول ہے" جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علی علیہ السلام حَکَم بنانے پر مجبور ہو گئے۔

جب یہ مسئلہ حل ہو گیا تو اس بات کی باری آئی کہ حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے "حَکَم" (فیصلہ دینے والا) کسے بنایا جائے؟ پھر وہی جاہل مقدس آگے آئے اور اس بات پر اصرار کیا کہ "ابوموسیٰ اشعری" ہی کو ہونا چاہیئے، حضرت علی علیہ السلام جتنا کہتے رہے کہ: "ابن عباسؓ کو حَکَم ہونا چاہیئے" مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

حَکَم بنانے کے بعد وہی لوگ جنہوں نے حضرتؑ پر حَکَمیت کو قبول کرنے کیلئے دباؤ ڈالا تھا، بگڑ اور کہنے لگے "آپؑ نے (نعوذ باللہ) غلطی کی ہے، حَکَمیت کو قبول کر لینے کے بعد آپؑ کافر ہو گئے ہیں لہٰذا اس سے توبہ کر کے دوبارہ معاویہ کے ساتھ لڑنے کیلئے میدان میں آئیں"۔

امام عالیمقام علیہ السلام نے فرمایا: "تم ہی نے تو مجھ پر دباؤ ڈالا تھا اور ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا، اب تو چونکہ میں قول دے چکا ہوں اور عہد و پیمان باندھ لیا ہے، ایک اسلامی حکمران کے شایانِ شان یہ بات نہیں ہے کہ وہ اپنے پیمان پر عمل نہ کرے، یہ بات تو قطعاً مناسب نہیں ہے"۔

وہ کہنے لگے "اگر آپ ہماری بات نہیں مانتے اور توبہ نہیں کرتے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کافر ہو گئے ہیں"۔

جی ہاں! یہی بات تو خون کے آنسو رلاتی ہے کہ یہ شام کا لشکر اور معاویہ کے طرفدار نہیں ہیں بلکہ خود آنجنابؑ کے "ساتھی" اور فوجی ہیں جو دین و مذہب اور شرم و حیا کو ایک طرف ڈال کر

علی بن ابی طالب علیہ السلام کے مقابلے میں آگئے ہیں، سچ مچ آپ خود ہی بتایئے کہ علیؑ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرے؟

بہرصورت جب تمام قضیئے ختم ہوگئے اور جو لوگ کسی حد تک زیادہ ''صاحب انصاف'' تھے اور حضرت علی علیہ السلام کو کفر کی تہمت سے متہم نہیں کیا تھا، انہوں نے بھی آپؑ پر یہ اعتراض ضرور کیا کہ: ''ایک دن تو آپؑ نے کہا تھا میں حکمیت کو قبول نہیں کرتا، پھر کہنے لگ گئے کہ قبول کرتا ہوں، یہی مسئلہ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ آپؑ کے کون سے موقف کو زیادہ صحیح مانیں؟''۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک خاص قلبی سوز کے ساتھ ان کے جواب میں فرمایا:
''اَمَا وَاللّٰهِ لَوْاَنِّی حِیْنَ اَمَرْتُكُمْ بِمَا اَمَرْتُكُمْ بِهٖ حَمَلْتُكُمْ عَلَى الْمَكْرُوْهِ الَّذِیْ يَجْعَلُ اللّٰهُ فِیْهِ خَيْرًا فَاِنِ اسْتَقَمْتُمْ هَدَيْتُكُمْ وَاِنْ اعْوَجَجْتُمْ قَوَّمْتُكُمْ وَاِنْ اَبَيْتُمْ تَدَارَكْتُكُمْ لَكَانَتِ الْوُثْقٰى وَلٰكِنْ بِمَنْ وَاِلٰى مَنْ؟'' اگر اس وقت جبکہ میں نے تمہیں جنگ کرنے کا حکم دیا تھا۔ البتہ تم اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے حالانکہ خداوند عالم نے تمہاری بہتری اسی میں مقرر کی ہوئی تھی۔ اگر تم سیدھے راستے پر چلتے میں تمہاری امداد کرتا، اگر منحرف ہوجاتے تو تمہیں سیدھا کرتا اور تمہاری رہنمائی کرتا اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح آگے چلتا رہتا تو یہ مشکلات بھی درپیش نہ آتیں، لیکن میں تمہیں کس طاقت سے آمادہ کروں کہ تم جنگ کرو میں تو چاہتا تھا کہ جنگ جاری رہے اور مالک اشتر کی کامیابی سے چند قدم رہ گئے تھے، اس قدر سختیاں جھیلنے کے بعد جب ہم آگے بڑھتے تو جنگ کا نتیجہ بھی حاصل کرتے، لیکن تم نے مجھے آگے چلنے نہیں دیا اور دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ میں حکمیت کو قبول کروں! اگر میں اسے قبول نہ کرتا تو کس طرح اور کس طاقت کے ساتھ تمہارا مقابلہ کرسکتا تھا؟ اور ساتھ ہی کس قوت کے بل بوتے پر معاویہ سے جنگ کرتا رہتا؟ ''لٰكِنْ بِمَنْ وَاِلٰى مَنْ؟'' کن لوگوں کے ساتھ اور کونسی قوت کے ساتھ، کس سپاہ کے

ساتھ؟ کس کی امید کے ساتھ؟ ''اُرِیْدُ اَنْ اُدَاوِیَ بِکُمْ وَاَنْتُمْ دَائِی '' میں تو چاہتا تھا کہ تمہیں معاشرتی بیماریوں کا علاج قرار دوں اور تمہارے ذریعہ سے اس معاشرے کی - جو ایک غیر اسلامی ظالم حاکم کا وجود ہے - دوا کروں، لیکن تم خود ہی میرے لئے ایک ناسور بن گئے ہو، جب دوا ہی خود بیماری بن جائے تو اس کا کس دوا کے ذریعہ علاج کیا جا سکتا ہے؟ ''کَنَاقِشِ الشَّوْکَةِ بِالشَّوْکَةِ وَهُوَ یَعْلَمُ اَنَّ ضَلْعَهَا مَعَهَا '' (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۰) یہ تو ایسے ہے جیسے کسی بدن میں کانٹا چبھ جائے اور وہ اسے ایک اور کانٹے سے باہر نکالے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کانٹا............

میں اب درد کا علاج ان لوگوں کے ذریعہ کر رہا ہوں جو خود درد ہیں، اسی لئے تو مجھے خون دل پینا پڑ گیا ہے اور زہر کا پیالہ پی کر میں نے حکمیت کو قبول کیا ہے۔

یہ تھا حضرت امیر علیہ السلام کی فرمائشات کا کچھ حصہ اس بارے میں کہ آنجناب کبھی تو جنگ کرتے ہیں اور کبھی جنگ سے دستکشی اختیار کر لیتے ہیں اور سکوت و صلح کی راہ کو اختیار کر لیتے ہیں۔

جنگ سے آپؑ کا اباء و امتناع دو مرحلوں میں تھا، ایک تو خلفائے ثلاثہ کے ایام حکومت میں اور لوگوں کا آپ کی بیعت کرنے سے پہلے کے عرصے میں اور دوسرے جنگ صفین میں حکمیت کو قبول کر لینے کے بعد، اس عرصہ میں کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ آنجنابؑ موت کے ڈر سے سکوت اختیار کیئے ہوئے ہیں، کچھ کہتے تھے چونکہ آپؑ کو اپنے شرعی فریضہ پر ہی یقین نہیں اور آپؑ اس بارے میں شک میں مبتلا ہیں، لہٰذا جنگ کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔

حضرت نے پہلے گروہ کے جواب میں فرمایا: ''میں وہ نہیں ہوں جو جنگ سے ڈر جاؤں'' دوسرے گروہ کے جواب میں فرمایا: ''میں وہ ہوں کہ جسے جب سے حق و حقیقت دکھائی گئی ہے، اس وقت سے میرے یقین میں کوئی فرق نہیں آیا''۔

حضرتؑ کے ۲۵ سالہ صبر کے بارے اجانب پرستوں کی غلط تاویل

ان ایام میں، خلفائے ثلاثہ کے دور میں حضرتؑ کے ۲۵ سالہ صبر وسکوت کی ایک
تاویل پیش کی جارہی ہے اور وہ یہ کہ "حضرت علی علیہ السلام نے خلفائے ثلاثہ کے دور میں
میں سے کسی کے ساتھ اس لئے جنگ نہیں کی کیونکہ شرعاً آپؑ کیلیئے ان سے جنگ جائز نہیں
کیونکہ ان ۲۵ سالوں میں آپ کی حقیقی اور اور برحق حکومت بالکل نہیں تھی جس کے حاصل کر
کیلیئے آپ کوئی اقدام کرتے"۔

باالفاظ دیگر "ان ۲۵ سالوں میں آپ کی حکومت بالکل شرعی حیثیت کی حامل نہیں
کیونکہ حکومت اس وقت شرعی حیثیت اختیار کرتی ہے جب عوام کسی کی بیعت کریں چونکہ
پچیس سالہ دور میں لوگوں نے کسی بھی وقت آپ علیہ السلام کی بیعت نہیں کی اور چونکہ عوا
ہوتے ہیں جو کسی کو حکومت کرنے کا حق دیتے ہیں اور چونکہ پچیس سالوں میں لوگوں نے آ
حکومت کرنے کا حق نہیں دیا لہٰذا حضرتؑ کا حق بھی نہیں بنتا تھا کہ اس بارے کوئی قدم اٹھائیں

یہ ہے امیر المومنین علی علیہ السلام کے ۲۵ سالہ کردار کے بارے میں ایک
سوچ" جو آج کل "جدید سوچ کے حامل شیعوں" کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، حالانکہ چو
سال سے علمائے شیعہ یہ کوشش کرتے چلے آرہے ہیں کہ لوگوں کو بتائیں کہ حضرت علی علیہ ا
کی خلافت ایک الٰہی منصب ہے جس کا اعلان خود جناب رسول خداؐ نے غدیر خم کے میدان
خداوند عالم کے اس تاکیدی حکم کے بعد فرمایا تھا: "یَاأَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَیْکَ
رَّبِکَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ" (مائدہ/۶۷) اس آیت مجیدہ کے پیش نظ
مسئلے کی اہمیت اس حد تک تھی کہ اگر حضرت رسالتمآبؐ اپنے اس نبوی فریضے کو انجام نہ دیتے

خدا کی طرف سے علیؑ کی خلافت و جانشینی کا اعلان نہ کرتے تو قطعاً رسالت کا کوئی کام ہی انجام نہ دیتے ، کیونکہ رسالت الٰہی ایک مجموعہ ہے جس کی آخری خبر امیر المومنین علی علیہ السلام کی ولایت اور خلافت کا اعلان تھا، جس کے بغیر رسالت کی ساری کوششیں بیکار ہو جاتیں اور رسالت پیغمبر اسلامؐ کا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوتا اور اس دوران میں جو چیز زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور جس پر علمائے شیعہ صدیوں سے تاکید کرتے چلے آرہے ہیں وہ یہ کہ:

''اسلامی امہ کی رہبری ، ولایت اور خلافت ایک ایسا امر ہے جس کا تعلق خداوند عالم کے ''منصوب'' کرنے سے ہے لوگوں کے ''منتخب'' کرنے سے نہیں یعنی خلافت ''انتصابی'' ہے ''انتخابی'' نہیں''۔

حاکم شرعی وہی ہوتا ہے جسے خدا نے نصب فرمایا ہو

گزشتہ چودہ سو سال سے شیعہ اور اہل سنت کا اصلی اور بنیادی اختلاف ہی امام، رہبر اور خلیفہ کے ''انتصاب'' اور ''انتخاب'' پر ہے، البتہ کچھ فقہی اور دوسرے مسائل میں بھی اختلاف ہے جس نے شیعہ کو مسلمانوں کے دوسرے فرقوں سے جدا کیا ہوا ہے اور جس سے شیعیت کی پہچان ہوتی ہے وہ یہی کہ مذہب شیعہ حضرت علی علیہ السلام کی بلکہ کلی طور پر امامت کے مسئلہ کو خداوند عالم کی طرف سے نصب اور تعین کو لازم سمجھتے ہیں یعنی امام، رہبر اور خلیفہ کا نصب اور متعین کرنا خدا کا ہی کام ہے، بندوں کو اس بارے کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

اس کے برعکس آج کل کے کچھ نام نہاد شیعہ ''تشیع کے دفاع'' کے نام سے یہ لاف زنی کر رہے ہیں کہ ''پچیس سال کے عرصے میں حضرت علیؑ کو کسی قسم کا حق خلافت حاصل نہیں تھا کیونکہ حکومت کرنے کا حق عوام الناس کو حاصل ہے اور عوام جس کو چاہیں یہ حق دیدیں حتی کہ اگر

جناب رسولِ خداؐ بھی حاکم تھے تو لوگوں نے آپ کو یہ حق دیا ہوا تھا ورنہ آپ تو صرف اللہ کے رسول ہی تھے، لوگوں پر حاکم نہیں تھے"۔

جی ہاں! دیکھ لیا ان لوگوں کے افکار و عقیدہ کو؟ حالانکہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: "اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ" "پیغمبرؐ کو تمام مومنین پر اولیٰ بالتصرف ہونے کا حق حاصل ہے (احزاب/٦) لیکن یہ کج اندیش یہ کہتے ہیں کہ اگر عوام حضورؐ کو حقِ حکومت عطا نہ کرتے تو آپ کو بھی لوگوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں تھا اور حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بھی ان کے یہی افکار ہیں وہ کہتے ہیں کہ "اگر چہ پیغمبر خداؐ نے انہیں خلافت کے لیے متعارف کرایا لیکن چونکہ لوگوں نے آپؑ کو ووٹ نہیں دیئے اور قبول نہیں کیا لہٰذا آپؑ خلیفہ نہیں بن سکتے تھے"۔

ان لوگوں کی نگاہ میں "امر خلافت و امامت" بھی "صدر جمہوریہ" کے انتخاب کی مانند ہے جو دور حاضر میں رائج ہے، بطور مثال فرض کیجئے - بلاتشبیہ - اگر حضرت امام خمینی رحمہ اللہ یا رہبر معظم خامنہ ای مدظلہ کسی شخص کی لیاقت اور شائستگی کے پیش نظر اسے عہدہ صدارت کے لیے منصوب کرتے ہیں، لیکن عوام الناس رائے نہیں دیتی تو صدر مملکت نہیں بن سکتا، اسی طرح - بلاتشبیہ - حضرت رسول خداؐ نے بھی حضرت علی علیہ السلام کی طرف اشارہ تو کر دیا تھا کہ بہتر ہے کہ میرے بعد علیؑ کو میرا جانشین اور خلیفہ کے طور پر انتخاب کر لینا، لیکن چونکہ لوگوں نے انہیں قبول نہیں کیا لہٰذا حضرت کو خلافت کا حق نہیں پہنچتا، اب ان کیلئے صرف یہی چارہ رہ گیا تھا کہ "حکومت خلفاء" کو تسلیم کر کے خاموش ہو جائیں اور اکثریت کی رائے کا احترام کریں اور یہ اسی اصول کا تقاضا بھی ہے کہ "عوام کی حکومت عوام کے اوپر"۔

یہ شبہ جو "علمی" رنگ میں پیش کیا جاتا ہے، یقیناً اسے دور حاضر کے شیطانی شکوک

شبہات میں شمار کیا جائے گا، شیطان نے انسان کوفریب دینے کیلئے ہزاروں سال کے تجربے کے بعد اپنے استادی کے فن کو انتہا تک پہنچا دیا اور دین کے بارے میں نئی سوچ کے قالب میں اپنے دوستوں کو یوں سبق پڑھایا ہے کہ ''حضرت علیؑ کو ابتدا میں حکومت کرنے کا حق بالکل ہی حاصل نہیں تھا، اور صرف اس وقت انہیں یہ حق حاصل ہوا جب لوگوں نے ان کی بیعت کی'' شیطان کا یہ سبق ایسی حالت میں ہے جبکہ شیعیت کا قطعی عقیدہ یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے خود حضرت علیؑ کو رسول پاکؐ کا جانشین مقرر فرمایا ہے اور اس بارے کسی کو بھی حتی کہ خود رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی رسالت کا جانشین مقرر کرنیکا حق حاصل نہیں ہے، آنحضرتؐ کا فریضہ اس بارے صرف یہی تھا کہ خدائی فیصلے کا لوگوں میں اعلان کر دیں اور بس'' لیکن اس حد تک بھی آنحضرتؐ کو یہ خوف تھا کہ اگر اس کا اظہار کریں گے تو لوگ اسے قبول نہیں کریں گے اور ان کے درمیان اختلاف کھڑا ہو جائے گا، البتہ آپ کا ڈرنا بھی برحق تھا، کیونکہ حضرت علی علیہ السلام مختلف جنگوں میں بہت سے سردار قریش کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے جو اسلام کے سدراہ بنے ہوئے تھے، اسی وجہ سے علی علیہ السلام کی دشمنی آتش کینہ بن کر ان کے دلوں میں بہت شعلہ ور تھی۔

اس بارے میں علامہ ابن ابی الحدید معتزلی کا ایک بہترین جملہ ہے وہ فرماتے ہیں:

''میں نے اپنے استاد سے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں اس قدر سفارش اور تاکید کی اور جو مسلمان آنحضرتؐ کے ساتھ رہ کر جانثاری اور فداکاری کے جوہر دکھاتے رہے، اہل نماز روزہ تھے، حضورؐ کے رکاب میں جہاد کیا، لیکن حضرت علی علیہ السلام کو چھوڑ دیا؟'' تو انہوں نے جواب دیا کہ: ''تم نے مجھ سے عجیب سوال کیا ہے، میں تو اس بات پر تعجب کر رہا ہوں کہ، حضرت رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کو قتل کیوں نہیں کر دیا؟ اور اگر وفات پیغمبرؐ کے بعد وہ لوگ انہیں

شہید کردیتے تو ایسا کر سکتے تھے، آیا تم نہیں جانتے کہ حضرت علی علیہ السلام نے جنگوں میں قریش کے ستر ۷۰ سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا (صرف جنگ بدر میں معاویہ کا بھائی، ماموں اور نانا تینوں کے تینوں آپؑ کی تیغ سے فنا کے گھاٹ اترے تھے) یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اس انتظار میں تھے کہ کہیں موقع ملے اور اپنے عزیزوں کے خون کا بدلہ علیؑ کو قتل کر کے ان سے لیں''۔

استاد نے کہا: ''جہاں تک میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کو قتل اس لئے نہیں کیا کہ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ علیؑ اب گوشہ نشین ہونے پر مجبور کر دیا گیا ہے، سیاست میں ان کا عمل دخل بالکل نہیں رہا، کیونکہ پورے ۲۵ سال کے عرصے میں ان کا کام عبادت، قرآن اور زراعت وغیرہ تھا، حتی کہ اس عرصہ میں ہونے والی کسی جنگ میں بھی شرکت نہیں کی، اسی لئے لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب انہیں قتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کا معاشرہ میں ہونا نہ ہونا برابر ہے، نہ ان کا کسی کام ہے نہ کسی کو ان سے سروکار ہے، اسی وجہ سے انہیں قتل نہیں کیا، ورنہ ضرور قتل کر دیتے''۔

خود حضرت علی علیہ السلام نے ماجرائے سقیفہ کے جب انہیں زبردستی بیعت کرنے کیلئے لے جایا جانے لگا تو قبر پیغمبرؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ کَادُوْ یَقْتُلُوْنَنِیْ'' قوم نے مجھے کمزور سمجھ لیا ہے اور قریب ہے کہ مجھے قتل کر دیں (اعراف/۱۵۰) اور یہ وہ جملہ ہے جو حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے ماجرا کے بعد حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا۔ (بحار الانوار جلد ۲۸ باب ۴ روایت ۱۰، ۱۴، ۲۷، ۴۵)

حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا خطرہ تھا کہ علی علیہ السلام کی خلافت کے اعلان کی وجہ سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا اور پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد

ساری محنت ضائع ہو جائے گی، اسی لئے آنحضرتؐ نے حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے صریح اور عمومی اعلان کو التوا میں ڈالتے رہے، کیونکہ بعض روایات یا روایات کے استنباط کے مطابق یہ حکم عرفہ (۹ ذی الحجہ) کے دن حضورؐ کو اتار دیا گیا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت اور جانشینی کا اعلان فرمائیں، اور انہیں اپنے خلیفہ اور جانشین کے عنوان سے متعارف کرائیں، لیکن چونکہ آپ کو امت کے اختلاف کا اندیشہ تھا اس لئے آپؐ نے اس اعلان کو ۱۸ ذی الحجہ کے دن تک موخر کر دیا تھا، یہاں تک کہ اسی دن غدیر خم کے میدان میں جبرائیل امینؑ نے نازل ہو کر آں حضرتؐ کے گھوڑے کی باگ پکڑی اور فرمایا: ''خداوند عزوجل فرماتا ہے کہ اسی جگہ پر آپ کو علی بن ابی طالب علیہم السلام کی خلافت کا اعلان کرنا چاہئے: ''یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ ...... وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ '' (مائدہ/ ۶۷) گھبرایئے نہیں، ڈریں نہیں خدا ایسے فتنوں کا سد باب خود کرے گا آپ کو چاہئے کہ علیؑ کی خلافت کا اعلان کر دیں، اپنے فریضہ کو ضرور انجام دیں، اس بات کا اندیشہ دل میں نہ لائیں لوگ کہیں گے کہ آپ نے قومی اور رشتہ داری کی بنا پر اپنے داماد کو اپنا جانشین منتخب کر لیا ہے''۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں پر رسول خداؐ نے حکم دیا کہ لوگ غدیر خم کے مقام پر جمع ہوں اور آپ نے وہیں پر پوری صراحت کے ساتھ اس مسئلے کا اعلان کر دیا۔

بہر صورت بات یہ ہو رہی تھی کہ حضرت علی علیہ السلام کو خدا کی طرف سے خلافت کیلئے منتخب کیا گیا ہے، ایسا نہیں تھا ہے کہ لوگوں نے اپنا رائے حق دہی استعمال کر کے آنجنابؑ کو اپنا حاکم مقرر کیا ہو، جب خداوند متعال کسی مسئلے کے بارے میں حکم صادر فرما دے لوگوں کو اس مقابلے میں کیا حق حاصل ہونا چاہئے؟ قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ: ''وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ '' کسی بھی مومن

مرد یا عورت کو یہ حق حاصل نہیں جب خدا اور اس اک بھیجا ہوا رسول کسی کام کے بارے میں حکم دیں، انہیں کوئی اختیار حاصل ہو۔ (احزاب ۳۶)

لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں تو حق رکھتے ہیں مگر خدا کے مقابلے میں تو انہیں کوئی حق حاصل نہیں، ''انسانی حقوق'' خود انسان کے مقابلے میں دوسرے انسان کے بارے میں ہوتے ہیں نا کہ خدا کے مقابلے میں انسان کے حقوق کے بارے میں۔

اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر بھی خدا کے مقابلے میں انسان کے حقوق کو ثابت نہیں کرسکتا، یہ تو صریح قرآنی آیت ہے، بہتر ہے ''جدید سوچ'' کے لوگ اس آیت کا ترجمہ کریں اور صاف بتائیں کہ اس آیت کا کیا معنیٰ ہے؟ قرآن کہتا ہے: ''جب خدا اور اس کا رسولؐ اس بات کا فیصلہ کردیں تو کسی مومن مرد یا عورت کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اسے ٹھکرا دیں'' جدید سوچ کے لوگ اس آیت کا معنیٰ کریں تا کہ اگر اس کا کوئی اور معنیٰ ہے تو ہمیں بھی اس کا پتہ چلے!۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ لوگوں کو حاکمیت کا حق ہے اور انہوں نے یہ حق پہلے حضرت ابوبکر کو پھر حضرت عمر کو اس کے بعد حضرت عثمان کو اور آخر میں حضرت علی علیہ السلام کو سونپا، اب بتائیں کہ خدا کے مقابلے میں لوگوں کو کیا حق حاصل ہے؟ قرآن تو کہتا ہے کہ جب خدا اور رسولؐ کوئی فیصلہ کردیں کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس کے خلاف کوئی حرکت انجام دیں، ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ آیا آپ لوگ قرآن کو مانتے ہیں یا نہیں؟ اگر انسانی حقوق کے چارٹر کو قرآن کا ناسخ سمجھتے ہیں تو پھر صاف کہہ دیں کہ ایک نیا دین لے آئے ہیں، پھر اسلام کا دعویٰ کیسا؟ قرآن تو کہتا ہے کہ کوئی بھی مومن شخص خدا کے ارادے اور فیصلے کے مقابلے میں کوئی حق نہیں رکھتا بے اختیار ہے، انسان کے اختیارات اس کی زندگی میں دوسرے انسانوں کے مقابلے میں ہیں، اور یہ حقوق بھی خدا ہی نے انسانوں کیلئے مقرر کئے ہیں ورنہ در حقیقت خدا کے علاوہ کسی کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔

جدیدیت کا دعویٰ کرنے والے بعض اوقات اپنے اس دعوے کے اثبات کیلئے کہ حکمرانوں اور حکومتوں کی قانونی حیثیت لوگوں کی آراء اور ووٹوں پر موقوف ہے، حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے اس جملہ کو سند بناتے ہیں کہ: ''لَوْلَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ وَقِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ...... لَاَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلٰى غَارِبِهَا'' (نہج البلاغہ خطبہ۳) وہ اس جملے کا معنی یوں کرتے ہیں ''چونکہ اب تک لوگوں نے میری بیعت نہیں کی تھی اسی لئے میری حکومت شرعی اور قانونی نہیں تھی'' جبکہ حضرت علیہ السلام کی یہ مراد ہرگز نہیں تھی، بلکہ اصل مراد یہ تھی کہ: ''چونکہ اب تک لوگوں کی حمایت اور اور پشت پناہی مجھے حاصل نہیں تھی، لہٰذا نہ تو حکومت کی تشکیل میرا فرض بنتا تھا اور نہ ہی اپنے حق کو برحق ثابت کرنے کا فریضہ عائد ہوتا تھا، لیکن اب چونکہ لوگوں نے میری بیعت کر لی ہے لہٰذا مجھ پر حجت تمام ہوگئی ہے، چونکہ اب تم حاضر ہوگئے ہو اور میری مدد کیلئے بھی آمادہ ہو لہٰذا اب مجھ پر حجت تمام ہوگئی ہے اور حق خلافت کا حصول اب میرے لئے یقینی ہوگیا ہے''۔

حضور امیرالمومنین علیہ السلام کے یہ ارشادات دراصل ایک قاعدہ کلیہ کی طرف اشارہ ہیں کہ اصولی طور پر ''فریضہ کی ادائیگی کا دارومدار قدرت پر ہے'' جب ہزاروں آدمیوں کے مقابلے میں حضرت علی علیہ السلام کے طرفدار صرف دو تین آدمی ہوں تو پھر ان کے ساتھ کیونکر جنگ کی جاسکتی ہے؟ اسی لئے چونکہ قدرت اور طاقت آپ کے پاس نہیں تھی لہٰذا اپنے حق کو عملی جامہ پہنانے اور حکومت کو تشکیل دینے کا فریضہ بھی آپ پر عائد نہیں ہوتا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کے پاس حکومت کرنے کا حق نہیں تھا اور حق بھی وہ جو اللہ نے آپؑ کے لئے مقرر کیا تھا، جب یار و مددگار مل گئے اور لوگ اطراف میں جمع ہوگئے اور بیعت بھی کر لی تو حضرتؑ کیلئے شرعی فریضہ کی ادائیگی مسلم ہوگئی، اسی لئے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی اور حضرت کے

فرمودات سے بھی اسی کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا۔

جو چیز حضرت امیرؑ کو میدان میں لے آئی - جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں - ان کا وہ فریضہ ہے جو لوگوں کے حاضر ہونے کی وجہ سے آپ پر عائد ہوتا ہے، حضرت کا فریضہ یہ ہے کہ اقتدار کے ذریعہ ایسے کام کریں جن کے ذریعہ معاشرہ میں احکام الٰہی کا نفاذ ہو، بدعتوں کا سدباب ہو، مظلوموں کے حقوق کا تحفظ ہو، جیسا کہ حضرتؑ نے اسی خطبہ میں - جس کا ہم ایک حصہ نقل کر چکے ہیں - لوگوں کے اصرار کے بعد خلافت کو قبول کرنے کا فلسفہ یوں بیان فرماتے ہیں: "........

وَمَا اَخَذَ اللّٰهُ عَلَى الْعُلَمَآءِ اَنْ لَّا يُقَآرُّوْا عَلٰى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَسَغَبِ مَظْلُوْمٍ "(ایضاً) میں نے حکومت کو اس لئے قبول کیا ہے کہ خدا کا دین محکم ہو اور لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں، نہ اس لئے چونکہ تم نے مجھے حکومت کا حق دیا ہے لہٰذا اب میری حکومت قانونی اور شرعی ہوگئی ہے۔

پس بنابریں حضرتؑ کے خلافت کے حصول کیلئے کسی قسم کے اقدام نہ کرنے کی وجہ الٰہی فریضہ، اسلام کی مصلحت اور اسلامی معاشرے کی حفاظت تھی، اگر حضرت نے پچیس سال تک اس بارے خاموشی اختیار کئے رکھی اور کوئی اقدام نہیں کیا تو اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اصل اسلام محفوظ رہے اور اسے کوئی گزند نہ پہنچے۔

حضرت علی علیہ السلام اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی گفتگو

بعض روایات میں منقول ہے کہ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے حضرت علی علیہ السلام سے جو گفتگو کی وہ ہمارے اس مطلب کی تائید کرتی ہے۔ چنانچہ ابن ابی الحدید نے نہج البلاغہ کی شرح میں نقل کیا ہے کہ:

"ایک دن حضرت فاطمہ زہراؑ نے امیر المومنینؑ کے ساتھ اپنی گفتگو کے

دوران اسی موضوع پر اظہار کرتے ہوئے عرض کیا: ''آیا مناسب نہیں ہے کہ آپؑ اپنے سکوت کی مہر کو توڑ کر اپنے حق کیلئے قیام کریں؟'' اسی دوران میں مؤذن کی آواز مسجد سے بلند ہوئی جب وہ ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رسول اللّٰه'' پر پہنچا تو امیر المومنین نے ان سے فرمایا: ''آیا اگر یہ نام اور یہ صدا روئے زمین سے مٹ جائے آپ خوش ہوں گی؟'' عرض کیا: ''نہیں ہرگز نہیں''، علی امیرؑ نے فرمایا: ''پس اگر آپ چاہتی ہیں کہ یہ نام اور صدا مٹنے نہ پائے تو پھر صبر شکیبائی اور خونِ دل پینے کے سوا کوئی چارہ نہیں''۔ (شرح ابن ابی الحدید جلد ۱۱ ص ۱۱۳)

یہ روایت اس مطلب کو بخوبی واضح کر رہی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا صبر اور ان کی خاموشی اسلام اور مسلمین کی حفاظت کیلئے تھی، اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں تھا اور یہ بات نہیں تھی کہ حضرت کو اپنی جان کا خوف تھا، بلکہ آپؑ دیکھ رہے تھے کہ مقابلے اور تلوار اٹھانے کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان جس کا ہوگا وہ اسلام ہے اس کا صرف نقصان ہی نہیں ہوگا بلکہ تباہ بھی ہو جائے گا، اسی لئے آپ نے وہ راستہ اختیار کیا جس سے اسلام بچ گیا اگرچہ آپؑ کے ذاتی نقصانات بہت ہوئے۔

رہی یہ بات کہ بعد والے دور میں جب آپؑ نے تلوار اٹھائی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ آپؑ کی بیعت کر چکے تھے اور حجت آپؑ پر تمام ہو چکی تھی، لوگ ہر طرف سے مایوس اور ناکام ہو چکے تھے اور انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو اس ڈگمگاتی کشتی کو طوفانی لہروں سے نکال کر ساحل تک پہنچائے، اسی لئے انہوں نے آپؑ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور لوگوں کے بیعت کرنے سے حجت آپؑ پر تمام ہوگئی۔

۱۰

اسلامی حکومت کے مقبول اور قانونی ہونے میں لوگوں کا تعلق

گذشتہ بحث کا خلاصہ

صدیوں سے مذہب شیعہ ''رہبری''، ''امامت'' اور'' خلافت'' کے بارے میں اس بات کا معتقد چلا آرہا ہے کہ یہ ایک ''انتصابی عہدہ'' ہے اور خداوند متعال جسے اس مقام کے لائق سمجھتا ہے اسے یہ عہدہ عطا کرتا ہے، مگر افسوس کہ ابھی ان چند سالوں میں کچھ ایسے افراد بھی پیدا ہو چکے ہیں جو بظاہر اسلام اور تشیع کا دم تو بھرتے ہیں لیکن یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ ''امامت ایک ایسا عہدہ ہے جو عوام الناس ہی حضرت رسول خداؐ، حضرت علی اور حضرات ائمہ علیہم السلام کو عطا کرتے ہیں'' ایسے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حکومت اور حاکم کا تقرر لوگوں کے اختیار میں ہے، حکومت اور حکام اس وقت قانونی ہوں گے اور اپنی حاکمیت کا اجرا اس وقت کرسکیں گے جب عوام الناس نے انہیں یہ حق دیا ہو، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو آزاد خلق فرمایا ہے اسی لئے انہیں اپنی تقدیر کا بھی حاکم قرار دیا ہے، بنابریں کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ ان پر حکومت کرے خواہ پیغمبر بھی کیوں نہ ہوں، خواہ خدا نے ہی کیوں نہ فرمایا ہو، پھر بھی حق حاکمیت نہیں رکھتا، انسان اپنی تقدیر کے مالک آپ ہیں اسی لئے پیغمبر خداؐ ہوں یا امیرالمومنین علی علیہ السلام یا کوئی دوسرا انسان انہیں اس وقت لوگوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں جب لوگوں نے انہیں یہ حق تفویض نہ کیا ہو، اگر لوگ رائے دیں گے اور بیعت کریں گے تو انہیں حکومت کرنے کا حق حاصل ہوگا ورنہ نہیں۔

یہ جو حضرت رسول خداؐ نے غدیر خم یا دیگر موقعوں پر حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کی

بات لوگوں کے سامنے کی ہے، یہ ان کی ایک تجویز یا ایک پیشکش تھی کہ میری طرف سے خلافت کا حقدار علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے، گویا آپؐ نے لوگوں کو یہ بتایا کہ میرے نزدیک یہ علیؑ ہی خلافت کیلئے مناسب اور موزوں ہیں، لہٰذا تم بھی اسے ووٹ دو، غرض پیغمبرؐ کی خلافت کے امیدوار علی علیہ السلام تھے، لیکن چونکہ ۲۵ سالوں تک لوگوں نے انہیں ووٹ نہیں دیا لہٰذا اس عرصے میں نہ تو آپؑ امام اور رہبر تھے اور نہ ہی امامت وخلافت کا حق رکھتے تھے، جسے لوگوں نے ووٹ دیا وہی حکومت کا حقدار قرار پایا، اسی لئے خلفاء ثلاثہ حکومت کرنے کا حق حاصل کر چکے تھے لہٰذا اس ۲۵ سال کے عرصے میں اسلامی حکومت انہی کا حق تھی۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آج یہ الفاظ ان لوگوں کی زبانی سنے جا رہے ہیں جو خود کو حضرت علی علیہ السلام کا شیعہ اور پیروکار کہلواتے ہیں، حتی کہ ان میں کچھ وہ لوگ بھی ہیں جن کے سر پر علماء کی نشانی "عمامہ" بھی ہے، ان کا یہ شبہ ایک حالت میں پیش ہوا جب کہ شیعہ اول سے ہی اس بات کے معتقد چلے آرہے ہیں کہ امامت اور خلافت کا منصب ایک الٰہی منصب ہے، جو خداوند عالم کی طرف سے لائق اور شائستہ انسان کو عطا ہوتا ہے اور حضرت علی علیہ السلام اس عہدہ کے سب سے زیادہ لائق اور شائستہ ہونے کی وجہ سے خدا کی طرف سے اس کے اہل قرار پائے، اسی نظریہ کی بنیاد پر حتیٰ کہ اگر تمام دنیا کے لوگ اکٹھے ہو کر ان کی مخالفت میں نعرے لگائیں ان کی شرعی اور قانونی حیثیت میں پر کاہ کے برابر بھی فرق نہیں آئے گا۔

آیا جس دور میں لوگوں کی اکثریت پیغمبر اسلامؐ کی مخالف تھی اور طائف میں آپؐ کے سر وصورت کو پتھر مار کر زخمی کر دیا تھا تو اس وقت حضورؐ کی رسالت، نبوت اور حق حاکمیت سے معزول کر دیا گیا تھا؟ جس طرح حضور اکرمؐ کو خداوند عالم کی طرف سے منصب رسالت عطا کرنے میں لوگوں کا کسی قسم کا عمل دخل نہیں ہے اسی طرح آنحضرتؐ کو خدا کی طرف سے اسلامی

امہ کی امامت، رہبری اور حق حاکمیت کے عطا کرنے میں بھی کسی قسم کا عمل دخل نہیں ہے، خواہ لوگ اسے مانیں یا نہ مانیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امت کی رہبری، امامت اور حق حاکمیت عطا فرمایا تھا تو اس وقت انہوں نے خدا سے درخواست کی تھی کہ یہ عہدہ ان کی اولاد کو بھی عطا کیا جائے "قَالَ اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًاقَالَ وَمِنْ ذُرِّیَتِیْ قَالَ لَایَنَالُ عَھْدِالظَّالِمِیْنَ" (بقرہ/۱۲۴) شیعہ، سنی روایات کے مطابق منقول ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس امام کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ خداوندا! امامت میری نسل میں قرار دے!! وہ میں ہوں"۔ (بحار الانوار جلد ۲۵ باب ۶ روایت ۱۲)

بنابریں پیغمبر اسلامؐ کیلئے مقام امامت ثابت ہوگیا، کیونکہ یہ مقام انہیں اللہ نے عطا فرمایا تھا نا کہ لوگوں نے حضورؐ کی بیعت کر کے انہیں عطا کیا، یہی مقام امامت، آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو عطا ہوا، کیونکہ خود آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہ" "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی مولا ہے (ایضاً جلد ۳۵ باب ۸ روایت ۹) یہ وہ مقام ہے جس سے لوگوں کا کوئی تعلق نہیں خواہ کوئی اسے مانے یا نہ مانے، کیونکہ یہ ایک خدائی عہدہ ہے۔

رہی اس بات کی دلیل کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے حق اثبات اور حکومت کے حصول کی خاطر کوئی اقدام نہیں کیا یہ تھی کہ کسی نے آنجنابؑ کی مدد نہیں کی جب ہزار ہا لوگوں کے مقابلے میں آپ کے ساتھ گنتی کے چند افراد ہوں تو پھر آپؑ اتنا بڑا اقدام کیونکر کر سکتے تھے؟ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا کہ بہت سے لوگ بے فائدہ مارے جاتے، نوخیز اسلامی معاشرہ جو ابھی تازہ وجود میں آیا تھا اختلاف، افتراق اور انتشار کا شکار ہو جاتا۔

آپ جانتے ہیں کہ کسی قسم کی جنگ اور لڑائی نہیں ہوئی تھی مگر اس کے باوجود وفات پیغمبرؐ کے بعد اطراف و کنار سے لوگ مرتد ہونا شروع ہو گئے تھے اور اسلام سے پھر گئے تھے اور اسلامی معاشرے کے مدمقابل آ کھڑے ہوئے تھے، خلیفہ اول کے زمانے میں مرتدین کے ساتھ کئی جنگیں لڑیں گئیں تاریخ میں جنہیں ''جنگ ردّہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ان حالات میں اگر خود ''مدینۃ النبی'' میں بھی داخلی جنگ شروع ہو جاتی، تو جو دشمنان اسلام مدینہ کے اطراف میں تھے وہ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اسلام پر خوب ہاتھ صاف کرتے اور اسے ہمیشہ کیلئے اسی شہر میں دفن کر دیتے، یہی وجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اسلام کی اساس کو بچانے کیلئے اپنے حقوق کے حصول کی خاطر تلوار نہیں اٹھائی۔

البتہ یہ اور بات ہے کہ آپ نے اپنے حق کے حصول کیلئے زبانی کلامی احتجاج سے دریغ نہیں کیا، لوگوں پر اتمام حجت کیلئے ان کے دروازوں پر جا کر انہیں ''داستان غدیر'' اور دوسرے واقعات یاد دلائے، اور ان سے تقاضا کیا کہ وہ اس بات کی گواہی دینے کیلئے مسجد میں جمع ہوں کہ ''خلافت علیؑ کا حق ہے''، لیکن لوگوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا، اسی طرح حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا مسجد میں جا کر اپنے حقوق کے حصول کی خاطر احتجاج کیا اور لوگوں پر حجت تمام کی اور ساتھ ہی ساتھ حضرت علی علیہ السلام نے خلفاء کے دور خلافت میں نہ تو کسی جنگ میں شرکت کی اور نہ ہی ان کی طرف سے کسی عہدہ کو قبول کیا، یہ بھی ان کا ایک موثر احتجاج تھا اور یہ بتانا تھا کہ آپؑ ان کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے، مگر اسلامی معاشرہ کو اختلاف و انتشار سے بچانے کیلئے کوئی عملی اقدام نہیں کیا اور ۲۵ سال صبر و سکوت کے ساتھ گزار دیئے۔

حضرت علی علیہ السلام اور غیر اسلامی معاشرہ؟

اس میں تو شک نہیں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ جان بوجھ کر دشمنی کرنا یقیناً کفر کے برابر ہے اور جو شخص جانتے بوجھتے ہوئے احکام خداوندی کو ٹھکرا دے وہ یقیناً باطنی طور پر کافر ہے، اگر چہ بعض صورتوں میں اس پر ظاہری کفر کا حکم نہ لگایا جا سکے، اسی بنیاد پر اور اس بات پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کیلئے خداوند عالم کی جانب سے منصوب ہوئے تھے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو معاشرہ حکم خدا اور حق علی علیہ السلام کا احترام نہ کرے وہ یقیناً غیر اسلامی ہوگا، خواہ آپ اسے ظاہری طور پر کافر نہ بھی کہیں۔

اس مسئلہ کی روشنی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام نے اس غیر اسلامی معاشرے کی حفاظت کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی معاشرے کا اسلامی یا غیر اسلامی ہونا تشکیلی امور میں سے ہے اور اس کا ایک نہیں کئی مرتبے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ ''سب کچھ ورنہ کچھ بھی نہیں'' ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ جب معاشرے میں تمام اسلامی احکام کا مکمل طور پر اجراء ہوتا ہے اور تمام اسلامی اقدار کی من وعن پابندی کی جاتی ہے جس کی پہلی کڑی امام معصومؑ کی حکومت ہوتی ہے، ایسا معاشرہ آئیڈیل اور سو فیصد اسلامی ہوتا ہے اور جس قدر اسلامی احکام اور اقدار پر توجہ کم ہوتی جائے گی اور معاشرہ اتنا ہی پایۂ تکمیل سے کم ہوتا جائے گا اور سو فیصد درجے دور ہوتے ہوئے آخر میں ''اسلامی معاشرہ'' نچلے درجے تک پہنچ جائے گا۔ اسی وجہ

اولاً: جب تک کسی معاشرے میں یہ نظریہ موجود ہے کہ پیغمبرؐ اور قرآن حق ہیں اور معاشرے میں اسلامی احکام اور اقدار کی مکمل طور پر پاسداری ہو رہی ہے تو معاشرہ آئیڈیل طور پر

اسلامی ہوگا، لیکن اگر ایک دن ایسا آجائے کہ اسلامی احکام میں اپنی طرف سے توجیہات کو داخل کردیا جائے اور بعض احکام میں شکوک وشبہات پیدا کر کے انہیں ترک کردیا جائے یا کچھ لوگ یہ کہنا شروع کردیں کہ ان احکام پر عمل کرنے میں مصلحت نہیں ہے، یا فلاں آیت کا یہ معنی نہیں ہے یا ہماری روشن خیالی اور جدت پسندی کچھ اور ہے وغیرہ، پھر بھی یہ چیزیں اصل معاشرے کے اسلامی ہونے کیلئے مضر نہیں ہیں، بنابریں جب تک یہ فکر حکم فرما ہے کہ اسلام، قرآن اور اسلامی احکام برحق ہیں پھر بھی اسلامی حکومت کا ایک مرتبہ خواہ نچلا سہی موجود ہے اور ایسا ملک یا معاشرہ کافر یا غیر اسلامی نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ معاشرہ یا ملک کے بعض افراد- ظاہر میں یا فقط باطن میں- کافر ہوں۔

ثانیاً: اگر بالفرض کسی معاشرے کی اکثریت ہی کافر ہوجائے اور نظام حکومت بھی اسلامی نہ ہو لیکن اس بات کی امید ہو کہ مستقبل میں انہی افراد کی اصلاح کی جاسکتی ہے، پھر بھی ضروری ہے بطور مقدمہ، وحدت اور اتحاد کی حفاظت کی جائے، تاکہ کسی دن ان کیلئے حکومت حق کا قیام عمل میں لایا جاسکے، یہ فرض اس صورت میں ہے کہ اگر حکومت، کفر کی ہو اور اس میں اسلامی احکام کا تذکرہ تک نہ ہو، وہی زمانہ جاہلیت کے آداب و رسوم عود کر آئیں یا مغربی اور یورپی ممالک کی ثقافت اور قوانین نافذ ہوں لیکن امید ہو کہ ایک عرصہ بعد اسلامی حکومت برسر کار آجائے گی پھر بھی اختلاف نہیں کیا جاسکتا، ہماری اس گفتگو کا شاہد قرآن مجید کا وہ فرمان ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر جانے لگے تو اپنے بھائی جناب ہارون سے فرمایا: ''میری عدم موجودگی میں آپ میرے جانشین ہیں، آپ اس بات کا خیال رکھنا کہ بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف پیدا نہ ہو''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد سامری کی داستان رونما ہوگئی، ایک بچھڑا بنا کر اس کی پوجا پاٹ شروع کردی گئی، اس بارے میں حضرت ہارون کا ردعمل صرف اس حد تک تھا کہ وہ انہیں زبانی کلامی نصیحت فرمایا کرتے تھے، کیونکہ آپ لوگوں کو ان کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت نہیں تھی، چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سے واپس آگئے تو دیکھا کہ یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں۔بعض روایات کے مطابق نصف سے زیادہ لوگ۔''گوسالہ پرست'' ہو چکے تھے، یہ صورت حال دیکھ کر آپ بہت غصے ہوئے، حضرت ہارون کا گریبان پکڑ کر کہا: ''تم نے ان لوگوں کو کافر اور مشرک کیوں ہونے دیا؟'' تو ہارون نے جواب میں عرض کیا: ''یَابْنَ اُمَّ لَاتَأخُذْ بِلِحیَتِی وَلَابِرأسِیْ ''ماں جائے! آپ میری داڑھی اور سر سے ہاتھ اٹھالیں! (طٰہٰ/۹۴) ''اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِیْ وَکَادُوا یَقْتُلُونَنِی ''اس قوم نے مجھے کمزور سمجھ کر میرے قتل کرنے کے قریب ہو گئے تھے۔ (اعراف/۱۵۰) مجھے ان لوگوں نے کمزور کر دیا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے، انہوں نے تو مجھے کوئی کام کرنے نہیں دیا، اسی طرح حضرت ہارون نے ایک عذر یہ پیش کیا کہ: ''اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ ''میں اگر ان دس دنوں کے اندر جو چالیس دنوں سے باقی رہ گئے تھے ان کے ساتھ جنگ کرتا تو بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا، اسی لئے میں نے ان ان چند دنوں میں صبر کیا اور ان کی سختیاں برداشت کیں تا کہ ''وحدت'' کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اتنے میں آپؑ واپس آجائیں پھر جو مناسب سمجھیں عمل کریں''۔

پس اگر معلوم ہوا کہ اگر چہ وہ لوگ گوسالہ پرستی سے کافر اور مشرک ہو گئے تھے پھر بھی حضرت ہارونؑ نے انہیں دھتکارا نہیں، ان کے خلاف جنگ نہیں کی بلکہ حکمت عملی سے کام لیتے رہے اور ان کے ساتھ صلح صفائی سے رہتے رہے، اس امید کے ساتھ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

واپس آجائیں گے اور خداوند عالم کے حکم کے مطابق عمل کریں گے۔

بنابریں حتی کہ-نعوذ باللہ- کسی اسلامی معاشرے میں کفر ظاہر ہو جائے پھر بھی اگر امید ہو کہ بتدریج اور خاص ذرائع سے حالات سازگار ہو جائیں گے جن سے لوگوں کو ہدایت ملے گی اور اسلامی حکومت برقرار ہو جائے گی، پھر بھی صبر سے کام لینا اوخون دل پینا ضائع نہیں جائے گا اور حضرت علی علیہ السلام بھی علم امامت کے ذریعہ جانتے تھے کہ یہی لوگ ایک دن ''حق'' کی طرف لوٹ آئیں گے اور ان کی اپنی حکومت کی باری آئے گی، اسی لئے آپ علیہ السلام نے پچیس سال تک صبر کیا تا کہ وہ دن آئے جس میں مکمل طور پر احکام دین نافذ ہوں اور بھٹکے ہوئے معاشرے کو اس کی اصلی ڈگر پر لے آئیں۔

کبھی صبر- کبھی جنگ کیوں؟

ایک اور سوال جو یہاں پیش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ: ''کیا وجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے زمام اقتدار ہاتھ میں لی اور خلافت کے منصب کو حاصل کرلیا تو اپنی پالیسی تبدیل کرلی اور قبینے مخالفین-جمل، صفین اور نہروان والوں- کے ساتھ حکمت عملی سے کام نہ لے کر صلح وصفائی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے جنگ شرع کردی اور اپنی حکومت کا تقریباً تمام عرصہ جنگ کرنے میں گزار دیا؟ اگر آپؑ ان لوگوں سے میل تال کر لیتے اور کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی کو اپنا لیتے تھوڑا صبر کر لیتے تو نہ تو اس قدر خون بہتا اور نہ ہی جانی و مالی نقصان ہوتا بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ بھی قتل ہو جانے سے بچ جاتے، کیونکہ آپؑ کے قتل وشہادت کی راہیں بھی تو خوارج نے متعین کی تھیں اگر خوارج سے نہ لڑتے تو شاید وہ لوگ بھی آپؑ کو قتل کرنے پر آمادہ نہ ہوتے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جانتے تھے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت امام مہدی عجل اللہ فرجہ کے ظہور تک مہم اور اسلامی حکومت ہی دنی
میں ایک اسلامی حکومت کا نمونہ ہوگی ، لہٰذا آپؑ کو چاہئے کہ اپنی حکومت کے دوران ایک
''اسلامی حکومت'' نمونہ کے طور پر چھوڑ جائیں، کیونکہ آپؑ سے پہلے تینوں حکومتیں صحیح معنوں میں
''اسلامی حکومتیں'' نہیں تھیں ، خصوصاً تیسری خلافت کے دور میں تو '' اسلامی'' اور '' سلطنتی''
حکومت میں تو کوئی نمایاں فرق نہیں تھا یعنی'' اسلامی حکومت'' بادشاہت کا نقشہ پیش کر رہی تھی
کیونکہ '' مالیات'' کے کرتا دھرتا '' بیت المال'' کے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کر
کرتے تھے ، رشوت پارٹی بازی ، اقربا پروری اور اس طرح کی دوسری برائیاں اپنے عروج کو پہنچ
چکی تھیں اور یہی برائیاں اس بات کا باعث بنیں کہ عوام ان کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے او
سربراہ حکومت کو قتل کر دیا۔

صدر اسلام کی ایک اور حکومت '' معاویہ'' کی حکومت ہے ، سو وہ بھی اپنے ابتدائی دنوں
ہی سے سلطنتیں اور شہنشاہوں کی حکومتوں سے چنداں مختلف نہیں تھی ، اسی دور حکومت میں شراب
خوری ، مے گساری ، حرام کاری اور موسیقی جیسی برائیاں اعلانیہ طور پر موجود تھیں۔

بہر صورت ان تمام مسائل کے پیش نظر ، حضرت علی علیہ السلام کا فرض بنتا تھا کہ وہ اپنی
حکومت کے ان چند مختصر سالوں میں ایک اسلامی حکومت کا ایسا نمونہ پیش کریں جو قیام قیامت
تک لوگوں کے لئے قابل تقلید ہو ، اگر کچھ لوگ حکومت حق تشکیل دینا بھی چاہیں تو انہیں معلوم ہو
کہ یہ حکومت کس طرح تشکیل دی جاتی ہے۔

نمونہ کے طور پر عرض کرتے چلیں کہ اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی حضرت امام خمینی
رضوان اللہ علیہ نے اسی نمونہ کو پیش نظر رکھ کر ایران میں حکومت تشکیل دی ، چنانچہ جب آپ پیرس
میں تشریف فرما تھے تو وہاں پر ریڈیو ٹی وی کے نمائندگان کی موجودگی میں ایک پریس کانفرنس سے

خطاب کیا تو ایک اخبارے نمائندہ نے آپ سے سوال کیا کہ: ''اگر آپ کامیاب ہو جائیں اور شاہ، ایران سے چلا جائے تو آپ اس کی جگہ کس طرز کی حکومت تشکیل دیں گے؟'' تو امام نے فرمایا: ''حضرت علی علیہ السلام کی حکومت جیسی، ہم چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت بھی ان کی حکومت کی مانند ہو، کیونکہ وہ ہمارے لئے ایک نمونہ ہے''۔

امام خمینیؒ نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ امام حسن علیہ السلام یا امام حسین علیہ السلام یا کسی اور امام علیہم السلام جیسی حکومت، کیونکہ انہوں نے کی ہی نہیں تھی، حضرت رسالتمآبؐ کے بعد عملی طور پر جس دورانئے میں ایک عظیم اسلامی معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکی تو وہ صرف اور صرف ایک مکمل اسلامی حکومت ہے جو بطور نمونہ پیش کی جا سکتی ہے وہ علی بن ابی علیہ السلام کی حکومت۔

اگر یہ حکومت معرض وجود میں نہ آتی تو کیا ہم دعویٰ کر سکتے تھے کہ ''اسلامی حکومت'' اصولی طور پر قابل اجرا و عمل ہے؟ آیا اس دور بھی کچھ لوگ اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کرتے تھے کہ اسلامی حکومت ایک خیالی اور تصوراتی معاملہ ہے جو قابل عمل نہیں ہے، اگر ممکن ہو تو پھر خود حضرات ائمہ علیہم السلام نے اس کا اجرا کیوں نہیں کیا؟ اسی لئے حضرت امیر علیہ السلام نے دوسری تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اس مصلحت کو سب پر مقدم کیا اور اسلامی حکومت قائم کر کے دنیا کیلئے ایک نمونہ پیش کر گئے۔

ماڈرن یا روشن خیال شیعہ

آج کل جو مختلف شبہات لوگوں کے دلوں میں ڈالے جا رہے ہیں، ہمیں نہایت ہی ہوشیار ہونا پڑے گا کہ ''خلافت اور امامت'' کے مسئلے میں ان ''خناسوں'' کے وسوسوں سے متاثر

نہ ہوں، کیونکہ مکتبِ تشیع کے نقطہ نظر سے خلافت اور امامت ایک الٰہی منصب ہے جو خداوند عالم نے اہل بیت علیہم السلا کو عطا فرمایا ہے اور اس میں لوگوں کو کسی قسم کے عمل دخل کا حق حاصل نہیں ہے، باالفاظ دیگر حضرات ائمہ علیہم السلام لوگوں سے اختیار حاصل کر کے ولایت اور حق حاکمیت کے مالک نہیں بنتے اور نہ ہی ان سے قانونی حیثیت کی سند حاصل کرتے ہیں، بلکہ یہ مسئلہ خداوند عالم کے منصوب و متعین اور مقرر کرنے سے انجام پذیر ہوتا ہے۔

حضرات اہل سنت کا اس مسئلے میں ہمارے ساتھ اختلاف ہے اور یہ اختلاف ابتدا ہی سے چلا آرہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو بات نئی ہے وہ یہ کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو دعویٰ تو شیعہ ہونے کا کرتے ہیں لیکن مذکورہ شیعہ عقیدہ کے منکر ہیں، افسوس تو اس بات کا ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں کچھ ایسے افراد بھی شامل ہیں جو علمائے شیعہ کے لباس میں ہیں، اس سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ فتنہ کس حد تک اہم اور سنجیدہ ہے، نہایت ہی تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ ایک ایسی حکومت میں جو اہل بیت علیہم السلام کے نام پر معرض وجود میں آئی ہے ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اصلی ترین اسلامی عقائد کا اور وہ بھی "تشیع کے دفاع" کے نام سے انکار کرتے ہیں، افسوس کی بات یہ بھی ہے کہ ان افراد میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی باتیں لوگوں میں مؤثر بھی ہیں اور یہ بات ہمارے لئے نہایت مشکل کا باعث ہے، اگر اس پر خون کے آنسو بہائے جائیں تو بے جا نہیں ہوگا، ہمیں خبردار رہنا پڑے گا تاکہ یہ شیاطین ہمیں اپنے دام فریب میں گرفتار نہ کرلیں اور ولایت وخلافت کے عقیدے کو ہمارے دلوں سے نہ چھین لیں۔

شیعی نقطہ نظر سے تو اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت اور اس کو شرعی اور قانونی حیثیت خداوند عالم کی طرف سے حاصل ہے ایسا نہیں ہے کہ لوگوں کی بیعت اور رائے نے اسے قانونی حیثیت دی ہے، البتہ یہ لوگوں کی بیعت ہی تھی جس

نے حضرت علی علیہ السلام کو موقع عطا فرمایا کہ آپؑ اس حق کو عمل میں لائیں جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا اور یہ اس کے علاوہ ہے کہ ہم کہیں کہ لوگوں کی بیعت نے آنجنابؑ کیلئے قانونی حیثیت ایجاد کی اور ہم اس بارے میں تفصیل سے ایک موقع پر گفتگو کر چکے ہیں ....۔

آخر کیا وجہ ہے کہ آج کل کچھ ایسے لوگ مذہب مین پیدا ہو چکے ہیں جو دعویٰ تو شیعہ ہونے کا کرتے ہیں مگر ائمہ علیہم السلام کی خلافت اور ولایت کے مسئلے میں اس قدر مخالفانہ طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔

حقیقت یہ کہ اصل نشانہ ''ولایت فقیہ'' کا مسئلہ ہے، کیونکہ ولایت فقیہ ہی دراصل ائمہ اطہار علیہم السلام کی ولایت کے تسلسل کا نام ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام کی ولایت اور حکومت کے بارے میں جس بنیاد کو تسلیم کریں گے ولایت فقیہ کے بارے میں بھی اسی بنیاد اور منبع کو تسلیم کرنا پڑے گا، اس وجہ سے یہ لوگ اس کوشش میں لگے ہوئے ائمہ علیہم السلام کے حق حاکمیت اور شرعی و قانونی حیثیت میں جس قدر بھی شکوک و شبہات پیدا کریں گے اسی قدر ''والایت فقیہ'' کی بنیادوں کو کمزور کریں گے، اگر ہم تسلیم کرلیں کہ امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت کے قانونی ہونے کیلئے لوگوں کی بیعت اوران کی رائے ضروری ہے تو ولایت فقیہ کے بارے میں بھی یہی کہیں گے کہ فقیہ کی حکومت کے قانونی اور شرعی حیثیت کیلئے لوگوں کا انتخاب اور رائے کا ہونا ضروری ہے، اس طرح سے یہ لوگ حقیقت میں جڑوں کو کاٹنا چاہتے ہیں تا کہ شاخیں خود بخود خشک ہو جائیں۔

ان کا کہنا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت بھی عوام کی طرف سے اور لوگوں کی منتخب کردہ تھی لہٰذا ولی فقیہ کی حکومت کو بھی اگر کسی دن لوگوں نے مسترد کر دیا تو اسے بھی ختم کر دینا چاہیے، کیونکہ یہ عوام ہی ہیں جو اپنی تقدیر کے حاکم ہیں۔

نوٹ: (از مترجم) یہاں سے آگے حضرت آیۃ اللہ مصباح یزدی مدظلہ نے ''ولایت فقیہ'' کو اسلامی جمہوریہ ایران کے قانون اساسی (آئین) کی مختلف دفعات کے ذریعہ حقیقت ثابت کرنے کیلئے دلائل پیش کئے ہیں جو اُس ملک کے عوام کیلئے زیاد مفید ہیں۔ واللہ اعلم

تاریخ سے عبرت حاصل کی جائے

جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ پہلے تو ہمیں چاہئے ہم کوشش کریں کہ اپنے عقائد کو زیادہ سے زیادہ پختہ کریں اور اس چیز کو مذاق نہ سمجھیں اگر ہمارے ایمان کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوں گی تو شیاطین اسے ہم سے بہت جلد چھین لیں گے۔

''رہبر معظم۔ مدظلہ العالی۔ نے اپنی ایک تقریر میں اس طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہا: ''بعض ملکی مطبوعات دشمن کے پروپیگنڈے کا ذریعہ بن چکی ہیں کچھ جاسوس قسم کے لوگ ان میں در آئے ہیں، ان لوگوں نے ہمارے جوانوں کے ایمان کو اپنا ہدف بنایا ہوا ہے اور اس کوشش میں ہیں کہ مختلف شکوک وشبہات ان کے دلوں میں ڈال کر دینداری کی روح اور معاشرہ میں دین کی پابندی کا عنصر آہستہ آہستہ کم کر کے بالکل ہی ختم کر دیں خاص کر جوان نسل کے دلوں سے!!''

دوسری بات یہ ہے کہ ہم کوشش کریں اپنی زندگی میں جہاں تک ہو سکے اسلامی احکام پر عمل کریں اور اسلامی اقدار کو معاشرے میں رائج کریں، اس کام کو سنجیدگی سے کریں اس بارے کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں اور نہ ہی چشم پوشی سے کام لیں، اولیائے دین اور انبیائے ماسبق کے دور سے لے کر اوائل اسلام تک اور اس زمانے سے لے کر آج تک جن جن شہداء نے اپنے خون

کا نذرانہ پیش کیا ہے تو اس لئے تا کہ احکام الٰہی کا اجرا ہو نہ اس لئے کہ کچھ اراذل اور اوباش قسم کے لوگ جو بھی خلاف شریعت کام ہے آزادی کے ساتھ انجام دیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو، ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ پہلے تو ہم اسلامی احکام کو اپنے اوپر نافذ کر کے صحیح معنوں میں اسلامی زندگی اصولوں کے مطابق ہونی چاہئے، پھر دوسرے لوگوں کو اس راہ کی طرف راہنمائی کریں۔

تیسری بات یہ کہ شیعہ ہونے اور مکتب امام حسین علیہ السلام کے پیروکار ہونے کے ناتے ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ہم ہمیشہ دشمن کے ساتھ مقابلہ کیلئے تیار رہیں، جیسا کہ غیبت کبریٰ کے ابتدائی ایام میں ہمارے بزرگ علماء جمعہ کے دن گھوڑا اور تلوار لے کر شہر سے باہر چلے جایا کرتے تھے اور وہاں پر گھوڑا سواری اور شمشیر زنی کی مشق کیا کرتے تھے تا کہ اگر کسی وقت حضرت امام زمانہ (عجل اللہ فرجہ شریف) ظہور فرمائیں تو ہم ایک سپاہی کی حیثیت سے جنگ کیلئے بالکل تیار ہوں، چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے: ''وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ'' دشمن کے ساتھ مقابلہ کیلئے جتنا کر سکتے طاقت اور قوت کو تیار رکھو۔ (انفال/۶۰)

ہمیں چاہئے کہ جتنا ضروری تیاری ہے ہمیشہ تیار رہیں، کیونکہ اگر ہم ہر وقت تیار اور چوکنا ہوں گے تو دشمن دور بھاگے گا ورنہ ہم پر حملہ آور ہو کر ہمیں تباہ کر دے گا۔ ملت ایران نے حضرت امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی رہنمائی میں شہنشاہ کی کفر پر مبنی طاقت سے ٹکر لی، جان کی قربانی دی، ایذائیں جھیلیں، جلاوطنی کی زندگی گذاری، مال کی قربانی دی بالآخر یہ انقلاب کامیاب ہوا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ملت نے کس لئے جنگ کی؟ یہ جان و مال قربانیاں کس لئے دیں؟ اس وقت امام خمینیؒ نے آواز بلند کی اور کہا: جو شخص آج آواز بلند نہیں کرے گا، قم اور نجف بھی خاموش نہ رہیں، کیونکہ اسلام کو خطرہ درپیش ہے، امام کی اس آواز پر ملت نے لبیک کہی اور احیائے اسلام کیلئے کھڑے ہو گئے۔

اگر خدانخواستہ شاہ کے دور کی مانند دوبارہ وہی زمانہ لوٹ آئے اور خارجی دشمن داخلی فریب خوردہ دشمنوں کے ذریعہ ان کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اسلام پر حملہ آور ہوں اور شاہ کی وہی صورت تکرار ہونے لگے تو ہمیں چاہئے کہ ہم ان سے نبرد آزمائی کیلئے بالکل تیار ہوں۔

خون سید الشہداء علیہ السلام کی برکت سے چودہ سو سال سے شیعوں کے اندر یہ آمادگی پائی جاتی ہے اور ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء میں اس نے نتیجہ دیا اور اسلامی انقلاب کامیاب ہو کر رہا۔

ہمیں ہوشیار اور بیدار رہنا چاہئے اور یہ آمادگی ہمیں ختم نہیں کر دینی چاہئے اور دشمن کے دلفریب نعروں میں آ کر سستی اور کاہلی کا شکار نہیں ہو جانا چاہئے، دشمن تو چاہتا ہے کہ اس طرح کے نعروں کے ذریعہ ہماری قوم کے دلوں سے فدا کاری، شہادت طلبی اور جاں ساری کا جذبہ ختم ہو جائے، یہ ایک باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عمل ہو رہا ہے جو باہر سے اس ملک درآمد کر کے اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔

میں ایک بار پھر تاکید کرتا ہوں کہ ہمیں خبردار رہنا چاہئے اور یہی کوشش ہونی چاہئے کہ اس جذبے کی حفاظت کریں اور ہمیشہ یہ دعا کرتے رہیں: "**اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا الشَّهَادَةَ فِي سَبِيْلِكَ**" خدایا تو ہمیں اپنی راہ میں شہادت کی موت عطا فرما۔ آمین

معاشرہ کے بگاڑ کے دو اصلی عامل

حکومت حقہ کی عدم قبولیت میں جو اہم ترین موثر عامل ہیں وہ ہے عوام الناس کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دشمن کا پروپیگنڈہ، اسی لئے ہم سب کے اہم فرائض میں شامل ہے کہ خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کا اہم فریضہ بنتا ہے کہ عوام کی سطح فکر اور تعلیمی معیار کو زیادہ سے زیادہ بلند کیا جائے، تاکہ وہ سیاسی اور سماجی مسائل میں دوسروں کی تقلید و اتباع سے آزاد ہو کر خود ہی ان

مسائل کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو جائیں، یہ بات صرف نعرہ ہی نہ ہو بلکہ حقیقت کا روپ بھی اختیار کرے۔

ہم نے اس بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور دیکھ رہے ہیں کہ حضرت امام رضوان اللہ علیہ کے تحرک اور اسلامی انقلاب کی برکت سے ہمارے عوام فکری اور دانش و بینش کی سطح سے دنیا کے دوسرے لوگوں سے بہت بہتر ہے اور کافی ترقی کی ہے آج ہمارے ملک کے لوگوں کی بینش دوسرے ملکوں کے لوگوں سے بہت بلند ہے، مگر پھر بھی ہم مطلوبہ سطح سے کافی دور ہیں اور ابھی بہت کام کرنا ہے، اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ کچھ لوگ ہیں جو عوامی فریب اور پروپیگنڈے کے ذریعہ ہمارے عوام کی ایک بڑی تعداد کو اپنے دام فریب میں گرفتار کر رہے ہیں اور وہ ان کی رائے سے اپنے غلط نظریات کیلئے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ان کا یہ غلط طریقہ کار دو وجوہات کی بنا پر کامیاب ہے، ایک تو یہ ہے کہ معلومات کی کمی اور دوسری ہے شخصیت کی کمزوری، ایک کا معلوماتی پہلو اور دوسری کا شخصیتی پہلو ہے۔

جس شخص کی سیاسی معلومات کم ہوں اور وہ صحیح طریقے پر سماجی مسائل کا تجزیہ نہیں کر سکتا اور بہت جلد اور بڑی آسانی کے ساتھ پروپیگنڈے کا شکار ہو جاتا ہے جو ایک بہت بڑا نقص ہے۔

دوسرا نقص شخصیت کے کمزور ہونے کی بنا پر ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے نظریہ میں استقلال نہیں پایا جاتا وہ بہت جلد دوسرے لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں اور ان کی پیروی کرنے لگ جاتے ہیں، عام طور پر جو مشہور لوگ ہیں جن کے پاس پیسہ بھی ہے، مقام بھی ہے ان کی علمی شان و شوکت بھی ہے اور کچھ خصوصیات کے حامل ہیں وہ لوگوں کیلئے ایک قسم کی کوشش رکھتے ہیں اور بہت سے لوگوں کی نگاہیں ان پر ہوتی ہیں اور وہ ان کے پیچھے لگے رہتے ہیں اس قسم

کی تقلید اور اتباع شخصیت کے کمزور ہونے کی علامت ہے جو معلومات کی کمی کے علاوہ ہے۔

ممکن ہے کہ ایک شخص ابتدا میں کسی مسئلہ کو جانتا ہو اور اسے اپنے لئے حل بھی کر چکا ہو مگر جب بعد میں دیکھتا ہے دوسرے لوگوں نے تو دوسری طرف کا رخ کر لیا ہے تو وہ انہی کے پیچھے چل دیتا ہے، یہ ہے شخصیت کی کمزوری۔

شخصیت کی کمزوری اور معرفت کی کمی عام طور پر باہم ہوتی ہیں، ان دونوں کے خلاف جہاد کرنا ہوگا، ایک اہم اجتماعی فریضہ اور بہترین نیکی کہ جس کیلئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے وہ ہے لوگوں کی معرفت اور معلومات کی سطح کو بلند کرنا اور ہمیں سعی کرنا چاہیئے کہ لوگ خود اپنی شخصیت کا احساس کریں، ہمیں چاہیئے کہ ہم انہیں تشویق دلائیں کہ ہر مسئلے پر وہ خود ہی غور کریں، سوچیں اور نتیجہ نکالیں، جو بھی کام انجام دیں اپنے اور خدا کے درمیان ایک حجت قرار دیں، صرف یہاں تک ہی محدود نہ رہیں کہ جس کسی کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں اسی کے پیچھے چل پڑیں، ممکن ہے کہ کوئی شخص روحانیت کے لباس میں ہے لیکن بڑی بڑی غلطیوں اور خطاؤں کا مرتکب ہو چکا ہے کسی کا روحانی ہونا یا کسی بزرگ شخصیت کا حامل ہونا خدا کے نزدیک حجت نہیں ہے، بروز قیامت ہر ایک کو اپنے اعمال کا جواب خود دینا ہے جن لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی ہوگی، قیامت کے دن کہیں گے کہ ہمارے بڑوں اور صاحبان شخصیت بزرگ نے ہمیں فریب دیا تھا، لیکن ان کا عذر قابل قبول نہیں ہوگا اور انہیں سیدھا جہنم بھیج دیا جائے گا۔

خداوند فرماتا ہے: "یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَالَيْتَنَا اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُولَ وَقَالُوا رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآئَنَا فَاَضَلُّونَا السَّبِيلَا "۔ (احزاب ٦٦، ٦٧) جس دن ان کے چہروں کو جہنم میں الٹا پلٹا جائے گا وہ کہیں گے اے کاش ہم خدا کے فرمان کو بجا لاتے اور رسولؐ کی اطاعت کرتے اور کہیں گے: پروردگارا! ہم نے اپنے

سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی پس انہوں نے ہمیں گمراہ ہی کر دیا تھا۔

جو لوگ دنیا میں اس قسم کے جالوں میں پھنس چکے ہیں وہ قیامت کے دن ان ''بڑے لوگوں'' اور ''عظیم شخصیتوں'' کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگیں گے اور ان سے کہیں گے: ''ہم دنیا میں تمہاری پیروی کیا کرتے تھے، آج تم ہمارے عذاب میں سے کچھ مقدار تم بھی برداشت کرو'' تو وہ جواب میں کہیں گے: ''تم خود ہی ہمارے پاس آئے تھے'' قرآن کہتا ہے: ''وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفَآءُ لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ '' اس وقت وہ جہنم کی آگ میں اپنے دلائل پیش کرنا شروع کریں گے، کمزور اور زیرِ دست لوگ مستکبرین اور بڑے لوگوں سے کہیں گے: ''ہم تمہارے تابع فرمان تھے آیا تم لوگ ہم سے آتش جہنم کا کچھ عذاب ہٹا سکتے ہو؟'' تو مستکبر لوگ کہیں گے: ''اب تو ہم سب اسی میں جکڑے ہوئے ہیں، خدا ہی نے بندوں کے درمیان فیصلہ کیا ہے''۔ (سورہ مومن/ ۴۷، ۴۸)

جو لوگ دوسروں کو گمراہ کرنے کا سبب بنتے ہیں وہ دہرے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں ''لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ '' تا کہ قیامت کے دن اپنے گناہوں کا مکمل بوجھ اٹھائیں اور ساتھ ہی ان لوگوں کے گناہوں کا کچھ بوجھ بھی اٹھائیں جنہیں وہ نادانی کی حالت میں گمراہ کرتے ہیں۔ (نحل/ ۲۵)

جو لوگ گمراہیوں کی پیروی کرتے ہیں ان کے گناہ، عذاب اور بوجھ کچھ کم نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنے کئے کے خود ذمہ دار ہوں گے ، یہ اور بات ہے جو لوگ سر کردہ لوگوں کو فریب دینے اور گمراہ کرنے کے ذمہ دار ہوں گے انہیں دوگنا عذاب ہوگا، ایک تو یہ کہ انہوں نے گناہ کا ارتکاب کیوں کیا؟ دوسرا یہ کہ دوسرے لوگوں کو گمراہ کیوں کیا؟ شاید اس دن'' کبراء'' میں ہم ان

لوگوں کو بھی موجود پائیں دنیا میں ہم جن کو بہت اچھے لوگ سمجھتے ہیں، جی ہاں! وہاں تو حساب ہی کچھ اور ہوگا ناں!۔

بہر حال ہمارے فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ہمارے تمام امور صحیح سمت اور صحیح سوچ پر مبنی ہوں البتہ شاید کچھ لوگ یہ کہیں کہ ہمیں سیاسی اور سماجی مسائل کی سمجھ نہیں آتی تو کیا ہم معاشرے سے الگ تھلگ ہو کر رہ جائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کام تو سعد بن ابی وقاص، حسن بصری اور ابو موسیٰ اشعری جیسے لوگوں نے کیا تھا، کیا الگ تھلگ رہنے سے فریضہ ٹل جائے گا؟ معاویہ نے سعد بن ابی وقاص سے پوچھا: ''تم نے میری بیعت کیوں نہیں کی؟'' تو اس نے جواب دیا: ''ایک مشکل کی وجہ سے!'' اس نے کہا: ''کونسی مشکل؟'' کہا: ''نہ پوچھو!'' مگر معاویہ نے اصرار کیا تو اس نے کہا: ''اگر اصرار کر ہی رہے ہو تو پھر سنو! میری مشکل یہ ہے کہ حضرت رسولِ خداؐ نے فرمایا: ''اَلْحَقُّ مَعَ عَلِی'' حق علیؑ کے ساتھ ہے (بحار جلد ۳۸ باب ۵۷ روایت ۱)'' مناسب تھا کہ معاویہ اس وقت اسے کہتا: ''او دل کے اندھے! تو نے جب فرمان حضورؐ سے سنا ہی تھا تو پھر علیؑ کی بیعت کیوں نہ کی؟ کیا تم خود اعتراف نہیں کر رہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ''اَلْحَقُّ مَعَ عَلِی'' تم نے علیؑ کا ساتھ کیوں نہ دیا؟''۔

ہیں کچھ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ احتیاط اسی میں ہے کہ کچھ نہ بولا جائے کیونکہ ممکن ہے غیبت میں شمار ہو، کس کی غیبت؟ ان کی جنہوں نے تلوار کو نیام سے اس لئے نکالا ہوا ہے تا کہ اسلام کا خاتمہ کر دیں، اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیں؟ اسلامی انقلاب کی تحریک کے اوائل میں جب امام خمینیؒ شاہ ایران کا نام لیتے تھے تو کچھ لوگ کہتے تھے ''یہ شیعہ بادشاہ کی غیبت ہے''۔

انسان کو چاہئے کہ اپنا فہم و ادراک وسیع کرے، اپنے فریضہ کو پہچانے، اسے سمجھے پھر سنجیدگی کے ساتھ اس پر عمل کرے، فریضہ اور اس پر عمل کی تشخیص کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی سے

کام نہ لے، ورنہ اراذل اوراوباش لوگوں کیلئے میدان کی راہیں کھل جائیں گی، جیسا کہ ہم آج کل دیکھ رہے ہیں۔

یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ''ووٹ میرا ہے میری مرضی میں جسے دوں!'' یہ ٹھیک ہے ووٹ آپ کا ہے اور مرضی بھی آپ کی ہے لیکن اس بات کو بھی پیش نظر رکھیں کہ ہم نے اپنے ہر ایک ووٹ کا حساب بھی دینا ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے اسی ووٹ سے ایک ایسا شخص کامیاب ہوجائے جو احکام اسلام میں سے کسی ایک حکم کے معطل کردینے کا موجب ہو اور ہزاروں لوگوں کو گناہ میں مبتلا کردے، تو ایسی صورت میں ہم ہر ایک کے گناہ میں برابر کے شریک ہوں گے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے ووٹ کا خود مالک ہے اور اس کا اختیار بھی اسے خود کو حاصل ہے، لیکن اسے اپنی ذمہ داری کا بھی احساس کرنا ہوگا، ہوسکتا ہے کہ ایک دن اس سے کہا جائے کہ تم ان تمام گناہوں میں برابر کے شریک ہو جو ملک میں فلاں سال سے فلاں سال تک ہوتے رہے ہیں اور ان گناہوں کا ارتکاب ملک کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے کیا ہے اس لئے کہ تم نے ووٹ دیا تھا کہ فلاں فلاں افراد ایوان اقتدار تک پہنچے، اگر تم ووٹ نہ دیتے تو یہ افراد بھی مسند اقتدار پر نہ بیٹھتے اور نہ ہی یہ غلط کام انجام پاتے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی عظیم ذمہ داریوں کا احساس کریں اور دیکھیں کہ ہماری محبت اور نفرت کا کیا معیار ہے؟ یہ دیکھیں کہ کسی کو زندہ باد یا مردہ باد کہہ رہے ہیں تو کس لئے؟ اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ ایک شخص کا کام یا ووٹ کس قدر اثر انداز ہوسکتا ہے کہ ہم کہیں کہ ایک آدمی کروڑوں لوگوں کے گناہوں میں شریک ہوجانا ہمارے لئے اتنا کافی ہے کہ نمونہ کے طور پر آغاز اسلام کے واقعات کی طرف توجہ کریں، کیونکہ اسی دوران سے فتنہ کی ایسی آگ بھڑکی ہے جس میں چودہ سو سال سے مسلمان جل رہے ہیں، کروڑوں ہی نہیں بلکہ اربوں اور کھربوں کی

تعداد میں لوگ اس دوران میں حقیقت کی راہ اختیار کرنے سے رہ گئے ہیں، اس فتنے کے بانی گنتی کے چند لوگ ہی تھے، مگر ان چند لوگوں نے ایسا کام کر دکھایا کہ آج تک اربوں کھربوں انسان گمراہ ہونے سے نہیں بچ سکے، اسی لئے وہ لوگ اپنے براہ راست گناہوں کا عذاب تو بھگتیں گے ہی ان گمراہ ہونے والوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھائیں گے۔

اسی وجہ سے ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ ایک شخص کا کام یا اس کا کردار زیادہ موثر نہیں ہے، خاص کر جب ایک ووٹ سے مثلاً امریکہ کا صدر کامیاب ہو جاتا ہے تو اس قسم کے موقع پر یہی ایک ووٹ اس حد تک موثر ہے جس سے نہ صرف امریکا بلکہ پوری دنیا کی قسمت بدلی جاسکتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام حضور سرورکائنات کی رحلت کے بعد ۲۵ سال تک خانہ نشین رہے اوراس عرصہ کے بعد جب مسند اقتدار پر متمکن ہوئے تو اپنی حکومت کا تقریباً پانچ سالہ دور جنگیں لڑتے گزار دیا، آخر کار آپ علیہ السلام کے سر مبارک پر تلوار کا وار کر کے شہید کر دیا گیا، اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تمام مسائل کی جڑ دو چیزیں تھیں ۱۔ حسد اور ۲۔ کینہ یہ تو عامل نہایت ہی خطرناک ہیں، لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم خود کو ان سے بچائے رکھیں، اور ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ ہماری محبت اور دشمنی کا معیار ایمان اور کفر ہو اگر کوئی شخص مومن اور دین کا حامی ہے اور اسلامی اقدار کی پاسداری کرتا ہے اسے اپنا دوست بنائیں اور اگر کوئی دین اور اسلامی اقدار کا دشمن ہے اس سے دشمنی رکھیں، اگر ہماری محبت اور اور دشمنی زندہ باد یا مردہ باد کا معیار ذات، برادری، دوستی پیسہ، عہدہ، منصب، پارٹی، نسل زبان وغیرہ ہوں تو ہم ایمان اور تقویٰ کے تقاضوں کے خلاف چلیں گے اور خداوند عالم کی بارگاہ میں ہمیں جواب دینا ہوگا۔

پوری گفتگو کا خلاصہ

مباحث کا یہ سلسلہ جو دس تقریروں پر مشتمل ہے اور کتاب کی اس جگہ تک پہنچا ہے ابتدا میں ہم نے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے فضائل اور ان کے اقسام کے بارے میں گفتگو کی اور بتایا کہ آپ کے کچھ فضائل غیر اختیاری، خدادادی اور غیر کسبی ہیں، یعنی ان فضائل کے وجود لانے میں آپؑ نے کوئی اقدام نہیں کیا، بلکہ یہ قدرت کی طرف سے عطیہ ہیں۔

جبکہ کچھ اور فضائل کسبی ہیں یعنی آپؑ کے اعمال اور کردار کی وجہ سے جو آپ نے انجام دیئے اور اختیاری طور پر بجالائے وہ فضائل وجود میں آئے مثلاً عبادات کی بجا آوری، اپنے خالق کے ساتھ مناجاتیں، جرأت اور بہادری کی بے مثال داستانیں اور راہ اسلام میں ایثار کے مختلف اور لاتعداد نمونے ان سب کا تعلق فضائل کے ساتھ ہے جو آپ نے اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ کسب کیئے۔

البتہ دوسرے صالح افراد کی مانند آپؑ بھی اعمال صالحہ کی بجا آوری میں خداوند عالم کی توفیق کے طلبگار ہوتے اور خالق کائنات سے مدد کی درخواست کرتے تھے لیکن ہر حالت میں اصل فعل کی بجا آوری آپؑ کے اپنے ارادہ اور اختیار میں تھی اور یہ آپ کی ذاتی خصوصیت تھی کہ کسی قسم کی جبر و کراہ کے بغیر صرف رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر آپؑ اعمال صالحہ انجام دیتے تھے۔

اسی طرح ہم نے اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا کہ آپ کے خداداد فضائل و مناقب کی دو قسمیں ہیں ایک تکوینی اور دوسرے تشریعی، مثال کے طور پر حضرات محمد و آل محمدؑ یعنی علی و فاطمہ اور دیگر تمام ائمہ معصومین علیہم السلام کا نور مقدس تاریخی طور پر مومنین اور توحید پرست افراد

کی صلبوں میں منتقل ہوتا رہا اور کسی مقام پر کفر اور شرک کی آلودگیوں سے ملوث نہیں ہوا، یہ ان کی ایک ایسی خدا داد تکوینی فضیلت ہے جس میں ان کو کسی قسم کا عمل دخل حاصل نہیں ہے۔

خدا داد تشریعی عطیہ بھی نام ہے ان مناصب کا جو خداوند عالم نے اپنے اولیاء کیلئے خاص مقرر کیا ہے، ان مناصب کا لازمہ ایک خصوصی فریضہ اور مخصوص حقوق ہیں، مثلاً خلافت اور ولایت کا منصب ہے جو خداوند متعال نے انہیں عطا فرمایا ہے یا بعض دوسرے تشریعی صورتیں ہیں جو آنجنابؑ کے ساتھ خاص ہیں، مثلاً خداوند عالم کی طرف سے ''سدابواب'' کے حکم کے صادر ہونے کے بعد باقی تمام لوگوں کے دروازے مسجد کی طرف کھلنے سے بند کر دیئے گئے مگر قدرت کے خصوصی حکم کے مطابق آپؑ کا دروازہ کھلا رہنا دیا گیا اور اس حکم کے صدور کیلئے آپؑ کا کوئی ذاتی عمل دخل نہیں تھا بلکہ خود خداوند عالم کی جانب سے ہی یہ حکم صادر ہوا اور یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو اللہ نے اہل بیت علیہم السلام کو عطا فرمایا ہے، یعنی یہ امتیاز فقط امیر المومنینؑ کو ہی حاصل نہیں ہے بلکہ حضرت فاطمہ زہراؑ اور حسنین شریفین علیہم السلام بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اہم ترین عطیہ الٰہی جس سے آپ کو نوازا گیا ہے اور جسے بہت زیادہ اہمیت دینی چاہئے اور جس کے ثابت کرنے کیلئے اور واضح طور پر بیان کرنے کے لئے ہمارے بزرگوں اور علمائے اسلام نے تاریخی طور پر کوششیں کی ہیں اور خون دل خرچ کیا ہے اور عمریں صرف کردیں ہیں وہ ہے آنجنابؑ کی خلافت اور امامت کا مسئلہ، ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس بارے میں مکمل طور پر حساس رہیں اور کوشش کریں کہ مطالعہ، تحقیق اور صحیح تجزیہ و تحلیل کے ساتھ اس سے نتیجہ اخذ کریں تاکہ فتنہ پردازوں اور شیطان صفت لوگوں کے دام فریب میں پھنسنے سے بچ جائیں۔

ایک اور نکتہ کہ جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ خداوند عالم کا تکوینی نوازشات سے

سرفراز کرنا صرف حضرت رسول خداؐ امیر المومنین اور ائمہ اطہار علیہم السلام ہی سے خاص نہیں بلکہ ان میں سے کچھ مراتب دوسرے لوگوں کو بھی عطا ہوئے ہیں، مثال کے طور پر بعض افراد مختلف جہات سے حد سے زیادہ نبوغ اور استعداد کے حامل ہیں، بعض اوقات کسی بچے کو ہم دیکھتے ہیں جو تین چار سال کی عمر میں ریاضی کے ایسے جدید ترین اور پیچیدہ ترین سوالات کو حل کر سکتا ہے کہ جنہیں ایک بیس سالہ نوجوان بھی سالہا سال دروس پڑھنے کے بعد بھی بڑی مشکل سے سمجھ پاتا ہے اور اس طرح کی کئی دوسری مثالیں ہیں، لیکن اس قسم کی استعداد اللہ تعالیٰ نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی حیثیت سے اپنے انبیاءؑ اور اولیاء کو عطا فرماتا ہے۔

یہاں پر جو سوال پیش آیا وہ یہ کہ آیا یہ امر اس بات کا موجب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی بندوں کے درمیان امتیاز اور تفریق برتتا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو وہ چیزیں عطا فرماتا ہے جو دوسرے لوگوں کو نہیں دیتا؟۔

تو اس کے جواب میں ہم نے کہا تھا کہ یہ بے جا امتیاز اور تفریق نہیں ہے، بلکہ عالم تخلیق میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ نظام کائنات ایک لازمی حصہ ہے، اگر تخلیق عالم میں یہ اختلاف نہ ہوتا کوئی بھی انسان معرض وجود میں نہ آتا، اگر خداوند عالم تمام چیزوں کو یکساں پیدا کرتا تو پھر انسانوں، حیوانوں اور نباتات میں بھی کوئی فرق نہ ہوتا، بلکہ سب کے سب یا تو انسان ہوتے یا حیوان یا پھر نباتات۔

فرض کیجئے کہ اگر ساری مخلوق انسان ہی ہوتی تو پھر انسان کس چیز کا گوشت اپنی غذا بناتا یا کونسی سبزی استعمال میں لاتا؟ اسی لئے عالم کی بقا ہی اختلاف کی مرہون منت ہے۔

یہ اختلاف بعض اوقات ایک نوع اور دوسری نوع کے درمیان ہوئے ہیں مثلاً انسان اور حیوان کے اختلاف، یا ایک صنف اور دوری صنف کے درمیان ہوتے ہیں جیسے مرد و زن کا

اختلاف ایک ہی صنف کے مختلف افراد کے درمیان ہوتا ہے جیسے افراد انسانی کی ذاتی خصوصیات ہیں۔

اسی بنا پر اگر خداوند عالم سب کو ایک جیسا خلق فرماتا تو یہ کائنات دوام کی حامل نہ ہوتی، اس قسم کے فرق اور اختلاف میں فقط کوئی اشکال ہی نہیں، بلکہ یہ تخلیق عالم کا ایک لازمی جزو بھی ہے اور تفریق امتیاز وہاں پر ممنوع ہے جہاں ''عدالت'' کی مخالفت ہوتی ہو اور عدالت کا سوال بھی وہاں پر پیدا ہوتا ہے جہاں پر کچھ لوگوں کے حقوق بنتے ہوں اور وہ اسے کسی کو نہ دیئے جائیں، لہٰذا انسان ہو یا کوئی دوسری مخلوق، اپنی تخلیق سے پہلے خدا کی ذات پر کسی قسم کا حق نہیں رکھتے تھے اور خداوند عالم بھی جو مصلحت سمجھتا ہے اور اس کی حکمت جس بات کا تقاضا کرتی ہے وہ موجودات عالم کو مختلف صورتوں اور مخصوص خصوصیتوں کے ساتھ پیدا کرتا ہے، البتہ ان میں سے کوئی بھی فرق بے مقصد نہیں ہوتا اور خدائی حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے تو وہ فرق بھی موجود ہوتا ہے، بہر حال صورت خواہ کچھ بھی ہو کسی کا خدا پر کوئی حق نہیں بنتا جسے پامال کیا جاتا ہو۔

ہاں البتہ، حکم عقل جس بات کا تقاضا کرتا ہے وہ یہ کہ جب خداوند نے اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت افراد کو استعداد، امکانات اور مختلف نعمتوں سے نواز دیا تو پھر فریضہ کی ادائیگی میں ہر شخص کو چاہیئے کہ مقدور بھر اپنے اس فریضہ کے بوجھ کو اٹھائے اور اسے برداشت کرے، فریضہ کی اطلاع مل جانے کے بعد جو شخص اسے انجام دے گا وہ اجر و ثواب اور انعام کا مستحق قرار پائے گا اور جو خلاف ورزی کرے گا وہ اسی کے مطابق سزا پائے گا، انہی آخری مرحلوں میں خداوند عالم کی عدالت کا اطلاق ہوتا ہے۔

جو فریضہ خداوند عالم کسی ایک کمزور شخص سے ادا دیکھنا چاہتا ہے وہ کسی ایک تنومند اور طاقتور شخص سے مساوی طور پر اسے نہیں دیکھنا چاہیئے اللہ تعالیٰ نے جو فرائض پیغمبر اکرمؐ اور

امیر المومنین علیہ السلام پر عائد کیے ہیں وہ ان کی شائستگی، لیاقت اور استعداد کے مطابق ہیں اور ان کی روحانی توانائی ان کے متحمل ہوسکتی ہے، وہ فرائض اسے ہم پر عائد نہیں کرنے چاہئیں، کیونکہ ہم ان کے لائق اور شائستہ ہی نہیں ہیں اور نہ ہی ان سے عہدہ برآ ہوسکتے ہیں، اسی طرح فرائض کے سونپنے اور اعلان کرنے کے بعد عدل خداوندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال و کردار کے مطابق جزا و سزا دے۔

بہر صورت خداوند عالم چونکہ جانتا تھا کہ اس کے کچھ اولیاء خاص جن میں سے ایک امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہا السلام بھی ہیں، ایسے ہیں کہ جنہیں تکوینی امتیازات سے نوازا جائے تو وہ ان سے زیادہ سے زیادہ حد تک استفادہ کریں گے لہٰذا انہیں کچھ تشریعی امتیازات بھی عطا فرما دیئے اس لئے کہ "اَللّٰهُ یَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ" خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کے امور کہاں مقرر کرے۔ (انعام ۱۲۴)

> اللہ تعالیٰ نبوت کا عہدہ ہر شخص کو نہیں دیتا بلکہ جس شخص میں ذاتی لیاقت موجود ہوتی ہے اسے عطا کرتا ہے، مثلاً یہ لیاقت کہ وہ وحی کے فرشتہ کے ساتھ رابطہ قائم کرسکتا ہو جبکہ دوسرے انسانوں میں یہ شائستگی نہیں ہوتی اور بعض اوقات عوامل موروثی بھی موثر ہوتے ہیں جو ان میں موثر ہوتے ہیں، جیسا کہ پروردگار سورہ آل عمران میں جب چند انبیا (مثلاً آدم، نوح اور ابراہیم علیہم السلام) کا نام لیتا ہے تو فرماتا ہے کہ یہ ایک خاندان چلا آرہا ہے جن میں پشت در پشت انبیاء اور اولیاء پیدا ہوتے آئے ہیں "ذُرِّیَّةً بَعۡضُهَا مِنۡ بَعۡضٍ" یہ وہ اولاد ہیں جو ایک دوسرے کی نسل سے چلی آرہی ہیں۔ (آیت ۳۴)

اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی شخصیت میں وراثت کا گہرا عمل دخل ہے اور روایات میں موجود ہے کہ ''حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء واجداد میں سے کوئی شخص نہ تو مشرک تھا نہ کافر اور نہ ہی بت پرست اور یہ وہ عوامل ہیں جو کسی کی شخصیت میں بہت زیادہ موثر ہوتے ہیں، جن کی بنا پر اسے تکوینی فضیلت سے نوازا جاتا ہے''۔

اس کے بعد بھی خداوند عالم کچھ لوگوں کو تکوینی امتیازات سے بہرہ مند فرماتا ہے وہ امتیازات نبوت، رسالت، خلافت، امامت اور دوسرے مناصب ہیں جو انبیاء اور اولیاء اللہ کو عطا ہوئے ہیں، البتہ وہ سب ایک جیسے رتبے پر فائز نہیں تھے، بلکہ ان میں باہمی فرق تھا ''تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ '' ہم نے ان پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی (بقرہ/۲۵۳) جو پیغمبر جس استعداد کا مالک تھا خداوند عالم نے اسے اسی کے مطابق شرف عطا فرمایا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کو ''تشریعی خلعت'' کے ساتھ آراستہ فرمایا اور آنجنابؑ کو لوگوں کا امیر اور فرمانروا قرار دیا، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ کی رحلت کے بہت سے لوگ اس بات کے ماننے سے انکار کر دیا اور آپؐ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا اور اس مخالفت کے اسباب و وجوہات پر اجمالی طور پر بحث ہو چکی ہے، دنیا کی حرص، حسد اور کینہ یہ ایسے تین عوامل واسباب ہیں جنہوں نے فتنہ گروں کے سرداروں کو حضرت علی علیہ السلام کی خلاف اکسایا اور ان کی مخالفت پر مکمل طور پر آمادہ کر لیا، البتہ عوام الناس کی مخالفت کی وجہ سے ان کی عدم معرفت، ناآگاہی اور لاعلمی تھی۔

البتہ اس بارے زمانہ جاہلیت کی رسوم، وڈیروں اور سرداروں کی اطاعت، روسائے قبائل کی فرمانبرداری، اندھا تعصب اور قومی وقبائلی تنازعات بھی بے تاثیر نہیں تھے، مگر سب سے

بڑا اور قابل توجہ عامل جن سے عوام الناس کو مولا علی علیہ السلام کے خلاف اکسایا گیا وہ لوگوں کی بے علمی اور عدم معرفت تھی جس کی وجہ سے انہیں بڑی آسانی کے ساتھ دھوکہ دیا گیا اور خواص یعنی فتنہ کے سرداروں نے اس عامل سے خوب فائدہ اٹھایا اور علی علیہ السلام کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور آپ علیہ السلام کی شخصیت کو داغدار ہی نہیں کیا بلکہ مجروح اور چور چور کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب شام میں یہ خبر پہنچی کہ "حضرت علیؑ کو مسجد میں شہید کر دیا گیا ہے" تو لوگ تعجب سے پوچھنے لگے کہ "آیا علیؑ نماز بھی پڑھتا تھا؟" جی ہاں نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک عرصہ دراز -عمر بن عبدالعزیز کے دور- تک حضرت علی علیہ السلام پر مسجدوں میں سب ہوا کرتا تھا اور یہی لوگ منبر کے نیچے بیٹھ کر سب میں شرکت کیا کرتے تھے، اپنی نماز کی قنوت میں آپؑ پر سب وشتم کیا کرتے تھے اور حالات تو یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ جب عبداللہ بن زبیر نے مکہ میں حکومت تشکیل دی اور نماز جمعہ لوگوں کو پڑھانا شروع کی تو وہ نماز میں جمعہ کے خطبوں میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات نہیں بھیجتا تھا، بنی ہاشم کے ساتھ بغض وعناد کی وجہ سے وہ اپنے اس کام کی توجیہ میں کہتا تھا کہ "اگر میں پیغمبرؐ پر درود بھیجوں تو بنی ہاشم کے جو افراد اس جگہ موجود ہوتے ہیں وہ اپنی ناک پھلانے لگ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول خداؐ ہمارے خاندان سے تھے" میں اس لئے رسول خداؐ پر درود نہیں بھیجتا تاکہ یہ لوگ اپنی سربلندی کا احساس نہ کریں" غضب کی بات تو یہ ہے کہ انہی "مسلمانوں" نے اس حکومت کو بھی اسلامی حکومت کے طور پر تسلیم کیا ہوا تھا یعنی جو حکومت پیغمبر اکرمؐ کی نیابت اور جانشینی میں قائم ہوئی مگر اس کا حاکم پیغمبرؐ پر صلوات بھیجنے سے انکاری ہے۔

یہ لوگ عدم معرفت، بے علمی، نادانی اور جہالت کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یہ ایک ایسی عظیم مصیبت ہے جس سے شیطان صفت لوگ خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہم آج بھی اس قسم

کے نمونے دیکھ رہے ہیں۔

البتہ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں علاوہ اس پروپیگنڈا کے جو اس دوران امیرالمومنین علیہ السلام کے خلاف کیا جاتا رہا، چند ایک عوام کا بھی موثر عمل دخل رہا اور شاید یہ عوامل دیگر تمام عوامل سے زیادہ موثر تھے، ایک لالچ اور دوسرا دھونس۔

غرض مذکورہ تمام عوامل مل کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ساتھ لوگوں کی مخالفت کا موجب بن گئے اور بات آنجنابؑ کے ساتھ جنگ تک پہنچ دی اور یہی عوامل تاریخی طور پر ہمیشہ کیلئے اسلامی امہ کو دامن گیر ہونے والے فتنوں کے برپا کرنے میں بڑا موثر ثابت ہوتے چلے آرہے ہیں۔ تمام شد

ضمیمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ اسلام میں ''غدیر'' اور ''سقیفہ'' کا تقابل

غدیر ایک نہایت اہم واقعہ:

واقعہ غدیر کے کئی مختلف پہلو ہیں، جن میں سے ہر ایک عظیم اور تفصیلی بحث کا متقاضی ہے وراس بارے میں بہت زیادہ زحمات کی گئی ہیں، لاتعداد بحثیں عمل میں آچکی ہیں، بے انتہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس قدر کام ہو چکا ہے جس کی صرف فہرست یہاں پر درج کرنا مشکل ہے۔

میں اپنے عزیز بھائیوں سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ نکال کرخواہ تعطیلی ایام میں سہی ان مسائل کا ضرور مطالعہ کریں، ہمارے بزرگ علماء ومحدثین نے ان ۱۴ صدیوں میں ہزاروں مشکلات جھیلنے کے بعد ہمیں ایک قابل قدر ذخیرہ عطا فرمایا ہے کہ ہم ان کی تکالیف اور مشکلات سے اجمالی طور پر بھی اچھی طرح آگاہ نہیں ہیں۔

ان بزرگوں نے خون دل کے ساتھ اس موضوع پر لاتعداد کتابیں ہمیں فراہم کی ہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی ایک مدارک اور منبع کے حصول کیلئے انہیں کئی کئی سال تک محنت کرنا پڑتی تھی، طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے کسی کتاب خانے یا لائبریری تک رسائی حاصل کرتے اور کسی معتبر حوالے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

اس بارے میں کی جانے والی کوششوں کے نتیجے میں دو کتابیں ایسی ہیں جنہیں جو دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہیں اور اپنی نوعیت کا ایک شاہکار ہیں، ان میں سے ایک کتاب شریف

''عبقات الانوار'' جو مرحوم حامد حسین ہندی اعلی اللہ مقامہ کی تالیف ہے اور ابھی تازہ بارہ جلدوں میں اس کا خلاصہ بنام ''نفحات الازهار خلاصه علی عبقات الانوار'' شائع ہو چکا ہے

اس بزرگوار عالم نے اس زمانے میں یہ کتاب تالیف فرمائی ہے جب کتاب وطباعت اور نشر واشاعت کے موجودہ ترقی یافتہ وسائل ناپید تھے، مرحوم نے بڑی عرق ریزی اور زحمتوں کے ساتھ اس کتاب کو مرتب فرمایا، ہندوستان میں بڑی مشکلات کے باوجود انہوں نے ایک کتاب خانہ (لائبریری) کو تلاش کیا اور اس عظیم کتاب کی تالیف کرنے میں کامیاب ہوئے، آپ کی یہ تالیف تشیع، اہل بیتؑ اور اسلام کی عظیم خدمات میں شمار ہوتی ہے، لیکن اس کا مطالعہ ایک لمبے عرصے اور طویل فرصت کا متقاضی ہے، لیکن اس کتاب کا خلاصہ ایک طرح کی آسانی پیدا کر سکتا ہے۔

اسی موضوع پر لکھی جانے والی ایک اور عظیم کتاب جو واقعاً ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، وہ علامہ امینی اعلیٰ اللہ مقامہُ کی تالیف کردہ کتاب ''الغدیر'' ہے جسے مرحوم نے بہت بڑی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنے کے باوجود تالیف فرمایا۔

ہمارے بزرگ بعض اوقات ایک کتاب حاصل کرنے کیلئے مدتوں تک مختلف شہروں اور علاقوں کی خاک چھانتے حتیٰ کہ بسا اوقات اس کے حصول کیلئے ائمہ اطہار علیہم السلام سے متوسل ہوتے تھے اور اس قسم کے توسلات میں عجیب وغریب کرامات ظاہر ہوتی تھیں، چنانچہ الغدیر کی تالیف بھی علامہ مرحوم کیلئے اس طرح کی کرامات دیکھنے میں آئیں۔

نمونہ کے طور پر ایک کرامت کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ کہ علامہ امینی کو ایک خاص کتاب کی ضرورت پڑ گئی جو نایاب تھی تو مرحوم نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام یا حضرت امام موسی بن جعفر علیہ السلام سے توسل کر کے اسی کتاب کے حصول کی درخواست کی تو ایک دن روسی

آذر بائیجان سے ایک مسافر وہی کتاب ان کیلئے لے آتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ میں بازار میں تھا ایک بوڑھی عورت نے اصرار کیا کہ یہ کتاب علامہ کیلئے لے جاؤ ممکن ہے کہ علامہ اس استفادہ کریں لہٰذا کتاب حاضر خدمت ہے، علامہؒ نے جب دیکھا تو یہ وہی کتاب ہے جسے وہ کئی سالوں سے تلاش کر رہے تھے اور امام پاکؑ سے متوسل بھی ہوئے تھے۔

''الغدیر'' بھی ایک مفصل کتاب ہے جس کا خلاصہ ایک عالم بزرگوار نے ''فی رحاق الغدیر'' کے نام سے کیا ہے جو ایک جلد میں ہے اور یہ کام ان لوگوں کیلئے ایک شایان شان خدمت ہے جو مکمل کتاب (الغدیر) کے پڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتے یا ان کے پاس اس قدر وقت نہیں ہے کم از کم اس کے خلاصہ کو پڑھ کر اجمالی طور پر یہ اندازہ لگائیں کہ دینی حقائق کے اثبات کیلئے ہمارے بزرگوں نے کس قدر تگ و دو کی ہے اور کٹھن مصائب کا سامنا کیا ہے، جس سے یہ دین اور مذہب ہم تک پہنچا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ یہ تصور کریں کہ ان مسائل میں تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ اس قدر واضح اور روشن ہیں جن کے اطراف کے مطالعہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں، حالانکہ یہ تصور صحیح نہیں ہے بلکہ دشمن کی طرف سے غافل کرنے کا ایک موثر ہتھیار ہے، حتیٰ کہ ایک اسلامی جمہوری ملک میں جس کا سرکاری مذہب شیعہ ہے اس کے سرحدی شہروں میں دشمن کے ایجنٹ عجیب وغریب کارنامے انجام دے رہے ہیں جن کی وجہ سے بہت سے ناسمجھ لوگ گمراہ ہور ہے ہیں، لہٰذا ہمارے علماء اور مبلغین کا فرض بنتا ہے کہ وہ جہاں بھی تبلیغ وارشاد کیلئے جائیں اس بارے میں ان کی مکمل تیاری ہونی چاہئے علمی دلائل کے اسلحہ سے پوری طرح مسلح ہوں۔

مسائل کو سنجیدگی سے لیں خطرات بہت زیادہ ہیں پوری معلومات وآگاہی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا ہوگا، مسائل ومعاملات کو سطحی نہیں سمجھنا ہوگا، ورنہ ممکن ہے کہ ایک روز ہماری آنکھ

کھلے تو دیکھیں کہ شیعوں کی ایک بہت بڑی تعداد مذہب سے ناواقفیت کی بنا پر، مذہب سے ہی ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔

غدیر کا مقتل سقیفہ

حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی خلافت اور ولایت کے بارے میں خداوند عالم نے قرآن مجید میں متعدد آیات نازل فرمائی ہیں اور خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنی حیات مبارکہ کے دوران متعدد تمہیدوں اور بے شمار بیانات کے ذریعے اس مسئلے کو لوگوں کے کانوں تک پہنچایا اور آپ کی کوشش رہی ہے کہ اپنی رفتار اور گفتار کے ذریعہ یہ بات امت کے اذہان میں پختہ کر دی جائے، حتیٰ کہ اپنی رحلت سے ستر دن پہلے آپؐ نے آخری اقدام کے طور پر غدیر خم کے مقام پر امت کے ایک کثیر انبوہ میں اس کا عملی طور پر اعلان فرمایا تا کہ مسئلہ خلافت اسلامی امہ کیلئے روز روشن کی طرح واضح ہو جائے اور پیغمبر اکرمؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد امت اختلاف، افتراق اور انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔

لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آنحضورؐ کی وفات حسرت آیات کے فوراً بعد مسلمانوں نے اس کے بالکل برعکس عمل کیا، ان مسلمانوں میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے رسول پاکؐ کے ہمراہ متعدد جنگوں میں شرکت کی تھی، حتیٰ کہ زخم بھی کھائے تھے اور وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے کثیر سرمایہ اسلام کی ترویج واشاعت میں خرچ کیا تھا، کچھ لوگ وہ تھے جن کا تعلق خانوادۂ شہداء سے تھا اور اس سے بالاتر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ لوگوں کا تعلق ان افراد سے تھا جو بذات خود غدیر خم کے مقام پر موجود تھے اور امیرالمومنین علی علیہ السلام کے تعارف کو اپنی آنکھوں سے

دیکھا اور کانوں سے سنا تھا، لیکن زیادہ عرصہ نہیں صرف ستر روز گزرنے کے بعد ہی سب کچھ گویا فراموش کر دیا، انہوں نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ جونہی آنحضرتؐ کی آنکھیں بند ہوئیں ان کے نزدیک سب کچھ نہ ہونے کے برابر ہو گیا۔

ابھی آپؐ کا جنازہ دفن نہیں ہوا تھا کہ کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے تا کہ آنحضرتؐ کے جانشین (خلیفہ) کا انتخاب کیا جائے ان کی دلیل اصل میں یہ تھی کہ ''اسلامی امہ کا ایک رہبر ہونا چاہیئے اور ایک دن کے لئے بھی لوگ رہبر کے وجود سے محروم نہ ہوں'' جو صحیح بات بھی ہے، مگر اس رہبر کی شناخت اور تقرر میں انہوں نے سخت غلطی کا ارتکاب کیا، وہ مقام ''سقیفہ'' میں اکٹھے ہوئے اور اس مسئلہ پر ان کی بحث شروع ہوگئی کہ ''کس شخص کو رسول خداؐ کے جانشین (خلیفہ) کے طور پر انتخاب کریں؟''۔

کافی بحث ہوتی رہی حتی کہ بعض اوقات تو نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچ جایا کرتی تھی لیکن جس چیز کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی - یا کم از کم تاریخ میں اس کی طرف اشارہ نہیں ملتا، اگر کوئی بات ہوتی تو یقیناً اس اجتماع میں اس کا اثر ضرور ہوتا اور تاریخ میں بھی اس کا ذکر ضرور ملتا - یہ کہ سرکار رسالتمآبؐ نے کس کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا؟ وہاں پر کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ آج سے ستر دن پہلے غدیر خم کے مقام پر کیا ماجرا رونما ہوا؟ حضور پاکؐ نے کیوں حضرت علیؑ کو بلند کر کے فرمایا: ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ'' جس کا میں مولا ہوں ہی علیؑ بھی اسی ہی کا مولا ہے (بحارالانوار جلد ۸ باب ۴ روایت ۱) اس بارے تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی، وہاں تو اور بولیاں بولی جاتی رہیں، کسی نے کہا: ''رسول خداؐ کا خلیفہ مہاجرین میں سے ہونا چاہیئے'' کسی نے کہا: ''یہ خلیفہ انصار میں سے ہونا چاہیئے'' اور کسی نے کہا: ''خلیفہ تو قریشی ہی کو ہونا چاہیئے'' آخر میں رائے شماری ہوئی اور ایک شخص کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا، لیکن اس بارے میں کسی نے

یہ نہیں کہ "خود رسول خداؐ نے کس کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تھا؟" یا کم از کم حضورؐ کا کس کی طرف زیادہ رجحان تھا؟ بالکل کوئی بات نہیں ہوئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد غدیر کا واقعہ اس سانحہ کا شکار ہو گیا کہ بہت سے مسلمان داستان غدیر سے بالکل بے خبر ہیں اور مکتب خلفاء کے علماء تو اس بات کے مدعی ہیں کہ اس ماجرا کی کوئی حقیقت ہی نہیں، حالانکہ صاحب عبقات اور صاحب الغدیر جیسے بزرگ علماء زحمتیں اٹھا کر، تکلیفیں برداشت کر کے اس واقعہ کو ثابت کیا ہے کہ شیعہ اور سنی روایات کی رو سے یہ واقعہ رونما ہو چکا ہے اور اس میں کسی قسم کا شک اور شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، جن روایات کو ان بزرگواروں نے نقل فرمایا ہے، راویوں کی کثرت اور ان کے معتبر ہونے کے باوجود ان کا انکار کر دیا جائے تو پھر شیعہ سنی مجموعی روایات کتنا باقی رہ جائیں گی جو قابل قبول ہوں گی؟ پھر بھی مکتب خلفا سے تعلق رکھنے والے علماء اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ "ایسا کوئی واقعہ سرے سے رونما ہی نہیں ہوا" یا کہتے ہیں کہ "یہ شیعوں کی گھڑی ہوئی داستان ہے" حالانکہ غدیر سے متعلقہ عمدہ روایات مکتب خلفاء کے حوالوں اور کتابوں سے نقل کی گئی ہیں۔

بہر صورت اس بارے سوچنے والی اہم بات یہ ہے کہ اس معمہ کو کیونکر حل کیا جائے؟ جبکہ اس واقعہ سے تعلق رکھنے والی تمہیدیں اور آیات کا نزول کس لئے بے نتیجہ ہو گیا؟ اور کیوں طاق فراموشی کی نذر ہو گیا؟۔

یہ کوئی معمولی مسئلہ تو نہیں تھا کہ جسے آسانی کے ساتھ فراموش کر دیا جاتا بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ" "اے رسولؐ! جو کچھ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو اگر تم نے

یہ نہ کیا تو اس کی رسالت کو نہیں پہچایا (مائدہ/۶۷) خداوند تعالیٰ کی نظر میں یہ مسئلہ اس قدر اہم تھا کہ اگر آپؐ اس کام کو انجام نہیں دیتے تو گویا پوری رسالت کا کوئی کام ہی انجام نہیں دیا۔

معلوم ہے کہ رسالت کے پیغام پہنچانے سے مراد صرف یہی خاص - امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت اور خلافت کا - پیغام ہی نہیں تھا، کیونکہ ایسی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ''اگر آپؐ نے یہ پیغام نہ پہنچایا تو گویا اسی پیغام پہنچانے کا فریضہ انجام نہیں دیا'' ظاہر ہے ایسا کہنا حکیمانہ گفتگو کے خلاف ہے اور ایسا کہنا خدا کی ذات سے بعید ہے بلکہ اس کے معنی یوں ہوں گے ''اگر اس خاص پیغام - خلافت علی بن ابی طالب علیہ السلام - کو نہ پہنچایا تو خدا کی طرف سے رسالت اور نبوت کی ماموریت کو انجام نہیں دیا اور آپ کی گزشتہ ۲۳ سال کی تمام محنت ضائع ہو جائے گی''۔

یعنی رسولؐ پاک کی رسالت کا اعتبار اسی مسئلے سے وابستہ ہے، اگر یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا، اصل رسالت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ اگر حضرت رسالتمآبؐ کے بعد حضرت علی علیہ السلام نہ ہوتے تو یقینی بات ہے کہ اسلام کا نام ونشان باقی نہ رہتا، اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت ۲۵ سال تک حضرت علی علیہ السلام کی اطاعت سے سرکشی کرتی رہی لیکن پھر بھی آنجنابؑ کا وجود اور ان کی تعلیمات اس بات کا باعث بنیں کہ اسلام اسی حد تک باقی رہا۔

سقیفہ کا ماجرا دہرایا گیا

اس فراموشی کے عظیم معمہ کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟ ہمیں اس ماجرا سے کیا سبق ملتا ہے؟ آیا یہ امر ایک ایسا حادثہ ہے جو تاریخ میں صرف پہلی بار واقع ہوا ہے اور اس طرح کا کوئی اور ماجرا وقوع پذیر نہیں ہوا؟ بلکہ اصولی طور پر اس قسم کے معاشرتی حوادث فقط ایک مرتبہ رونما ہوتے

ہیں دہرائے نہیں جاتے؟۔

کم از کم قرآنی نقطہ نظر سے ایسا نہیں ہے اور قرآن کہتا ہے کہ تاریخی حوادث ہمیشہ دہرائے جاتے رہتے ہیں اور اس جیسے واقعات کا زمانہ مستقبل میں بھی دہرایا جانا ممکن ہے اصولی طور پر تاریخ کے اہم ترین واقعات کے ذکر کا فلسفہ یہی ہے کہ ہم ان اپنی سے موجودہ زندگی کیلئے سبق حاصل کریں ورنہ تاریخ میں ایسے واقعات رونما ہو کر ختم ہو چکے ہیں۔

اس حدیث کو فریقین (شیعہ وسنی) کتب میں نقل کیا گیا ہے اور اس کا مضمون قرآن میں بھی بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جہاں جہاں بنی اسرائیل نے قدم رکھا ہے تم بھی وہیں پر قدم رکھو گے، جس راستے پر وہ چلے ہیں تم بھی چلو گے'' حَتّٰی لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْهُ ''حتی کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں بھی داخل ہوتے ہیں تم بھی ضرور داخل ہو گے''۔

نیز قرآن مجید جو بار بار بنی اسرائیل کی داستان کو بیان کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جیسے واقعات سے ہمیں بھی دو چار ہونا پڑے گا۔

اسی لئے ہمیں خبردار رہنا پڑے گا کہ کسی غلطی کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں، اگر بنی اسرائیل میں سامری پیدا ہوا اور اس نے لوگوں کو اپنے فریب میں مبتلا کر کے گمراہ کر دیا تو ہمیں بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اسلامی اُمّہ میں بھی کوئی سامری پیدا ہو کر اسے گمراہ کر سکتا ہے، بلکہ ہر دور اپنا ایک سامری کا حامل ہوتا ہے، بنی اسرائیل کی دوسری داستانیں بھی اسی قسم کی ہیں۔

اگر ہم آج داستان غدیر کو نقل کرتے ہیں تو اس لئے کہ ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے اور اوائل اسلام کے مسلمانوں جیسی غلطی نہیں دہرانی چاہئے کہ حضور اکرمؐ کے فرمان کی اطاعت نہ کریں۔

حیرت ہے کہ جو لوگ جان ہتھیلی پر رکھ کر پیغمبرؐ خدا کی معیت میں جنگ اور جہاد میں

شرکت کرتے رہے انہیں کیا ہو گیا تھا کہ علیؑ کی خلافت کے بارے میں فرمان پیغمبرؐ کو پس پشت ڈال دیا؟۔

جو لوگ سقیفہ میں جمع ہوئے وہی تو تھے جنہوں نے بدر سے لے کر حنین تک کی جنگوں میں شرکت کی تھی، ہنوز ان میں سے بہتروں کے بدن پر جنگ کے زخموں کے نشان باقی تھے، پتہ نہیں انہوں نے کیونکر اس بات کو بھلا دیا تھا کہ حضرت رسالتمآبؐ نے کسی شخصیت کو اپنے جانشین کے طور پر متعارف کرایا تھا؟ اور جو لوگ اس ماجرا کو جانتے تھے آخر کس بنا پر سقیفہ کے ماجرا کی مخالفت نہیں کی؟۔

آیا اس قسم کے واقعات ہمارے لیئے قابل تکرار نہیں ہیں؟ آیا اس زمانے میں جو لوگ نیکیوں کا ارتکاب کرتے رہے وہ کسی وقت غلطی کے مرتکب نہیں ہو سکتے؟ آیا انہیں خطرات کا سامنا نہیں ہو سکتا؟ آیا اب وہ غفلت اور خواہشات نفسانی کا شکار نہیں ہو سکتے؟ اور دجالوں اور سامریوں کے دھوکے میں نہیں آ سکتے؟ قرآن تو کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ بھی دھوکے میں آ سکتے ہیں ارشاد ہوتا ہے: ''اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ'' آیا تم گمان کرتے ہو کہ (سیدھے) بہشت میں چلے جاؤ گے؟ اور گزشتہ لوگوں کی داستانیں تمہارے درپیش نہیں آئیں گی؟ (بقرہ/۲۱۴) جو مشکلات سابقہ لوگوں کو پیش آتی تھیں وہی تمہیں پیش نہیں آئیں گی؟ تمہیں بھی پیش آئیں گی، تمہارا بھی کٹھن امتحان ہو گا، خدا نے امتحان لینا بند نہیں کر دیا ..... اس دور میں وہ لوگ بھی تھے جو کہتے تھے علیؑ ابھی جوان ہیں، فی الحال بوڑھوں کو حکومت کرنے دو، علیؑ جب بوڑھے ہوں گے تو ان کی باری بھی آ جائے گی، ہمیں ہر صورت میں خبردار رہنا چاہیئے اور تاریخ سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے کہ کیا چیز مسلمانوں کے سقوط کا سبب بنی؟ کیا بات تھی جس سے مسئلہ ولایت کو فراموش کر دیا گیا؟۔

اس زمانے میں کچھ لوگ تھے جو علی علیہ السلام کے ساتھ ذاتی دشمنی اور بغض وحسد رکھتے تھے، اسی لئے کہتے تھے کہ ہم اس کی اتباع کیوں کریں؟ اگر وہ قریشی ہے تو ہم بھی قریشی ہیں، اگر اطاعت اور اتباع کا دارومدار قریشی ہونے پر ہے ہماری ہاشم کے ساتھ نسبت اس سے زیادہ نزدیک ہے، تو پھر ہم اس کے کیوں تابع فرمان بنیں۔

کچھ لوگوں کی علی علیہ السلام کے ساتھ مخالفت اس لئے تھی کہ وہ جانتے تھے کہ اگر علیؑ برسر اقتدار آگئے تو ان کے ذاتی مفادات کو زک پہنچے گی، لہٰذا وہ کہتے تھے بہتر ہے ہم ایسے شخص کی بیعت کریں جس کی وجہ سے ہمیں ذاتی مفادات کے حاصل ہونے کا اطمینان ہو اور بیت المال سے ہمیں دوسروں کی نسبت زیادہ حصہ ملے گا اور ہم دوسروں سے زیادہ مالا مال ہو جائیں گے۔

ہم غدیر اور خلافت امیر المومنین علیہ السلام کی طرف توجہ اس لئے مبذول کرانا چاہتے ہیں اور بار بار اسی پر زور دے رہے ہیں تا کہ ہم خبردار اور ہوشیار رہیں اور دیکھیں اور غور کریں کہ گزشتہ لوگ کیوں اور کس لئے فریب میں آگئے اور دھوکہ کھایا؟ تا کہ ہم اس سے نصیحت حاصل کریں اور کوشش کریں اس فریب کا شکار ہم نہ ہو جائیں، وہ دھوکہ ہم نہ کھائیں، اس دن یہ بات کہ علی علیہ السلام خلیفہ ہوں یا کوئی اور بظاہر اس قدر اہم نظر نہیں آتا تھا، اس لئے کہ اسلامی حکومت کی وسعت تھی ہی کس قدر؟ مسلمانوں کی کیا تعداد تھی؟ مسلمانوں کے پاس کس قدر مال وثروت تھی؟ اسلامی مملکت کے دارالحکومت -شہر مدینہ- کی کتنی آبادی تھی؟ کچی اینٹوں یا گارے سے بنے ہوئے چند گھروں اور کھجور کے چند درختوں کے علاوہ وہاں تھا ہی کیا؟ جو پیغمبر اسلام کا جانشین بنتا اسے حاصل ہی کیا ہوتا؟ فقط زکوٰۃ کی مختصر سی آمدنی تھی جو فقراء اور مساکین میں تقسیم ہو جاتی اس کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

اس زمانے میں بہت سے لوگ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اسلام اور تاریخ میں کتنا عظیم رخنہ

ایجاد کیا جا رہا ہے؟ اور کس قدر ان کے راستوں کو تبدیل کرنے کی بنیاد ڈالی جا رہی ہیں؟ وہ سمجھتے تھے کہ ایک سادہ اور معمولی سا مسئلہ درپیش ہے خود اسے کہتے تھے کہ چونکہ حضرات ابی بکر و عمر پیغمبرؐ خدا کے بیویوں کے باپ یا رسول خداؐ کے سسر ہیں لہٰذا یہ سب سے زیادہ قابل احترام ہستیاں ہیں فی الحال انہیں حکومت کرنے دی جائے بعد میں علی علیہ السلام کی باری بھی آ جائے گی۔

جو لوگ اس طرح کی سادہ سوچ رکھتے تھے انہیں یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ کیا خود رسول خداؐ متوجہ نہیں تھے کہ انؐ کے سسر، انؐ کے داماد سے عمر میں زیادہ ہیں؟ تو حضور نے خود انہیں کیوں مقرر نہیں فرمایا تھا؟ آخر اس بات میں کیا راز تھا کہ غدیر کے دن اس قدر عظیم تعداد کو کڑکتی دھوپ میں بٹھا کر، اس قدر لمبی چوڑی تمہید باندھ اور مقدمہ بنا کر لوگوں سے ان الفاظ میں اقرار لیں ''أَلَسْتُ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ؟'' کیا میں مومنوں کی نسبت ان پر زیادہ تصرف کا حق نہیں رکھتا؟ (بحار الانوار جلد ۲۸ باب ۳ روایت ۳) آیا میں نے اچھی طرح رسالت کے فرائض انجام نہیں دیدیئے؟ کیا تم مجھے رسول مانتے ہو؟ کیا تم میری اطاعت اپنے اوپر واجب سمجھتے ہو؟''۔

تو یہ سب باتیں کس لئے تھیں؟ اوائل اسلام کے لوگ ان مطالب کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوئے؟ ان مسائل پر مطلقاً غور کرنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی۔

سقیفہ کے ماجرا میں جو لوگ بزعم خود بہت ہی ہوشیار، موقع شناس اور مفاد پرست تھے اور لوگوں کو فریب دینے اور پروپیگنڈا کے ماہر تھے آگے بڑھے تو کچھ سادہ لوح ناتجربہ کار اور بے معرفت تھے اور کچھ ذاتی خواہشات اور غرض کے بندے تھے ان کے پیچھے لگ گئے اس طرح ان کی کوششوں سے اسلام اپنی اصلی راہ سے ہٹ گیا۔

یہ واقعات ہمارے لئے سبق آموز ہیں، ہم یہ نہ سمجھیں کہ جس شخص کی داڑھی سفید ہے

یا اس کی اسلامی خدمات زیادہ ہیں وہ حتمی طور پر دوسروں سے زیادہ اور بہتر سوجھ بوجھ رکھتا ہے ہماری سوچ یہ نہیں ہونی چاہئے کہ جو شخص ہماری ذاتی یا گروہی یا قومی اور برادری یا پارٹی کے مفادات پورے کرتا ہے وہ یقیناً اسلامی مفادات کا بھی محافظ ہوتا ہے ہمیں وسعت نظر سے کام لینا ہوگا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اوائل اسلام کے مسلمانوں کی طرح کوئی ایسا کام کر بیٹھیں جس کا خمیازہ ہمارے بعد آنے والے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو بھگتنا پڑے، ہمارا کردار صرف موجودہ نسل تک ہی محدود نہیں رہے گا آنے والی نسلوں کی زندگی اور تقدیر سے بھی اس کا تعلق ہوگا۔

ہمیں اپنے کردار اور اپنی ذمہ داریوں پر خاص نظر رکھنا ہوگی اور کوشش کرنا ہوگی کہ ہمارے تمام کام خداوند عالم کی رضا کیلئے انجام پائیں، پہلے اپنے شرعی وظیفہ کی تشخیص دیں پھر اس پر عمل کریں۔

یہ ان مسائل کا ایک اہم حصہ ہے جن کیلئے ہم غدیر اور اس نوع کی دوسری داستانوں سے استفادہ کریں، اگرچہ تمام تاریخی حوادث سبق آموز نصیحتوں کے حامل ہیں لیکن واقعہ غدیر خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کا ایک ہی موقف

"اسلام اور اسلامی معاشرہ کی حفاظت"

اسی سلسلے میں ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے کہ جب خلافت اپنے اصل راستہ سے ہٹ گئی تو پھر اس سارے عرصہ میں حضرت علی علیہ السلام کا کیا ردعمل رہا؟ کیونکہ بعض اوقات ہمارے بعض مومنین کی تعبیر یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام روٹھ کر اپنے گھر بیٹھ گئے، یا یہ کہتے ہیں کہ ۲۵ سال تک خانہ نشین ہو گئے، تو اس قسم کی باتیں درست نہیں ہیں، کیونکہ ایسے لوگوں کی سوچ کے

برعکس حضرت امیر المومنین علیہ السلام معاشرتی مسائل میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک رہے حضرات خلفاء کرام جب کسی مشکل سے دوچار ہوتے فوراً آپؑ کے دروازے پر حاضر ہوتے، چنانچہ مکتب خلفاء کے بہت سے علماء نے اپنی روایات کی معتبر کتابوں میں حضرات شیخین کے متعدد فیصلوں کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس بارے میں آپؑ سے رہنمائی حاصل کی اور اگر آپ علیہ السلام نہ ہوتے تو وہ حضرات امور مملکت چلانے میں ناکام ہوجاتے، خود ان ہی علماء نے حضرت عمر کی زبانی نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''لاَ اَبْقَانِیَ اللّٰهُ لِمُعْضِلَةٍ لَیْسَ لَهَا اَبُو الْحَسَن '' خدا مجھے اس مشکل کیلئے زندہ نہ رکھے جس کے (حل کرنے کے) لئے ابوالحسن (علی علیہ السلام) نہ ہوں۔ (بحار الانوار جلد ۴۰ باب ۹۳ روایت ۵۴)

اسی طرح یہ بھی منقول ہے کہ خلیفہ دوم نے بارہا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''لَوْلاَ عَلِیٌّ لَهَلَکَ عُمَرُ'' اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہوجاتا (ایضاً) بلکہ بہت سارے موقعوں پر خلفاء حضرات نے جنگی مسائل میں بھی آپؑ سے مشورہ لیا اور آپ علیہ السلام مشوروں کے مطابق عمل کیا، اگر حضرت امیر علیہ السلام روٹھ چکے ہوتے تو پھر یہ روایات کہاں جائیں گی۔

پس یاد رکھئے اور اس نکتے پر توجہ مرکوز کیجئے کہ حضرت علی علیہ السلام نے کبھی یہ نہیں فرمایا چونکہ تم نے میری خلافت کو قبول نہیں کیا لہٰذا میرا ابھی تم سے کوئی کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رہا، بلکہ علی مولا علیہ السلام نے اسلام کے مفادات کو ہر مقام پر عزیز رکھا اور اپنے مفادات کی پرواہ نہیں کی، اور یہ نعرہ کبھی نہیں لگایا کہ: ''یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں!'' یعنی اگر مجھے خلافت نہیں ملی تو اور بھی کچھ باقی نہ رہے، ایسا ہرگز نہیں کہا، کیونکہ ایسے موقعوں پر مکتب اہل بیت علیہم السلام ایسی کسی بات کی اجازت نہیں دیتا، اگر ایک وقت ایسا آجائے کہ تمام احکام اسلام کا اجراء ناممکن ہوجائے تو کیا روٹھ کر گھر جا بیٹھیں یا کوشش کریں کہ تاحد ممکنہ احکام اسلام کا اجرا کریں؟ بہتر اور قابل ستائش

طریقہ کار یہی ہے کہ اگر اسلامی احکام کے نفاذ کا نوے فیصد امکان ہے تو اتنا ہی کوشش کرنی چاہئے اور اگر اسی فیصد ہو تو اسی قدر، غرض جس قدر ممکن ہو سکے اسی قدر کوشش کرنی چاہئے نہ کہ گوشہ نشینی اختیار کر کے گھر میں بیٹھ جانا چاہئے اور احکام اسلام کے اجرا کیلئے کوئی کاوش ہی نہیں کرنی چاہئے، اگر ائمہ اطہار علیہم السلام نے یہی رویہ اختیار کیا ہوتا تو آج اسلام کا نام تک باقی نہ ہوتا۔

امیر المومنین علی علیہ السلام پر جو ظلم ہوا ہے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، اس کے باوجود آپ کا ردعمل یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ آپ نے روٹھ کر خانہ نشینی اختیار کر لی ہو، بلکہ اس دوران بھی آپ علیہ السلام نے اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

فدک کے قضیہ کے بارے میں بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت سیدہ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا دربار سے خالی ہاتھ واپس لوٹ آئیں تو امیر المومنین علی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: ''آیا آپؑ فدک کے حصول کیلئے میری مدد نہیں کرتے؟'' تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''اگر آپ چاہتی ہیں کہ اذان کی آواز بلند رہے تو آپؑ کو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا'' (شرح ابن ابی الحدید جلد ۱۱ ص ۱۱۳) گویا آپؑ بتانا چاہتے تھے کہ اگر آپؑ چاہتی ہیں کہ اسلام باقی رہے اور وہ بھی اسی حد تک جو اس وقت آپؑ کو نظر آ رہا ہے اور اسی حد تک اس پر عمل ہو رہا ہے تو پھر صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہ ایک بہت بڑا درس ہے ہمارے لئے جو ہمیں غدیر اور امیر المومنین سے سیکھنا ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ کیوں نہ دیا؟

ولائیت سے گریز کا معمہ

اہل بیت اطہار علیہ السلام خاص کر حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے فضائل و مناقب میں شیعہ اور سنی دونوں مکاتب فکر سے لاتعداد روایات منقول ہیں، مکتب اہل بیت کے علماء کے علاوہ مکتب خلفاء کے علماء نے بھی امیر المومنین کی ولایت، مناقب اور ان آیات کے بارے میں کتابیں تحریر فرمائی ہیں جو آنجناب کی شان میں نازل ہوئی ہیں اسی طرح غدیر کے بارے میں کافی کتابیں لکھی ہیں۔

شیعہ اور سنی حضرات جو کثیر روایات حضرت امیر کے فضائل، وصایت اور خلافت کے بارے میں نقل کی ہیں ان کی روشنی میں چاہئے تو یہ تھا کہ آپ علیہ السلام کی شخصیت کی عظمت اور بعد از رسول خدا آپ کی خلافت و نیابت میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔

آپ علیہ السلام کی عظمت اور فضائل اور مناقب کا شہرہ اس قدر ہے کہ آج بہت سے غیر مسلم۔ مثلاً جارج جرداق مسیحی۔۔ بھی بڑے جوش وخروش اور عقیدت و احترام کے ساتھ آپ کے بارے میں کتابیں لکھ رہے ہیں اور سخرانی کر رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات جو لوگ کسی بھی آسمانی دین کے پیروکار نہیں وہ بھی آپ علیہ السلام کی ذات سے عشق کی حد تک اظہار محبت کرتے ہیں۔

اس کے باوجود یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسی عظیم الشان اور قابل قدر شخصیت کی قدر منزلت بہت سے مسلمانوں کے لئے مخفی رہے اور وہ آپ سے قدرے بھی آشنائی نہ رکھتے ہوں؟۔

حضرت علی علیہ السلام مظہر عدالت اور تمام انسانی فضائل کا مجسم نمونہ ہیں، علیؑ کا نام آتے ہی عدالت اور انسانی فضائل کا نقشہ ذہن میں آجاتا ہے، لیکن اوائل اسلام کے جن مسلمانوں نے اس مظلوم ہستی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ لوگ تھے جن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شب و روز کا اٹھنا بیٹھنا تھا، علی علیہ السلام کے بارے میں سرکار رسالتؐ کے فرامین کو اپنے کانوں سے سن چکے تھے اور امیر المومنین علیہ السلام کی اسلام اور رسول اکرمؐ کے لئے فدا کاری، جاں نثاری، شجاعت، شہامت، ایثار، قربانی، محبت، دل سوزی اور خیر خواہی جیسے عناصر کو ایک نہیں متعدد بار ملاحظہ کر چکے تھے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ان تمام خوبیوں کے باوجود مسلمانوں نے آپؑ کی ذات کے ساتھ اس عقیدت اور احترام کا ثبوت نہیں دیا جو آپ کے شایان شان تھا؟ نہ صرف یہ بلکہ الٹا آپؑ کی ذات کے دشمن ہو گئے؟۔

ادھر یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی خلافت، وصایت اور امامت کی بات بھی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو حضرت رسول پاک کی زندگی میں مخفی رہی ہو اور اس کا کسی کو علم تک نہ ہو، بلکہ اپنی نبوت کے اعلان کے روز اول ہی سے آپؐ نے فرمادیا تھا کہ ''جو شخص مجھ پر ایمان لے آئے گا وہی میرا جانشین ہوگا'' (بحار الانوار جلد ۱۸ باب ۱ روایت ۲۷) اور اسی موقعہ پر سب نے دیکھ لیا کہ ایک بارہ تیرہ سالہ نوجوان کے علاوہ کسی اور نے آپ کی دعوت کا مثبت جواب نہیں دیا اور وہ تھے علی بن ابی طالب علیہ السلام۔

چنانچہ رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دن کے بعد سے اپنی وصال کے آخری ایام تک مختلف موقعوں اور مختلف مناسبتوں پر اسی امر کی طرف علی الاعلان اور اشاروں کنایوں کے ساتھ لوگوں کو متوجہ فرماتے رہے کہ ''میرا جانشین علیؑ ہے'' اور آخری مرتبہ اپنی رحلت سے ستر

دن پہلے غدیرخم کے مقام پر ان تمام مسلمانوں کے مجمع میں جتنا اس مقام پر اکٹھا ہو سکتے تھے- اکثر مورخین کے مطابق ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی- ایک ایسے بیابان میں جہاں غضب کی دھوپ اور گرمی تھی اور کسی قسم کے سایہ کا نام تک نہیں تھا، علی علیہ السلام کا ہاتھ بلند کر کے فرمایا: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ" جس جس کا میں مولا اور سردار ہوں اسی اسی کا یہ علیؑ مولا اور سردار ہے یعنی میرے بعد یہ میرا جانشین ہے۔

آخر کیا ہو گیا کہ صرف ستر دن کے بعد مسلمانوں نے اس فرمانِ ذیشان کو بھلا دیا اور اپنی طرف سے آنحضرتؐ کا جانشین متعین کر دیا اور یہ تک نہ سوچا کہ حضور پاک نے بھی مقام غدیر پر کچھ فرمایا تھا؟۔

جو لوگ سقیفہ میں اکٹھے ہوئے وہ کوئی نو مسلم نہیں تھے بلکہ ان میں سے بہتیرے تو وہ لوگ تھے جو بدر، احد، خیبر اور حنین تک کی جنگوں میں شرکت فرما چکے تھے اور سالہا سال تک اسلام کی راہ میں تلوار چلاتے رہے اور سختیاں جھیلتے رہے، پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ابھی حضور سرور کائنات کا جنازہ دفن نہیں ہو پایا تھا کہ انہی مسلمانوں نے حضورؐ کے لئے کسی اور شخص کو چن لیا اور فرمانِ رسولؐ کو یاد تک نہ کیا؟۔

یہ اس حالت میں ہے کہ روایات اہل بیت علیہم السلام میں علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے عجیب اسرار سے کام لیا گیا، یہاں تک اگر کوئی شخص آپؑ کی ولایت کا منکر ہے نہ تو اس کا ایمان مکمل ہے اور نہ ہی اس کا عمل قابل قبول ہے، حتیٰ کہ بعض روایات میں تو یہ بھی ہے کہ "اگر کوئی شخص صفا اور مروہ کے درمیان اس قدر عبادت کرے کہ مشکیزے کی مانند خشک ہو جائے لیکن اگر وہ علی علیہ السلام کی ولایت کا منکر ہے تو اس کی عبادت قطعاً قبول نہیں"۔ (بحار الانوار جلد ۲۳ باب ۱۳ ص ۲۳۰)

آخر علی علیہ السلام کی ولایت میں کونسا ایسا راز پوشیدہ ہے کہ وہ اس حد تک اہمیت کا حامل ہے؟۔

علی علیہ السلام کی مخالفت کے تین اہم عنصر

ابتدائے اسلام کے کم وبیش تمام مسلمان حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت سے واقف تھے، آپ علیہ السلام کے فضائل ومناقب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کی زبانی اپنے کانوں سے سن چکے تھے، ہمارے اس مدعا کی شاہد وہ متعدد اور معتبر روایات ہیں جو علماء تسنن نے اپنی کتابوں میں خود انہی مسلمانوں سے نقل کی ہیں (ازاں جملہ سید سلیمان حنفی قندوزی کی کتاب ''ینابیع المودة'' ہے) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود مسلمانوں نے حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ کر دوسرے لوگوں کے پیچھے کیوں لگ گئے؟ اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض مسلمان تو آپ علیہ السلام کی دشمنی پر کمر بستہ ہوگئے؟ تو اس سوال کے جواب میں تین اہم عناصر کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔

ا۔ ذاتی کینہ اور بغض:

اس سوال کے جواب میں چند سلسلہ وار نفسیاتی مسائل کو پیش کیا جاتا ہے جن میں سے بعض کی طرف ''دعائے ندبہ'' میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، یعنی جن لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی ان کے دلوں پر جناب امیر علیہ السلام کی ذات سے حسد اور کینہ کے سانپ لوٹ رہے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ جو لوگ آغاز اسلام میں مسلمان ہوئے تھے دراصل وہ پہلے یا تو مکہ کے بت پرست تھے یا عرب کے مختلف قبائل سے ان کا تعلق تھا اور بہت سی جنگوں میں پیغمبر اکرمؐ کے مدمقابل محاذوں میں شرکت کر چکے تھے اور ان میں سے

بہتیروں کے لواحقین بدر و حنین جیسے محاذوں میں علی بن ابی طالب علیہ السلام کی تلوار سے واصل جہنم ہو چکے تھے، اس زمانے میں - اور اب بھی - قبائلی تعصب حکم فرما تھا اور ہے، چنانچہ اگر کسی جنگ میں کسی کا کوئی عزیز مارا جاتا تو وہ سارا قبیلہ اس کے قاتل کا دشمن ہو جاتا اور اس کے بارے میں ان لوگوں کے دلوں میں کینہ پیدا ہو جاتا، چنانچہ اس بارے دعائے ندبہ کے الفاظ ہیں "

اَحۡقَادًا بَدۡرِيَّةً وَخَيۡبَرِيَّةً وَحُنَيۡنِيَّةً وَغَيۡرَهُنَّ فَاَضَبَّتۡ عَلٰى عَدَاوَتِهٖ وَاَكَبَّتۡ عَلٰى مُنَابَذَتِهٖ" وہ لوگ اگرچہ مسلمان تو ہو گئے تھے اور بظاہر علی ابن ابی طالب کے ساتھ دوستی کا بھی اظہار کرتے تھے مگر ان کے اپنے دلوں کے مختلف زاویوں میں ان کی دشمنی کو چھپائے ہوئے تھے حتیٰ کہ ناخود آگاہ صورت میں ان سے کینہ اور دشمنی کا اظہار کیا کرتے تھے اور خود سے کہا کرتے تھے "یہی ہے وہ تو جس نے ہمارے باپ کو، نانا کو، چچا کو اور ماموں کو اور کسی دوسرے رشتہ دار کو قتل کیا ہوا ہے"۔

۲۔ علی علیہ السلام کی عدالت:

آغاز اسلام کے مسلمانوں کی علیؑ کے ساتھ مخالفت اور دشمنی کا سبب ایک اہم عنصر مولا کی وہ صفت تھی جسے لوگ آپ علیہ السلام کی کمزوری سمجھتے تھے وہ لوگ مولا علی علیہ السلام کے دوسرے فضائل کا اعتراف کرتے تھے لیکن اپنی سوچ کے مطابق ان کی ایک صفت جسے وہ ان کا عیب یا کمزوری شمار کیا کرتے تھے اور اعتراض کیا کرتے تھے، وہ یہ تھا کہ بقول ان کے "علیؑ بہت سخت گیر ہیں ان میں کسی قسم کی لچک نہیں پائی جاتی وہ بال کی کھال اتارتے ہیں اور حد سے زیادہ کسی بات کا مواخذہ کرتے ہیں خاص کر ان مطالب کے بارے جو شرعی احکام سے تعلق رکھتے اور حقوق الناس اور بیت المال سے ان کا تعلق ہوتا ہے اس بارے میں تو بہت ہی سخت گیری سے کام لیتے ہیں"۔

ہم میں سے بہت سے لوگ -حضرت علی علیہ السلام کے بھائی جناب -عقیل کی داستان کو جانتے ہیں جو نابینا ہو چکے تھے اور کافی عیالدار تھے، بعض اوقات ان کی اولاد فاقوں سے وقت گزار دیتی تھی ، کیونکہ انہیں بیت المال سے جو وظیفہ ملا کرتا تھا وہ نہایت ہی ناکافی ہوتا تھا ، انہوں نے ایک دن حضرت علی علیہ السلام کی دعوت کی تا کہ وہ آ کر اپنی آنکھوں سے بچوں کی حالت دیکھیں شاید اس طرح سے بیت المال سے وظیفہ میں اضافہ کر دیں ، ان کے مطالبے کو سن کر حضرتؑ نے لوہا گرم کر کے ان کے نزدیک کیا تو ان کی چیخ نکل گئی اور کہنے گے: "آپ علیہ السلام مجھے جلانا چاہتے ہیں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے جس کی آپؑ مجھے سزا دے رہے ہیں؟" امیر المومنینؑ نے فرمایا: "تم اس لوہے سے چیخ اٹھے ہو جسے میرے ہاتھوں نے گرم کیا ہے اور میں اس آگ سے نہ ڈروں جو قیامت کے دن غضب الٰہی سے بھڑکائی جائے گی؟ اگر میں بیت المال سے ایک درہم بھی زیادہ تمہیں دوں تو آخرت میں جہنم کی آگ کا ایندھن بنوں؟" (بحار الانوار جلد ۴۱ باب ۱۰۷ روات ۲۳)

جی ہاں! حضرت علی علیہ السلام بیت المال اور اسلامی معاشرہ کے بارے میں اس قدر سختی سے کام لیتے تھے کہ بہت سے لوگ اس سے اکتا گئے تھے حتی کہ آپؑ کے بہت سے قریبی دوستوں کیلئے بھی یہ بات ناقابل برداشت تھی، حضرت کی اس قسم کی کڑی سختی خاص کر بیت المال کے معاملے میں اس بات کا باعث بن گئی کہ آپ کے کئی دوستوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا ، مخالفین کا آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۳۔ ذہنی پسماندگی -یا- جہالت :

امیر المومنین کے ساتھ مخالفت کا نہایت ہی موثر عامل کہ جو ایک عمومی حیثیت کا حامل ہے اور اس سے موثر ترین اور نہایت ہی بنیادی عنصر قرار دیا جا سکتا ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں اسے بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے حتی کہ آج بھی ہمارے معاشرے کو اسی سے زیادہ خطرہ لاحق

ہے وہ ہے ''جہالت'' یا عوام کی ذہنی پسماندگی۔

سرکار رسالتمآبؐ کے دور میں عمومی طور پر۔سوائے محدودے چند لوگوں کے۔ اسلام کے بارے میں مکمل اور گہری معلومات سے بے بہرہ تھے، بعثت کے تیسرے سال ہی آنجنابؐ کی اعلانیہ تبلیغ کا آغاز ہوگیا، اور اس کے بیس سال بعد تک بڑی مشکل سے گنتی کے چند لوگ مسلمان ہوئے جبکہ لوگوں کی بڑی تعداد حضور اکرمؐ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد اسلام قبول کیا اور وہ آپؐ کی عمر مبارک کے آخری تیسرے یا چوتھے سال میں۔

واضح سی بات ہے کہ ایک تو رسل و رسائل اور معلومات کے وسائل بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے دوسرے لوگوں کا تعلیمی تناسب تقریباً صفر کے برابر تھا تو حضورؐ ان کو اس محدود مدت میں کیونکر جزیرۃ العرب کے مسلمانوں کو عمیق اور وسیع تر اسلامی معارف سے آگاہ کر سکتے تھے۔ اسی لئے حضور اکرمؐ کے زمانے کا معاشرہ شدید ذہنی پسماندگی کا شکار تھا، اس قدر شدید کہ ہم اس کی حدو حدود کو صحیح معنوں میں نہیں سمجھ سکتے، اس دور کے لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے کھجور کے بت بناتے جب تک جی چاہتا ان کی پوجا پاٹ کرتے رہتے اور جب بھوک لگتی تو انہیں چٹ کر گئے تو یہ تھی اس دور کے لوگوں کی معلومات کی حد!! اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ اللہ کا پاک رسولؐ کس حد تک جگر کا خون پیئے اور ان لوگوں کو توحید سے آشنا کرے؟ اور انہیں اس خدا کا آشنا کرے جو جسم و جسمانیت سے پاک اور ان آنکھوں سے قابل دید نہیں ہے اور انہیں اس خدا کے دیئے ہوئے معارف سے آگاہ کرے؟ ایسے لوگوں کیلئے جن کی معلومات کی سطح اس حد تک گری ہوئی تھی اس بات کا قبول کرنا بڑا مشکل تھا کہ حضور رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد کسی ایسے شخص کی رسول کی مانند اطاعت کریں جو رسول نہیں ہے! اگر وہ انتہائی درجے کے ایمان کے حامل تھے اور کسی حد تک تسلیم کرنے کیلئے آمادہ بھی تھے تو صرف اتنا کہ ''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ

اَنـفُسِهِـمْ ''نبی گرامی مومنین کے نفسوں پر تصرف کرنے کیلئے خود ان کی ذات سے حق رکھتا ہے (احزاب/٦) کے پیش نظر صرف حضور نبی کریمؐ کی ذات کی اطاعت کو قبول کریں، رہی رسولخداؐ کے بعد کسی اور کی اطاعت کے وجوب کی بات تو ان کیلئے بڑی آسانی کے ساتھ اس کا ہضم کرنا مشکل تھا۔

جمہوریت ایک سقیفائی ''تحفہ''

اس زمانے کے لوگ جن کی معلومات کی سطح اس حد تک گہری ہوتی تھی کہ ہزاروں مشکلات کے باوجود وہ صرف حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے وجوب پر ہی راضی ہوئے تھے، لیکن جب آپؐ کی رحلت ہوگئی، چونکہ اللہ تعالیٰ نے قران مجید میں صراحت کے ساتھ کسی کا نام نہیں لیا تھا کہ ''فلاں شخص بھی ''اولی بالمومنین'' ہے'' لہٰذا ان سادہ لوح مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کے جانشین کا تقرر خود لوگوں کے ہاتھ میں ہے یا آج کل کی اصطلاح میں یہ ایک جمہوری مسئلہ ہے، اگر ایک گروہ کہ جو اہم شخصیات پر مشتمل تھا کہنے لگا: ''اگر نبوت کے بارے میں ہمیں کسی قسم کی مداخلت کا حق حاصل نہیں تھا کم از کم اس کے جانشینی کے مسئلہ میں تو ہمیں یہ حق ضرور ملنا چاہئے''۔ (بحارالانوار جلد ۲۷ ب ۵۲ ر ۴۰)

یہ وہ لوگ تھے جن کا عام طور پر قبائل کے رؤسائ سے تعلق تھا اور معاشرہ میں ان کا ایک مقام تھا ۔جس طرح ہمارے وڈیرے حضرات ہوتے ہیں- اور وہ اپنے لئے ایک خاص مقام و منزلت کے قائل تھے، انہوں نے از خود ایک ''حدیث'' بنائی کہ ''پیغمبر خداؐ نے فرمایا ہے کہ نبوت اور امامت ایک خاندان میں اکٹھی نہیں ہوسکتی'' (ایضاً جلد ۲۷ باب ۹ روایت ۱۵)۔

انہوں نے یہ حدیث اس لئے گھڑی ہے تا کہ اپنے لئے رسول خداؐ کی جانشینی اور لوگوں

پرحکومت کی را، ہموار کرسکیں، اب آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ کتنے عوامل ہیں کہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ملا کر والیت کی سدراہ ہو گئے اور علی علیہ السلام کو ان کے حق سے محروم کردیا، وہ عوامل یہ تھے، لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، ان کی دینی معلومات پہلے تو تھی نہیں اگر تھیں تو بالکل سطحی اور ادنیٰ درجے کی، گہرے اور عمیق ایمان کا فقدان اور بعض شیطان صفت لوگوں کا غلط پروپیگنڈا۔

اگرچہ عوام الناس سادہ لوح تھے اور ان کی معلومات بھی ادنیٰ درجے کی تھیں لیکن جو سیاستدان تھے وہ اِس قدر مشاق تھے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا کے سیاستدانوں کو ان سے سبق لینا چاہئے اور ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنا چاہئے اور یہ باور نہیں کرنا چاہئے کہ سقیفہ کا ماجرا کوئی معمولی واقعہ تھا اور ان کے افراد نے اتفاق سے اکٹھے ہو کر رسول گرامیؐ کے جانشین کا انتخاب کرلیا، انہوں نے کافی عرصہ پہلے سے اس کا نقشہ تیار کیا ہوا تھا، بلکہ اقرار نامے لکھ کر ان پر دستخط بھی کر چکے تھے کہ رسول خداؐ کے بعد کس شخص کو کھڑا کیا جائے اور اس کا پیغمبر کا خلیفہ اور جانشین کے عنوان سے تعارف کرایا جائے اس کام کیلئے ہر کسی کو پیش نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ شخص ہونا چاہئے جو رسول خداؐ کی زوجہ محترمہ کا والد ہو، اس کی ریش مبارک سفید ہو اور اس کا شمار ان افراد میں ہوتا ہو جو سب سے پہلے حضور کی ذات پر ایمان لا چکے ہوں، حضور پاک کا یار غار بھی ہو، اسی قسم کے آدمی کو پیش کیا جاسکتا تھا، اسی لئے منظور شخصیت کا پہلے ہی سے انتخاب ہو چکا تھا اور بطور خلیفہ اس کو منتخب کرلیا گیا تھا، اب صرف اعلان کی دیر تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس طرح پیش کیا جائے؟ اس کام کیلئے بھی باقاعدہ ایک نقشہ تیار کرلیا گیا تھا، کہنے لگے: "ایک شوریٰ بنا دیتے ہیں اس میں بیٹھ کر پہلے تو بحث ومباحثہ کریں گے پھر رسول خداؐ کے ایک سسر محترم کھڑے ہو کر کہیں گے کہ میں تو خلیفہ اول کی بیعت کرتا

ہوں ان کے بعد دوسرا آدمی کھڑا ہو جائے گا وہ بھی اسی طرح کہے گا پھر دوسرا پھر تیسرا بالآخر منصوبے پر عمل ہو جائے گا اور ہوا" اور ہوا بھی وہی جو انہوں نے چاہا۔

رسول خداؐ نے ستر دن پہلے علی علیہ السلام کا ہاتھ بلند کر کے فرمایا: "مَنْ کُنْتُ مَوْلاہُ فَھٰذا عَلِیٌّ مَوْلاہ" (بحار جلد ۲۸ باب ۴ روایت ۱) لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ سقیفہ میں کسی ایک شخص نے بھی یہ نہ کہا: "رسول خداؐ نے کس شخص کو خلیفہ مقرر کیا تھا؟" وہاں کون موجود تھے؟ وہی جنہوں نے بدر سے لے کر حنین کی جنگوں میں شرکت کی تھی اور ایک عرصے تک اسلام کی راہ میں تلوار چلاتے رہے تھے، کسی نے بھی نہیں کہا کہ رسول پاکؐ نے ستر دن پہلے غدیر خم کے مقام پر کس کو خلیفہ مقرر کیا تھا؟ کیونکہ انہوں نے پہلے ہی سے یہ منصوبہ تیار کر لیا تھا کہ مسلمانوں پر خود ہی حکومت کریں گے۔

ہوسکتا ہے کہ یہاں پر کوئی شخص یہ بات کہے کہ: اس دور کی حکومت کی کوئی آمدنی ہی نہیں تھی حتیٰ کہ خلیفہ اول چٹائی بنا بنا کر اپنا گزر اوقات کیا کرتے تھے، تو یہ کام ان کیلئے کس حد تک فائدہ مند تھا؟ جواب میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ "حکومت کی خواہش" ایک ایسی پیاس اور آتش ہے کہ اگر کوئی اس کا شکار ہو جائے اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی، رسول پاکؐ کا جانشین ہونا کوئی معمولی اہمیت کا حامل نہیں تھا، یہاں تخت و تاج اور محل اور قصر پیش نظر نہیں تھا حتیٰ کہ ایک گھوڑا بھی خلیفہ کے نصیب میں نہیں تھا، لیکن "خلیفہ" ہونا بہت بڑا اعزا تھا کیونکہ رسول خداؐ کی جانشینی اور لوگوں پر حکومت بڑی بات اور جاذب نظر تھی۔

اس دن کچھ شیطان صفت اور کایاں لوگ عوام میں داخل ہو گئے اور تدبیریں سوچنے لگے کہ لوگوں کو کس انداز میں اپنا بنایا جاسکتا ہے؟ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے دورانیہ میں اس قبیل کے افراد نے ہر مناسب موقع و محل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کے گمراہ کرنے میں

کوئی کسر باقی نہیں چھوڑ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

اس روز بھی اس طرح کے لوگوں نے اس قسم کی منصوبہ بندی کی کہ معاشرہ کی راہو کیونکر بدلا جائے، کس قسم کا پروپیگنڈا کیا جائے اور کونسا نعرہ لگایا جائے کہ جس سے لوگ خو ہوں؟ کیونکہ لوگوں کے گمراہ کرنے میں یہی شیطان صفت زیرک لوگ منصوبہ سازی کرتے ہ اور بڑے بڑے اعمال بھی ان کے نامۂ اعمال میں لکھے جاتے ہیں اور قیامت کے دن بھی لوگ عظیم ترین اور المناک ترین عذاب کے مستحق ہوں گے اس لئے کہ قیامت تک جو لوگ گمراہ ہوتے رہیں گے وہ ان کے گناہوں میں برابر کے شریک ہوں گے اور ان کی تعداد چند چنے افراد سے زیادہ نہیں تھی۔

بات یہاں سے شرع ہوئی تھی کہ انہوں نے کہا: پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ف لوگوں کے دین کے ضامن تھے اور ان کی اطاعت بھی دینی امور کے بارے میں ہمارے او واجب ہے اور اب بھی ان کی وفات کے بعد ان کے بارے ہماری محبت میں بال برابر کمی نہیں آ آج بھی ہم ان پر درود بھیجتے ہیں، ان کی ذات کا احترام کرتے ہیں، وہ صرف ہمارے دین کفیل تھے، اب جبکہ انہوں نے ہمارے لئے (؟) اور قرآن ورثے میں چھوڑے ہیں اور خود سے جدا ہو گئے ہیں، ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنی دنیا کو سنوارنے کیلئے کچھ کریں اور خود ہی رسو اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ اور جانشین منتخب کریں تو اس طرح سے سقیفہ کی منصوبہ بندی کر والوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں ''اسلامی ڈیموکریسی'' کی بنا د رکھی اور یہ نظریہ دیا کہ ''عوا ہی کو رسول خداؐ کا خلیفہ منتخب کرنے کا حق حاصل ہے''۔

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ''ڈیموکریسی'' یا ''جمہوریت''، ہمیں مغرب کی طرف سے سوغات ملی ہے لیکن یہ آج کی جدت نہیں ہے بلکہ سقیفہ کے منصوبہ سازوں کا منحوس ہدیہ ہے جنہوا

نے لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ عوام ہی اپنے حکمران کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا: ''خدا نے علیؑ کو مقرر فرمایا ہے'' لیکن ان لوگوں نے کہا: ''ہم اپنے لئے خود ہی رسولؐ کے جانشین کا انتخاب کریں گے'' تو اس طرح سے سقیفہ میں ڈیموکریسی کی بنا دی رکھی گئی۔

سیکولرازم کا نقطہ آغاز ''سقیفہ''

سقیفہ کی ایک اور ''منحوس سوغات'' جو مسلمانوں کے نصیب ہوئی ''سیکولرازم'' ہے جبکہ بہت سے لوگوں کا تصور یہ ہے کہ یہ دنیائے عرب کی پیشکش ہے اور تازہ وجود میں آیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''سیکولرازم'' کی بنیاد اور دین سے سیاست کی جدائی کا نظریہ بھی سقیفہ میں ہی معرض وجود میں، انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ''حضور سرور کائناتؐ نے جو احکام، قرآن اور فرامین خدا کی طرف سے پیش کئے ہیں ان سب کا تعلق دین سے ہے اور دین کا دنیوی امور سے کوی تعلق نہیں ہے، دنیا کا حساب، آخرت سے علیحدہ ہے، حکومت کا مسائلہ بھی دنیا داری سے متعلق ہے، دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، حضور پاکؐ نے جو کچھ فرمایا تھا اس کا دین سے تعلق تھا، حضرتؐ نے فرمایا نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج بجالاؤ وغیرہ تو ہم بھی انہیں مانا اور ان پر عمل کیا، لیکن ان میں سے کسی ایک کا بھی حکومت اور سیاست سے تعلق نہیں ہے''۔

قابل ذکر ہے کہ انہوں نے ان مسائل کو بھی اسی طرح قبول نہیں کیا تھا جس طرح کہ حضور پاکؐ نے فرمایا تھا، لیکن بہر حال کہا یہی کہ ان مسائل کا تعلق دین کے ساتھ ہے، لیکن یہ بات کہ کون شخص رئیس مملکت ہو، کون احکام صادر کرے، کون بیت المال کو اکٹھا کرے، کون عدالتوں کیلئے حاکم اور قاضی مقرر کرے؟ اور اس طرح کے دوسرے مسائل، یہ سب دنیوی امور سے متعلق ہیں، جن کا پیغمبر گرامیؐ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ لوگوں کا کام ہے کہ وہ اپنی

آراء(Votes) سے اسے منتخب کریں کہ کون صاحب یہ کام انجام دیں؟ اس کے بعد کچھ لوگ جمع ہوگئے جن کے بارے میں کہا جانے لگا کہ ''یہ حضرات اہل حل وعقد ہیں''مسلمانوں نے انہیں رائے (Votes) دیدیئے، خلافت کا عہدہ ان کے سپرد کردیا گیااور بات ختم ہوگئی۔

پس بنابریں سقیفہ میں دو اہم مسئلوں کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا ایک ''سیکولرازم''اور دوسرے ''جمہوریت''اور تب سے اب تک ہمارے لئے ایک کسوٹی کی صورت اختیار کرگیا جس سے ہم ایک دوسرے کو پرکھ سکتے ہیں کہ ''سقیفائی''ہیں یا''علوی''ہیں؟۔

اُس دن کہنے لگے کہ دین کا معاملہ دنیا سے الگ ہے اور حکومت کا معاملہ خود عوام کے ہاتھ میں ہے اور آج بھی ہم میں سے کچھ روشن خیال ایسے ہیں نیز ارباب حکومت بھی جوان روشن خیالوں سے مرعوب ہیں انہی الفاظ کو دہراتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: دین کا معاملہ علیحدہ ہے اور دنیا کا معاملہ علیحدہ ہے، یہ لوگوں کا کام ہے کہ خود ہی اپنے لئے حکمرانوں کا چناؤ کریں اور وہ امام خمینیؒ کے اس فرمان سے ناجائز مفاد اٹھاتے ہیں کہ کہ امامؒ نے فرمایا ہے: ''اصل معیار قوم کی رائے ہے''اور وہ سمجھتے ہیں کہ حضرت امامؒ نے یہ جملہ تمام موارد کیلئے فرمایا ہے حتی کہ اگر لوگ ''خدا نہیں ہے''کے بارے میں بھی رائے (Vote) دیدیں تو ان کی رائے معتبر جانی جائے گی، حالانکہ ایسا نہیں ہے، امام نے یہ صرف ایک موقع کیلئے فرمایا تھا جب کہ کچھ لوگ آگے بڑھ کر بعض افراد کو اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے نامزد کرنا چاہتے تھے تاکہ اس طرح سے وہ لوگ اسمبلی میں پہنچ کر ملک کیلئے قوانین وضع کریں۔

حضرت امام خمینیؒ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا: ''تمہیں کوئی حق حاصل نہیں ہے، یہ عوام ہی ہوں گے جو اپنی طرف سے نمائندے منتخب کرکے اسمبلی میں بھیجیں گے''لہٰذا ان کا یہ فرمان ممبران اسمبلی کے اور دوسرے انتخابات کے بارے میں ہے جو اسلامی جمہوریہ ایران کے

تشکیل شدہ آئین میں مذکور ہے، فرمایا: ''معیار قوم کی رائے ہے'' اور امامؒ کا یہ فرمان ان موارد کے بارے میں ہے جو ملک کے آئین میں مذکور ہیں، جبکہ خود آئین بھی اسی صورت میں معتبر سمجھا جاتا ہے جسے ولی فقیہ کی تائید اور تصدیق حاصل ہے، بنابریں لوگوں کی رائے بھی اس وقت معتبر ہے جب ولی فقیہ اسے معتبرِ قرار دے کر اس کی تصدیق و تائید کی ہو۔

حضرت امامؒ کا لوگوں کی رائے کو معیار قرار دینا اس مقصد کیلئے نہیں تھا کہ اگر لوگ آئین کے بارے میں اس کے غلط اور جھوٹا ہونے کی رائے (ووٹ) دیں تو وہ جھوٹا ہی سمجھا جائے گا، یا یہ رائے دیں کہ اسلام نہ ہو اور ولایت فقیہ نہ ہو!! کون عقلمند اسے صحیح سمجھے گا؟ کوئی سبک سر ہی ہوگا جو کہے گا کہ ان امور کے بارے میں ملت کی رائے معیار ہوگی۔

جس شخصیت نے اپنی ساری زندگی اسلام اور احکام دین کے احیاء کیلئے صرف کردی ہو اور ہر وقت جس کا وردِ زبان ہی اسلام اور اسلامی احکام کا نفاذ ہو تو کیا وہ شخصیت اس بات کی اجازت دے گا کہ لوگ آئین اور اسلام کو منسوخ کردیں؟ آیا اس شخصیت کا نظریہ یہی تھا کہ معیار عوام کی رائے ہے خواہ وہ اسلام کے خلاف ہی ہو؟۔

بہرحال یہ سقیفہ ہی تھا جس نے سب سے پہلے دین اور حکومت کو ایک دوسرے سے جدا کردیا اور اس چیز کی بنیاد سب سے پہلے وہیں رکھی گئی کہ دین اور دینی مسائل کے بارے میں رسول خداؐ اور علی مرتضیٰؑ کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے اور حکومت اور سیاست کے متعلق دوسروں کی طرف!! حتی کہ خلیفہ اول اور دوم بہت سے دینی مسائل کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کے پاس آیا کرتے تھے اور انہیں اس بارے میں کسی قسم کا مضائقہ بھی نہیں تھا اور یہ جو حضور پاکؐ نے حدیث ثقلین میں اہل بیت علیہم السلام کی طرف رجوع کرنے کی سفارش کی تھی اسے بھی وہ دینی مسائل میں رجوع کرنے پر محمول کرتے تھے، باالفاظ دیگر حضرت علی علیہ السلام نے دینی

مسائل دوسروں سے زیادہ یاد کیے ہوئے تھے۔

آج بھی مکتب خلفاء کے بہت سے لوگ ہیں جو اسی بات پر اعتقاد رکھتے ہیں، حتی کہ بعض شافعی مذہب کے لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ ائمہ اثنا عشر علیہم السلام دین کے مرجع تھے، یعنی دین انہی لوگوں سے سیکھا جا سکتا ہے اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو روایات ان مقدس ہستیوں کے بارے میں بیان ہوئی ہیں وہ اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں، ان کے خلیفہ ہونے پر نہیں۔

یہ وہی بعینہ دین اور سیاست کی جدائی کا نظریہ ہے اور روشن خیالی کا تصور ہے کہ دین اور حکومت وسیاست دو علیحدہ چیزیں ہیں جس کی بنیاد درحقیقت سقیفہ میں رکھی گئی تھی۔

دین سیاست سے جدا نہیں "ولایت علی علیہ السلام اس کا عملی نمونہ ہے"

مذکورہ تفصیل کے پیش نظر یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ کس لئے سرکار رسالتمآبؐ اور حضرات ائمہ اطہار علیہم السلام نے علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت پر اس قدر کیوں زور دیا ہے اور بار بار اس کی کیوں تاکید فرمائی ہے اور حضرت علی علیہ السلام کی ولایت پر اس قدر زیادہ تاکید کی ایک حکمت عملی یہ بھی ہے کہ سیاست دین سے جدا نہیں ہے اور یہ جو احادیث میں ہے کہ "اگر علی کی ولایت کا انکار کرو گے تو تمہارا کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں ہوگا، تمہارا ایمان ناقص ہوگا وغیرہ" تو اس کا ایک بنیادی عنصر یہی مسئلہ ہے، یعنی اگر علی علیہ السلام کی ولایت بارے ایمان کمزور ہوگا تو نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ کہیں گے: "دین سے سیاست کو الگ رکھنا چاہیے، دین تو صرف مسجدوں امام بارگاہوں اور دیگر عبادت گاہوں تک محدود ہے، جاؤ نمازیں پڑھو، اذانیں دو، ماتم کرو، زنجیر مارو لیکن حکومت اور سیاست سے کوئی کام نہ رکھو" جیسا کہ آج کل"

روشن خیالی'' کے اس نظریئے کی بڑے دھوم دھام سے ترویج کی جارہی ہے۔

مولا علی علیہ السلام کی ولایت کو قبول کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ اس بات کو تسلیم کریں کہ ''علیؑ آقا دینی رہبر بھی ہیں اور سیاسی رہبر بھی'' ورنہ اگر کوئی آپ علیہ السلام کی دینی رہنمائی کو تو مانے اور رسول خدا کے بعد آپ علیہ السلام کی سیاسی رہنمائی کا انکار کرے تو ایسا شخص امیر المومنینؑ کی ولایت کا قطعاً منکر ہے، اسی لئے علی علیہ السلام کی ولایت کو قبول کرنا درحقیقت سیکولرازم کے انکار کے مترادف ہے، اسی طرح آنجناب کی ولایت آج کے یورپ کی اختراع کردہ ڈیموکریسی کے ساتھ کسی صورت میں اکٹھی نہیں ہوسکتی کیونکہ:

ولایت علی علیہ السلام کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی گئی ہے کہ

۱۔ حاکم کو خدا مقرر فرماتا ہے۔

۲۔ حکومت کو قانونی حیثیت دینا اسی کا کام ہے۔

۳۔ جو لوگ اپنی ذات پر حق حکومت نہیں رکھتے وہ کیونکر خلق خدا کا اختیار کسی کو دے سکتے ہیں؟

یعنی آیا مجھے حق حاصل ہے کہ میں اپنا ہاتھ کاٹ ڈالوں؟ آیا شریعت میں مجھے یہ حق دیا گیا ہے؟ حتی کہ میں تو اتنا چھوٹا سا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ اپنے جسم پر ایک معمولی سا زخم بھی لگا دوں تو پھر مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں یہ اختیار کسی اور کو دیدوں کہ جو شخص چوری کرے تو وہ اس کا ہاتھ کاٹ دے؟ جب میں خود اپنے ہاتھ کاٹنے کا اختیار نہیں رکھتا تو دوسرے کے ہاتھ کاٹنے کا اختیار مجھے کیسے مل جاتا ہے؟ کیونکر کسی دوسرے کو یہ اختیار دے سکتا ہوں؟۔

ممکن یہاں پر کوئی شخص یہ کہے کہ چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آج سے چودہ سو سال پہلے کیلئے ہے۔ جیسا کہ آج کے روشن خیال لوگ یہی کہتے ہیں کہ اس قسم کے احکام کی تاریخ استعمال ختم ہوچکی ہے۔

ہم کہیں گے کہ ٹھیک ہے، زندان کے حکم کو تو قبول کرتے ہو؟ یا نہ بلکہ چور کے ساتھ خوش ہو کر پیش آتے ہو؟ چلو اگر زندان ہی کو مانتے ہو تو پھر مجھے کیا حق حاصل ہے کہ میں کسی کو زندان میں ڈال دوں؟ یا کسی اور کو حکم دوں کہ کسی کو قید خانے میں بند کر دے؟ اور مجھے یہ اختیار کس نے دیا ہے؟۔

یہ تو خدا کی ذات ہی ہے جو اپنے تمام بندوں کے اختیارات کی مالک ہے اور وہ ہی اس قسم کے اختیار دے سکتی ہے، اگر وہ خدا کسی حکومت کو قانونی نہ بنائے اس حکومت کو کیا حق حاصل ہے کہ خدا کے بندوں میں کسی قسم کا تصرف کرے؟۔

پس جو شخص ولایتِ علی بن ابی طالب علیہ السلام کو مانتا ہے وہ رائج الوقت ڈیموکریسی (جمہوریت) کو قبول نہیں کر سکتا خواہ وہ ڈیموکریسی کی کتنی بھی تعریف و تمجید کرے حتی کہ اسے پوجا پاٹ کی اس حد تک لے جائے کہ کسی کو اس کے خلاف بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

اس کے باوجود پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو بلند آواز سے کہتے ہیں کہ: ''جمہوریت (ڈیموکریسی) اسلام کے بالکل سازگار نہیں ہے، اسلام مطلقاً ''اللہ'' کی حاکمیت کا قائل ہے، جبکہ ڈیموکریسی کا معنی یہ ہے کہ ''انسان'' اور ''عوام'' کا مطلق ارادہ اور ان کی خواہش، تو پھر کیونکر ان دونوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے؟ ولایت علی علیہ السلام کا مقصد ہے مخلوق خدا کے درمیان حکومتِ اللہ کو حقیقت بخشنا، یا تو اللہ کی حکومت کو تسلیم کیا جائے یا بندوں کی حکومت کو ارشاد ہوتا ہے: ''اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ وَاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ '' اے آدمؑ کی اولاد! کیا میں نے تمہارے ساتھ عہد نہیں کیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

(یٰسٓ/۶۰،۶۱)

عبادت مخصوص ہے خداوند ذوالجلال کیلئے اور جو بھی اس کے خلاف ہوگی وہ بت پراتی ہوگی خواہ وہ بت، پتھر کے ہوں یا کھجور کے پھل کے، یا گوشت و پوست اور ہڈیوں کا مجموعہ (انسان) ہوں یعنی خدا کے علاوہ جس کی بھی پوجا کی جائے گی وہ بُت ہوگا۔

ولایت علی یعنی:

خداوند عالم کی خالص توحید کا مظہر، خداوند یگانہ کی پرستش یعنی صرف ایک خدا کی حاکمیت اور حکومت کو قبول کرنا جس کا نام "اللہ" یعنی اللہ کی حکومت! خداوند یگانہ کی حکومت نہ کہ سرداروں کی حکومت، نہ کہ وڈیروں کی حکومت نہ کہ چودھریوں کی حکومت، نہ کہ زور آوروں کی حکومت، نہ کہ دھوکہ بازوں کی حکومت، نہ کہ عوام کی حکومت

بلکہ

صرف اور صرف اللہ کی حکومت

ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں یہ نعمت -موالیان اہل بیتؑ- کو عطا فرمائی ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَنَا مِنَ الْمُتَمَسِّکِیْنَ بِوِلَایَةِ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَؑ وَالْاَئِمَّةِ الْمَعْصُوْمِیْنَ علیهم السلام"۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''امامت''، ''ولایت'' اور ''ولایت فقیہ'' کیا ہیں

دو لفظ ایسے ہیں کہ جن کی طرف شاید بہت کم کسی کی توجہ مبذول ہوئی ہے کہ ان دونوں کے اصل اور صحیح معنی کیا ہیں؟ اور وہ ہیں ''امامت'' اور ''ولایت'' اور اس طرف بھی بہت کم توجہ ہوئی ہے کہ ہم جب یہ الفاظ حضرت امیر علیہ السلام اور دیگر ائمہ معصومین علیہم السلام کے بارے میں استعمال کرتے ہیں تو ان کے کیا معنی مراد لیتے ہیں؟ اور اگر کچھ لوگ ان کی امامت اور ولایت کے منکر ہیں تو وہ کس معنی میں اس کے منکر ہیں؟ ان کے مقابل میں ہمارا کیا موقف ہے؟ لہٰذا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر سب سے پہلے ان دونوں کلموں کا صحیح مفہوم معلوم کریں بعد میں اسی بارے میں بات آگے بڑھے گی۔

لغت میں ''امامت'' کے معنی؟

لغوی طور پر امامت کا لفظ ''اَمّ'' سے لیا گیا ہے جس کے اصل عربی لغت میں معنی ہیں پیش پیش اور آگے ہونا جس کا اردو یا فارسی میں متبادل معنی ''پیشوائی'' ہے اور ''امام'' کے معنی ہوں گے ''وہ چیز یا وہ انسان جو کسی انسان کے آگے آگے ہو'' اور سامنے کی سمت یا جہت کو ''امام'' کہتے ہیں جس کا متضاد کلمہ ''خَلْف'' جس کے معنی ہیں پیچھے پیچھے، تو جو موجود آگے اور سامنے ہو ''امام'' کہلاتا ہے اور یہ موجود خواہ ایک جگہ اور مقام ہو یا ایک مادی چیز یا کوئی انسان ہو، یا وہ ایک غیر مادی یعنی معنوی چیز ہو ان سب کو ''امام'' کہا جاتا ہے، جیسے قرآن مجید ''اصحاب لوط'' اور ''اصحاب ایکہ'' کے شہروں کے بارے میں فرماتا ہے: ''فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ'' پس ہم

نے ان سے انتقام لے لیا اور وہ دو (شہر اس وقت) واضح راستے کے اوپر ہیں یہ آیت حجاز کے باسیوں سے خطاب کر کے کہہ رہی ہے کہ جب تم شام کی طرف سفر کرتے ہو اور راستے کے درمیان جا پہنچتے ہو تو ''امام مبین'' (روشن راستہ) تمہارے سامنے ہوتا ہے۔ (حجر/۷۹)

اسی طرح قرآن مجید نے آسمانی کتابوں کو بھی ''امام'' کہا ہے، ارشاد ہوتا ہے ''وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتَابُ مُوسٰى اِمَامًا وَرَحْمَةً'' اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب رہبر بھی ہے اور رحمت بھی۔ (ہود/۱۷)

یہ کلمہ افراد کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے، خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: ''قَالَ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' (اللہ نے ابراہیم علیہ السلام سے) فرمایا میں نے تمہیں لوگوں کا پیشوا قرار دیا ہے۔ (بقرہ/۱۲۴)

ہم اپنے عرف میں بھی اس کلمہ کو امام جماعت، امام جمعہ اور رہبر کیلئے استعمال کرتے ہیں، یہ سب اُسی ''پیش'' کے معنی میں ہیں جو کہ ''پیشوا'' کہلاتے ہیں اور پیشوا وہ ہوتا ہے جو ہمارے آگے ہوتا ہے اور ہم اس کے پیچھے چلتے ہیں اور ''مقتدا'' کا بھی یہی معنی ہوتا ہے، یعنی وہ ہمارے سامنے ہوتا ہے اور جو کام وہ انجام دیتا ہے ہم بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے وہی کام کرتے ہیں جیسے امام جماعت جس طرح اٹھتا، بیٹھتا اور پڑھتا ہے ماموم بھی وہی کچھ کرتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ لغت میں ''امام'' کے معنی ہیں ''پیش'' اور ''پیشوا'' کے اور امامت پیشوائی کہلاتی ہے، البتہ یہ پیشوائی ضروری نہیں ہے کہ صحیح اور سیدھے راستے کی ہو، بلکہ گمراہی اور غلط راستے کی پیشوائی کرنے والے کو ''امام'' کہتے ہیں اور قرآن کریم نے اس قسم کے پیشواؤں کو ''اَئِمَّةً يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ'' جہنم کی طرف بلانے والے امام (قصص/۴۱) اور ''اَئِمَّةَ الْكُفْرِ'' کفر کے پیشوا (توبہ/۱۲) کا نام دیا گیا ہے۔

پس لفظ امام جب کسی فرد بشر کیلئے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ وہ شخص جو سب سے آگے ہوتا ہے اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے ہوتے ہیں اور اسی کی مانند اپنی حرکات و سکنات کو انجام دیتے ہیں اور اسے اپنا مقتدا قرار دیتے ہیں۔

لیکن جہاں تک مکتب اہل بیت علیہم السلام کا تعلق ہے تو اس کے نزدیک امامت اصول دین میں سے ایک اصل ہے، جس کا عقیدے کے ساتھ تعلق ہے اور اس کے لغوی معنی سے کچھ اضافی معنی بھی پایا جاتا ہے اور وہ معنی خاص بھی ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ وہ اضافی معنی کونسا ہے جو مکتب تشیع میں ایک دوسری خصوصی حیثیت اختیار کر گیا ہے؟ تو اس کے سمجھانے کیلئے تفصیل کی ضرورت ہے جس کے بارے میں ہم ذیل کی طرف اشارہ کریں گے۔

قرآن مجید میں بعض انبیاء علیہم السلام کے متعلق مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ''امام'' مقرر فرمایا تھا مثلاً ''وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِآيَتِنَا يُوْقِنُوْنَ'' (سورہ سجدہ/۲۴) اس آیت میں صف انبیا علیہم السلام میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے کچھ دوسرے انبیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے امام مقرر فرمایا ہے اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ راہ حق کی ہدایت کرتے ہیں اور اس کا سبب دو چیزیں بتائی گئی ہیں ایک ''لَمَّا صَبَرُوْا'' صبر، عمل کے ساتھ مربوط ہوتا ہے، یعنی انہوں نے جو ہدف اپنے مدنظر رکھا ہوا ہے وہ اس کی راہ میں استقامت اور صبر سے کام لے کر مشکلات کو برداشت کرتے ہیں۔

دوسرا عامل ''یقین'' ہے ''وَكَانُوْا بِآيَتِنَا يُوْقِنُوْنَ'' ہماری آیات پر یقین (کامل) رکھتے ہیں، اگرچہ ہر مومن کو یقین کا حامل ہونا چاہئے، لیکن قرآنی تعبیروں اور نبوی احادیث سے

جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ یقین کے کچھ مراتب ہیں اور انبیاء علیہم السلام کا یہ گروہ اس کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں، حجرت ابراہیم علیہ السلام جو انبیاء میں سے ایک ہیں ان کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: ''وَاِذِابْتَلٰی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّی جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' اور جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند کلمات کے ساتھ امتحان امتحان لیا اور اسے اس نے پورا کر دکھایا تو خدا نے ان سے فرمایا: میں نے تجھے لوگوں کا امام قرار دیدیا ہے۔ (بقرہ/۱۲۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نبوت، رسالت اور خُلّت (خلیل الرحمان) حاصل کرنے کے بعد امامت کے منصب پر فائز ہوئے اور یہ اس وقت تھا جب آنجنابؑ سے خداوند عالم نے اپنے امتحانات کو اوج کمال تک پہنچا اور آپ علیہ السلام ہر مرحلے پر سرخرو اور سرفراز ہو گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے جو بھی امتحان لیا گیا وہ بے مثل اور عدیم النظیر تھا اور تاریخ میں ایسی کوئی دوسری شخصیت نہیں ملتی جس کے اس انداز سے امتحان لئے گئے ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالے جانے کی داستان بھی عجیب ہے، اس نہایت ہی خطرناک ماجرا میں بھی انہوں نے خداوند وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی پر بھروسہ اور توکل نہیں کیا بلکہ توجہ ہی نہیں کی، یہ کوئی مذاق نہیں ہے کہ جب انہیں آگ کے دریا میں ڈالا گیا اور وہ جلنے کی حد تک پہنچ گئے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آکر آپ کو پیش کش کی اور پوچھا: ''هَلْ لَكَ حَاجَةٌ؟'' آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟ ''اَمَّا اِلَیْكَ فَلَا وَاَمَّا اِلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ فَنَعَمْ'' ہے تو سہی مگر تمہاری نہیں بلکہ عالمین کے رب کی۔ (بحار الانوار جلد ۱۲ ص ۲ روایت ۸)

یہ ایک عظیم امتحان تھا، اس طرح یہ دیکھنا مقصود تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کس حد تک عمل میں موحّد (توحید پرست) ہیں اور غیر اللہ کی طرف توجہ نہیں فرماتے ہیں؟۔

لیکن اس سے بھی عظیم تر امتحان حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنا

تھا، یہ نہایت ہی عجیب داستان ہے، البتہ اس سے ملتی جلتی داستان کربلا میں حضرت سید الشہداء علیہ السلام اور حضرت علی علیہ السلام کی داستان ہے، البتہ کربلا کی داستان ابراہیم علیہ السلام کی داستان سے کئی درجے بالاتر ہے، لیکن یہ کہ ایک بوڑھے باپ کو حکم ملے کہ ایک سمجھدار ذی فہم و ذکاء جوان رعنا بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرے جبکہ بوڑھا باپ علم، ادب، عرفان اور معنویت کے تمام عالی مناصب پر فائز ہو چکا ہو۔

اس طرح کا واقعہ تاریخ میں کم نظیر ہے، کسی نبی یا امام کو اس طرح کا امتحان درپیش نہیں ہوا، اس امتحان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کمال سربلندی اور سرفرازی کے ساتھ کامیاب ہوئے چنانچہ اسی امتحان کی یاد کو تازہ رکھنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک تمام حجاج کو حکم دیا کہ ایام حج میں مقام منیٰ میں جا کر راہ خدا میں قربانی دیں۔

بہرصورت ان تمام سخت امتحانوں کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا: ''اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا'' میں نے تمہیں لوگوں کا امام بنا دیا۔

امامت ایک معنوی اور نہایت ہی اعلیٰ مقام ہے جو درجہ بندی کے لحاظ سے مقام نبوت ورسالت سے بھی بالاتر ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت (اولاد) کیلئے بھی اس کی درخواست کر ڈالی، جس کا جواب آیا: ''لَایَنَالُ عَھْدِیَ الظّٰلِمِیْنَ'' میرا یہ عہد ظالموں کو نہیں ملے گا (بقرہ/۱۲۴) یعنی اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے وہ لوگ اس مقام و منصب کو حاصل کریں گے جو ساری زندگی میں کبھی ظلم کے مرتکب نہیں ہوئے ہوں گے، چنانچہ مکتب اہل بیت علیہ السلام کی روایات کے مطابق ''حضرات ائمہ اطہار علیہم السلام ہی اس سے مراد ہیں''۔

پس معلوم ہوا کہ اس اصطلاح میں ''امام'' کا معنی وہ ''پیشوا'' نہیں ہے جو امام جمعہ و جماعت یا رہبر انقلاب وغیرہ جیسے لوگوں کیلئے استعمال ہوتا ہے بلکہ یہ وہ مقام ہے جو نبوت اور

رسالت سے بھی بالاتر ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی امامت

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم مخالفین اور ان لوگوں کے سامنے جو امامت کا عقیدہ نہیں رکھتے یہ کہتے ہیں کہ ''شیعہ عقائد میں امامت بھی شامل ہے'' تو کیا اس وقت ہمارے پیش نظر یہی معنیٰ ہوتا ہے یا نہ بلکہ شیعہ اور غیر کا اس بحث میں کوئی اور اختلاف بھی ہے؟۔

نہایت ہی آسان لفظوں میں یہی کہیں گے کہ شیعوں اصول عقائد میں ''امامت'' سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ''حضرت رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد بارہ امام معصوم علیہم السلام ان کے یکے بعد دیگرے برحق جانشین ہیں'' تو اس طرح سے امامت کی اصطلاح کو تیسرے معنیٰ سے تعبیر کیا جائے گا۔

بنابریں امامت کے متعدد معانی ہیں اور معانی کے اس اختلاف کو پوری طرح مدنظر رکھنا چاہیئے، اگر ہم اپنے کسی بزرگ مثلاً اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی امام خمینیؒ کو ''امام'' کہتے ہیں تو ہرگز اس کا وہ معنیٰ نہیں ہوتا جو ائمہ اثناعشر کا ہوتا ہے، شیعہ حضرات ائمہ اطہار علیہم السلام کی امامت کے بارے میں جو عقیدہ رکھتے ہیں تو وہ امامت کے ایک خاص معنیٰ کے ساتھ ہوتا ہے، اس خاص معنیٰ کی بنا پر شیعوں کا عقیدہ ہے کہ: ائمہ اثناعشرؑ وحی اور نبوت کے علاوہ نبی اکرمؐ کے باقی تمام صفات کے حامل ہیں ان کی اطاعت تمام مسلم امہ پر واجب ہے، ان کا علم خداد ہے، وہ معصوم ہیں پس معلوم ہوا کہ بارہ اماموں۔ جو کہ رسول خداؐ کے جانشین ہیں۔ میں تین بنیادی خصوصیات پائی جاتی ہیں ا۔ عصمت ۲۔ خداداد علم اور ۳۔ وجوب اطاعت جبکہ پہلی دو خصوصیات کا تعلق تکوینی امور سے ہے اور تیسری خصوصیت تشریعی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان ائمہ (اثناعشر) کی اطاعت کا

تمام مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

امام کے علم و عصمت کا کسی خاص سن وسال کے ساتھ تعلق نہیں ہے حتی کہ یہ خصوصیات انہیں ایام طفلی میں عطا ہو جاتی ہیں، ائمہ علیہم السلام کے متعلق متعدد داستانیں ملتی ہیں کہ انہوں نے اپنے بچپن کے ایام میں نہایت ہی مشکل اور پیچیدہ علمی اور فقہی مسائل کو کم سے کم وقت میں حل کر دیا، بعض ائمہ جیسے نویں امام حضرت محمد تقی علیہ السلام اپنے بچپن کے دنوں میں ہی منصب امامت پر فائز ہوئے اور لوگوں پر واجب ہو گیا کہ آپ علیہ السلام کی اطاعت کریں۔

البتہ یہ امر- کسی نابالغ کی اطاعت کا وجوب- اسلام کے احکام متعارف سے خارج ہے اور عام افراد سے متعلق ہے کہ مسلمان کسی نابالغ شخص کی اطاعت نہیں کر سکتے جب تک وہ سن تکلیف کو نہ پہنچ جائے کوئی شخص اس کی اطاعت نہیں کر سکتا، لیکن ائمہ معصومین علیہم السلام کا حساب اس سے الگ ہے، ہمارے اور ائمہ علیہم السلام کے درمیان تکوینی امور کے علاوہ تشریعی امور اور فقہی احکام میں بھی بہت ہی فرق ہے، شاید ہم میں سے بہت سے لوگ اس طرف بہت کم متوجہ ہیں۔

بہر حال ائمہ علیہم السلام کی اطاعت لوگوں پر بعینہ اسی طرح واجب ہے جس طرح حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت فرض ہے، ائمہ علیہم السلام کا رسول خدا کے ساتھ نبوت، رسالت اور وحی کے حصول میں فرق ہے، مقام نبوت اور وحی رسالی کی دریافت صرف پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ مخصوص ہے، البتہ امام معصوم علیہ السلام "الہام" کے ذریعے عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے اور اسی راستے سے ہی ملائکہ خداوندی امام علیہ السلام کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔

(نوٹ: البتہ "وحی" اور "الہام" کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور دونوں کی دو مختلف

اصطلاحیں کیوں ہیں؟ اس بارے میں ان کے اپنے اپنے مقامات پر فرق ملاحظہ فرمائیں جو سر دست ہماری بحث سے خارج ہے، اسی طرح ائمہ علیہم السلام کے علم کے بارے میں مختلف مباحث ہیں جن کا اپنے مقام پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے، البتہ آگے چل کر سب کچھ بیان ہوگا)۔

''ولایت'' لغت کے آئینہ میں

ایک اور لفظ جو ہم اپنی اس تفصیلی گفتگو میں استعمال کریں گے اور اس پر ہماری توجہ بھی ہونی چاہیئے وہ ہے ''ولایت'' اور ولایت کے بھی امامت کی مانند مختلف معانی ہیں، عرب کے لغت شناس محققین کے مطابق ''ولایت'' کا اصلی معنیٰ ''نزدیک'' ہونا ہے، جب کوئی ایک چیز کسی دوسری چیز کے نزدیک ہوتی ہے تو اس وقت ''وَلِـیَ'' کے مادہ کو استعمال میں لاتے ہیں، جیسا کہ قرآن قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ''یـا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قَاتِلُوْا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِنَ الْکُفَّارِ'' اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو! ان کافروں کے ساتھ جنگ کرو جو تمہارے قریب ہیں (توبہ/۱۲۳)۔

یہ آیت آغاز اسلام کے مسلمانوں اور خود رسول اکرمؐ کو حکم دے رہی ہے کہ کفار کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے ابتدا ان سے کرو جو تمہارے زیادہ نزدیک ہیں اور دور کے کافروں کا رخ نہ کرو، کیونکہ اگر دور کے دشمنوں کے ساتھ لڑنے کیلئے جاؤ گے تو نزدیک کے دشمن فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہارے خلاف سازشیں کر کے تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔

بہر صورت ''و ل ی'' کا مادہ اصل میں قرب کے معنی میں ہے لیکن چونکہ دو چیزیں جو باہم نزدیک ہوتی ہیں قدرتی طور پر ان کے درمیان تاثیر اور تاثر کا رابطہ ضرور ہوتا ہے، اسی لئے جہاں پر ''ولایت'' کے کلمہ میں قرب کا مفہوم پایا جاتا ہے وہاں پر رابطہ، باہمی تعلق اور ایک

دوسرے کے ساتھ ربط وضبط کا رشتہ بھی موجود ہوتا ہے، مادی موجودات میں تاثیر اور تاثرات کی شرط یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے نزدیک ہوں، جب نزدیک ہوں گے تو تاثیر اور تاثر کے اسباب خود بخود پیدا ہو جائیں گے اور ایک دوسرے میں تصرف بھی کریں گے اور یہ "قرب" کے علاوہ ایک اور معنی ہے جو لفظ "ولایت" سے سمجھا جاتا ہے۔

یہ تصرف کبھی حقیقی اور تکوینی تصرف ہوتا ہے جسے دوسرے لفظوں میں "ولایت تکوینی" کہتے ہیں یا پھر یہ تصرف کسی اعتبار اور فریقین کے ذریعے باہمی سمجھوتے سے ہوتا ہے کہ کسی کو اس سمجھوتے میں یہ حق دیا جاتا ہے کہ دوسرے فریق کو امر اور نہی کرے اور تصرف کی اس قسم کو "ولایت تشریعی" کہتے ہیں، یعنی ایسے تصرف کو شرعی اور قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور بعض اوقات دو چیزیں ایک دوسرے کے نزدیک ہوتی ہیں ان کے درمیان ولایت کا رابطہ دونوں اطراف میں ہوتا ہے، مثلاً قرآن مجید فرماتا ہے: "وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ "مومن چاہے مرد ہوں یا عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں (توبہ/۷۱) ان میں سے ہر ایک مؤمن دوسرے مؤمنین کے ساتھ ولایت کا حق رکھتا ہے اور اس ولایت کو "طرفین کی ولایت" کہتے ہیں اور خداوند اور مومنین کا باہمی رابطہ بھی اس قبیل سے ہے، چنانچہ قرآن مجید جہاں یہ فرماتا ہے: "اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا "اللہ مومنین کا ولی ہے (بقرہ/۲۵۷) وہاں یہ بھی ہے کہ: "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ "یاد رکھو کہ اللہ کے اولیاء........ (یونس/۶۲) گویا یہ بتایا جا رہا ہے کہ خدا مومنین کا ولی ہے اور مومنین اللہ کے ولی ہیں۔

جو قرب بندوں کا خدا سے حاصل ہو جاتا ہے وہ اس بات کا موجب بن جاتا ہے کہ خدا بندوں کا ولی بن جائے اور وہ ان پر اپنی خصوصی توجہ مرکوز رکھے، ان کے کاموں کی تکمیل اپنے ذمہ لے لے، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو اپنے سپرد نہیں کر دیتا بلکہ وہ خود ہی ان کی مشکلات کو حل فرماتا

ہے حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ خود فرماتا ہے: ''کُنتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرهُ الَّذِیْ یَبْصُرُ بِهٖ وَلِسَانَهُ الَّذِیْ یَنْطِقُ بِهٖ..... ''میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جسے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس کے ذریعہ وہ دیکھتا ہے اور زبان ہو جاتا ہوں جس کے ذریعہ وہ بولتا ہے........ (بحار الانوار جلد ۷۰ باب ۴۳ روایت ۲۱)

جب مومن ''ولی'' کے مقام و منصب تک پہنچتا ہے اور ''اولیاء اللہ'' میں اس کا شمار ہونے لگ جاتا ہے تو خداوند عالم اسے کے تمام امور اپنے ذمہ لے لیتا ہے، جب بندہ خدا کے ساتھ فقط بندگی کے رابطہ کی فکر میں ہوتا ہے تو خداوند تعالیٰ بھی اس کے تمام امور کا کفیل ہو جاتا ہے اور اس کو خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ ''ولایت الٰہی'' کا ایک لازمی امر ہے اور ایسے لوگوں کیلئے خداوند تعالیٰ نے دو خصوصیات ذکر فرمائی ہیں، ایک ''لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ'' اور دوسرے ''وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْن.'' (یونس ۶۲) ایسے لوگ نہ تو گزشتہ دور کا ڈر رکھتے ہیں اور نہ ہی آئندہ کا کوئی خدشہ ہوتا ہے، کیونکہ ان کا سارا معاملہ ہی اللہ کے سپرد ہوتا ہے اور انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ خدا جو بھی ان کیلئے کرے گا بہتر ہی کرے گا، وہ جانتے ہیں کہ خدا انہیں جو بھی دے گا اس میں ان کی بھلائی ہوگی، اسی لئے انہیں کسی خوف خطر کی ضرورت نہیں ہوتی اور مرتے وقت بھی خدا کے فرشتے ان پر نازل ہو کر انہیں بہشت کی خوشخبری دیتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ''اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ'' یقیناً جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہمارا رب (پروردگار) اللہ ہے، پھر وہ اس پر ڈٹ گئے، تو فرشتے ان پر نازل ہوتے ہیں (اور کہتے) ہیں کہ نہ تو کسی قسم کرو اور نہ ہی غمگین ہو اور تمہیں جس بہشت کا وعدہ دیا جاتا تھا اس پر تم خوشی مناؤ۔

''وحی'' اور ''الہام'' میں فرق

جی ہاں! یہ بات خدا کے فضل و کرم سے دور نہیں ہے کہ کچھ لوگوں پر ان کے مرنے سے پہلے فرشتے نازل ہوں اور انہیں خوشخبری سنائیں، لیکن یہ بات ضرور یاد رکھیں کہ اولیاء اللہ پر اس قسم کے فرشتوں کا نزول وہ نزول نہیں ہوتا جو انبیاء اور رسولوں پر ہوتا ہے، کسی انسان پر فرشتے کا نازل ہونا اس بات کا موجب نہیں ہوتا کہ وہ پیغمبر بھی ہو، کیونکہ ''وحی رسالی'' ایک مخصوص وحی ہوتی ہے جو اسے وصول کرتا ہے وہ عہدہ نبوت کا حامل ہوتا ہے، لیکن جو عام معنوں میں وحی ہوتی ہے اس کا نبوت کی وحی یعنی وحی رسالی سے تعلق نہیں ہوتا، قرآن مجید کی صراحت کے مطابق بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں غیر انبیاءؑ پر وحی ہوئی ہے، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرف وحی ہوئی جبکہ وہ نبی نہیں تھے: ''وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ اَنْ آمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ '' اور اس وقت کو یاد کرو جب میں نے (حضرت عیسیٰؑ کے) حواریوں کی طرف وحی کی مجھ پر ایمان رکھو اور میرے رسول پر۔ (مائدہ/۱۱۱) یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف وحی ہوئی: ''وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَرْضِعِيْهِ '' اور ہم نے مادر موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ اس (موسیٰؑ) کو دودھ پلاؤ (قصص/۷) یا حضرت مریم علیہا السلام کی طرف وحی کی گئی: ''وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ'' وہ وقت کو یادرو جب فرشتوں نے کہا اے مریمؑ! بے شک اللہ نے تمہیں چن لیا اور تمہیں پاک و پاکیزہ کیا اور تمام عالمین کی عورتوں میں سے تمہیں منتخب کرلیا ہے۔ (آل عمران/۱۴۲) غیر انبیاءؑ نے فرشتوں کو دیکھا بھی ہے۔

کیا حضرت مریم علیہ السلام نے فرشتوں کو نہیں دیکھا؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کیلئے

فرشتے کو انسانی صورت میں بھیجا جسے دیکھ کر وہ پریشان ہو گئیں اور فرمایا: ''تم کون ہو؟ اجازت کے بغیر اور اطلاع دیئے بغیر اندر آ گئے ہو؟ اِنِّی اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا (مریم/۱۸) اگر تم متقی انسان بھی ہو پھر بھی میں تم سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں کہ کہیں تمہارا برا ارادہ نہ ہو!''۔

یہ سن کر فرشتے نے کہا: ''اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ'' میں آپ کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں مجھے حکم ملا ہے کہ: ''لِاَهَبَ لَکِ غُلَامًا زَکِیًّا'' میں آپ کو نیک فرزند عطا کروں۔ (مریم/۱۹)

معلوم ہوا کہ جو شخص نبی یا رسول نہ ہو وہ بھی فرشتے کو دیکھ سکتا ہے اور اس سے باتیں بھی کر سکتا ہے لیکن اس قسم کے دیکھنے یا باتیں کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ وہ شخص نبی یا رسول ہے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے، کیونکہ ''وحی رسالی'' کی اپنی ایک خاص خوبی ہے جسے صرف پیغمبر ہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قسم کی ہے اور اسی وحی کے ذریعہ وہ نبوت یا رسالت کے منصب پر فائز ہوتا ہے، لیکن دیگر بندگان خداوند عالم کہ جن میں ائمہ معصومین علیہم السلام بھی شامل ہیں ممکن ہے کہ خدا کے فرشتے کو بھی دیکھیں اور ان کے ساتھ باتیں بھی کریں مگر ان کا ایسا کرنا ان کے نبی یا رسول ہونے کے معنی میں نہیں ہے۔

ہم یہ بات اس لئے ذکر کی بعض شیاطین اور غرض بندے اپنی کتابوں اور مقالوں میں شیعیت کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں اور انہیں متہم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ فرشتے ائمہ کرام علیہم السلام پر نازل ہوتے ہیں اسی لئے وہ پیغمبر ہیں۔

ٹھیک ہے کہ ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فرشتے ائمہ پر نازل ہوتے ہیں لیکن جن پر فرشتے نازل ہوں ضروری نہیں کہ وہ نبی بھی ہوتا ہو، آیا حضرت مریم علیہا السلام یا حضرت علیہ السلام کے

حواری پیغمبر تھے کہ ان پر فرشتے نازل ہوئے؟ یا وحی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جہاں فرشتے اتریں یا وحی نازل ہو ضروری نہیں ہوتا کہ وہ نبی بھی ہو، کیونکہ نبوت اور رسالت کی ایک مخصوص وحی ہوتی ہے جس کے ضمن میں مخصوص فرشتہ خدا کی جانب سے اسی مخصوص شخص کو پہچانتا ہے اور وہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

وحی اور الہام اور ان کی اقسام اور ان کے درمیان فرق کے بارے میں متعدد روایات موجود ہیں، قارئین محترم اس بارے میں متعلقہ کتابوں کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔

کیا انسان کی ''ولایتِ'' تکوینی سے ''شرک'' لازم آتا ہے؟

ہم ائمہ اطہار علیہم السلام کے بارے میں جس ولایت کے قائل ہیں اس کی دو قسمیں ہیں ا۔ ولایت تکوینی ۲۔ ولایت تشریعی: ولایت تکوینی یہ ہوتی ہے کہ خداوند عالم اپنے بعض بندوں کو قدرت عطا فرماتا ہے کہ وہ اپنے ارادے سے عالم وجود میں تصرف کر سکیں، مثلاً وہ لوگوں کے دلی راز سے آگاہ ہو سکتے ہیں یا ان میں تصرف کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، مثلاً بیمار کو شفاء دے سکتے ہیں حتیٰ کہ مردوں کو بھی زندہ کر سکتے ہیں۔

بعض اوقات مخالفین تشیع ہمیں تہمت لگاتے ہیں کہ ''تم لوگ اپنے ائمہ کیلئے خدائی مقام کے قائل ہو، کیونکہ تم کہتے ہو کہ ائمہ کرامؑ مریضوں کو شفا دیتے ہیں یا مُردوں کو زندہ کرتے ہیں'' تو ہمارا جواب یہ ہے کہ آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا تھا؟ اگر کیا تھا تو وہ خدا تھے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ ''عبداللہ'' یعنی خدا کے خالص و مخلص بندے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مقام عنایت فرمایا تھا کہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے، مادرزاد اندھے کو آنکھیں دیا کرتے تھے، کوڑھی کو شفاء کاملہ دیا کرتے تھے، یہ سب اس لئے نہیں تھا کہ وہ خدا تھے، بلکہ وہ یہ

سب کچھ حکم خداوندی سے کیا کرتے تھے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں: ''وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ''میں باذن اللہ (خدا کی اجازت سے) اندھوں اور برص کے مریضوں کو ٹھیک کرتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ (آل عمران/۴۹)

اگر ان امور کی انجام دہی خداوند تعالیٰ کے اذن سے ہوتی ہے تو پھر یہ بات از خود ختم ہو جاتی ہے کہ وہ رب تھے، کیونکہ ''ربوبیت'' تو یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص خدا سے رابطہ کئے بغیر اپنی طرف سے مستقل کوئی کام انجام دے لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے استقلال کا دعویٰ کرتے ہوئے ایسا کرے تو شرک ہوگا۔ البتہ شرک کی بھی کئی قسمیں ہیں اور اس قسم کے شرک کو ''ربوبیت تکوینی میں شرک'' کہا جاتا ہے۔

جبکہ شرک کی ایک اور قسم ''ربوبیت تشریعی میں شرک'' ہے اور ربوبیت تشریعی میں شرک یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس بات کا عقیدہ رکھے کہ ''خدا علاوہ کوئی اور شخص مستقل اور اصلی صورت میں خدا کے متوازی قوانین وضع کرنے کا حق رکھتا ہے''۔

کسی دوسرے شخص میں تصرف چاہے تکوینی ہو یا تشریعی دونوں صورتوں میں اللہ کے اذن کے مطابق ہوں اور اگر ان میں سے کسی کو باذن اللہ نہ مانیں تو ہم مشرک ہو جائیں گے، چنانچہ ہم یہ جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں، بیماروں کو شفا دے سکتے ہیں ...... وغیرہ تو یہ سب اس صورت میں ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے یہ تمام کام باذن اللہ انجام پاتے ہیں۔

البتہ بعض لوگوں نے اس اشکال کہ: ''یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ''امام شفا دیتا ہے'' کے جواب میں کہا کہ: ''امام دعا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے شفا کی درخواست کرتا ہے تو اللہ شفا عطا کرتا ہے'' اگر تو جیہات کے ساتھ ممکن ہے کہ یہ جواب قابل قبول ہو، لیکن ہر حالت میں ہم ان بزرگ و

برتر ہستیوں کے افعال کو ان کی اپنی طرف بھی نسبت دے سکتے ہیں، جس طرح کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باذن اللہ زندہ کیا کرتے تھے لیکن کہتے تھے ''اُحیِ الْمَوْتیٰ'' میں زندہ کرتا ہوں اور یہ نہیں کہتے تھے کہ: ''میں دعا کرتا ہوں کہ خدا مردوں کو زندہ کردے'' اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کا مقام ان سے کمتر ہی نہیں بلکہ برتر بھی ہے اور اس بارے میں نہ صرف اس کے برخلاف کسی کے پاس دلیل ہی نہیں بلکہ اس کی تائید میں بڑی فروانی کے ساتھ روایات بھی موجود ہیں، البتہ یہ بات اول ہی سے ذہن نشین رہے کہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہے خدا کی طرف سے اور خداوند جب چاہے کسی موجود سے وہ واپس لے لے جو اس نے دیا ہے اور اس کے مقابلے میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ہمیشہ مدنظر رہے کہ خداوند کریم نے ائمہ طاہرین علیہم السلام کو اس قدر مقامات عطا فرمائے ہیں جن میں سے بہت سے مقامات ہمارے تصور سے بھی خارج ہیں۔

پس بنابریں حضرات ائمہ اطہار علیہم السلام باذن اللہ بیماروں کو شفا دیتے ہیں، مُردوں کو زندہ کرتے ہیں، لوگوں کی حاجات کو سمجھتے ہیں اور ان کی فریاد کو پہنچتے ہیں، ساتھ ہی یہ کہ اپنی طرف سے وہ کچھ نہیں رکھتے ان کے پاس جو کچھ ہے خدا کی طرف سے ہے البتہ یہ عقیدہ مذہب شیعہ کی ضروریات میں شامل نہیں ہے، اگر کوئی ایسا عقیدہ نہیں رکھتا تو اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ شیعیت ہی سے خارج ہیں، لیکن شیعیت کے یقینی عقائد میں سے ضرور ہے اگر کوئی شخص یہ عقیدہ نہیں رکھتا تو ائمہ معصومین علیہم السلام کے بارے اس کی معرفت کمزور ہے۔

ائمہ علیہم السلام کی ''ولایت تشریعی'' کے بارے شیعوں کا عقیدہ

آج کل جو مسئلہ سب سے زیادہ ہماری توجہ کا طلبگار ہے کہ جس کے معنی ہیں کہ یہ

ذوات مقدسہ خداوند عالم کی طرف سے لوگوں پر حاکم ہیں اور لوگوں پر ان کی اطاعت ہر حالت میں واجب ہے، حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام کہ جن کی تعداد بارہ ہے کے بارے میں مذہب شیعہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ان کی اطاعت واجب ہے، ولایت تشریعی، امامت اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں ہمارے عقائد کی اصل بنیاد ہے اور جس طرح ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ شیعیت کی خصوصی اصطلاح میں یہ امامت، رسول اکرمؐ کی خلافت اور جانشینی کے معنیٰ میں ہے، جس کے تین بنیادی ارکان ہیں جن میں تیسرا رکن ولایت تشریعی اور لوگوں پر ان کی اطاعت کا وجوب ہے اور یہ مطلق ولایت ہے جس میں کسی قسم کی قید و شرط نہیں ہے یعنی ائمہ اطہار جو بھی امر و نہی کریں اس کی اطاعت لوگوں پر واجب ہے، حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام کی تشریعی ولایت کا دائرہ زیادہ تر احکام اور معاشرتی مسائل سے متعلق، جیسے مختلف انواع کے معاملات، حقوق معاشرہ کے باہمی فرائض اور مسائل، مثلاً جہاد، دفاع، اقتصادی، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل غرض یہ سب کے سب اسلام کے اجتماعی معاشرتی احکام ہیں جن کے اجراء کی ضمانت معاشرتی امور کے چلانے والے کے پاس ہوتی ہے جن میں سرفہرست خود حضور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپؐ کے بعد آپؐ کے مقدس اور معصوم بارہ امام ہیں، جس بھی مسئلے کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی اور معاشرتی امور سے ہے اس بارے میں امام کے اوامر اور نواہی واجب الاطاعت ہیں اور یہ بات قطعی شیعہ عقائد میں شامل ہے اور اس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

امام معصومؑ کے بعد یا جس وقت کہ امامؑ پردہ غیبت میں ہیں اور لوگوں کی رسائی ان تک نہیں ہوسکتی تو عوام کا فرض بنتا ہے کہ ان امور میں ''فقیہ جامع الشرائط'' کی طرف رجوع کریں اور اس کی اطاعت کریں، فقیہ کی یہ اطاعت گویا پیغمبرؐ اور امامؑ کی اطاعت ہوتی ہے اور یہ اطاعت

مطلق ہوگی جو مذکورہ تمام موارد کو شامل ہوگی بجز اس کے کہ جہاں پر کوئی خاص دلیل موجود ہو، جس نے بعض موارد کو مستثنیٰ قرار دیا ہو اور اس بارے میں صرف امام معصوم علیہ السلام کیلئے ولایت کو مختص کر دیا ہو۔

لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک وقت میں برابر کے کئی "فقہائے جامع الشرائط" کا بطور حاکم ایک معاشرے کو چلانا ناممکن ہے! تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک وقت میں ایسے فقہا کی موجودگی کی صورت میں ان میں سے صرف ایک فقیہ بطور حاکم ان امور کو سنبھالے گا اور یہ شخص تین شرائط کا حامل ہونا چاہئے ا۔ اسلامی احکام کا علم رکھنے میں، ۲۔ صاحب تقویٰ ہونے میں اور ۳۔ حکومت چلانے کی اہمیت رکھنے میں اور اسلامی امہ کی مصلحتوں کو خوب سمجھنے میں دیگر فقہا سے برتر ہو، ایسا فقیہ امام معصومؑ کا اس زمانے میں نائب ہوتا ہے اور اس کی اطاعت بھی امام معصوم علیہ السلام کی اطاعت کی مانند واجب ہوتی ہے۔

"ولایت فقیہ" کی تعبیر لوگوں کیلئے توہین آمیز ہے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ "ولایت فقیہ" ایک ایسی تعبیر ہے جو عوام الناس کی توہین پر مشتمل ہے، وہ اپنے اس مدعا کیلئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اسلامی فقہ میں ولایت صرف تین صورتوں میں قرار دی گئی ہے:

ا:۔ صغیر اور نابالغ بچوں کیلئے جبکہ وہ ابھی قانونی طور پر سن بلوغ کو نہ پہنچے ہوں۔

۲: سفلیہ (بیوقوف) کیلئے جو قانونی طور پر سن بلوغ کو پہنچنے کے باوجود عقل معاش سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اپنے مال اور معاشرتی امور میں تصرف کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

۳:۔ دیوانوں اور مجنونوں کیلئے، چنانچہ اسلام اور اسلامی فقہ نے ان تین قسم کے لوگوں

کیلئے۔ان میں سے ہر ایک گروہ مسائل کو سمجھنے اور اچھے برے کے درمیان تمیز کرنے سے عاری ہوتا ہے لہٰذا۔''ولی''اور''قیم''(سر پرست)مقرر کیا ہے تا کہ وہ ان کی بجائے ان کے لئے مال اور معاشرتی اموو میں فیصلہ کر سکے،اسی لئے''ولی''اور''ولایت''کا لفظ صرف نابالغ بچوں، بے وقوفوں اور پاگل دیوانوں کے بارے میں بولا جاتا ہے،اس لئے یہ کہنا کہ''لوگوں کو ولی فقیہ اور ولایت فقیہ کی ضرورت ہے''در حقیقت لوگوں کی توہین ہے اور انہیں صغیر (نابالغ) سفلیہ (بیوقوف) اور مجنون (پاگل دیوانہ) سمجھنا ہے۔

واضح سی بات ہے کہ ان لوگوں کا یہ کہنا مغالطہ سے زیادہ کچھ نہیں اور ولایت کے مفہوم میں خوب اچھی طرح غور کرنے سے یہ مغالطہ آشکارا ہو جاتا ہے، ہر معاشرے کو ضرورت ہوتی ہے کہ ایک فرد یا ایک نظام حکومت ان کے امور زندگی کو رواں دواں رکھے اور اس امر کے لزوم میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اور اسلامی طرز معاشرت میں معاشرہ کو چلانے اور اس کے امور کو اپنے اختیار میں رکھنے والے یعنی رہبر و پیشوا اور لوگوں کے درمیان جو چیز رابطہ برقرار رکھتی ہے اسے''ولایت''کہا جاتا ہے، ولایت کے جس لغوی،عرفی اور اصطلاحی معنیٰ سے چودہ سو سال سے لوگ آشنا چلے آتے ہیں اس سے بھی ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے، اس وقت سے آج تک جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ امام معصومؑ''ولی''ہے، کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ عوام بے وقوف ہیں، آیا''اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا''(بقرہ/۲۵۷) کا معنیٰ ہے اللہ بے وقوف اور پاگلوں کا ولی ہے؟ یا جب یہ پڑھتے ہیں:''اَلْمُؤْمِنُوْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ''(توبہ/۷۱) یعنی چہ؟ آیا یہ معنی ہوگا کہ مومنین چند بے وقوفوں اور پاگلوں کا ایک مجموعہ ہیں جو ایک دوسرے کے ولی ہیں؟۔

امام اور امت کے درمیان جو رابطہ ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ امام برحق لوگوں کی

رہبری اور انہیں حکم دینے کا حق رکھتا ہو اور لوگوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ اس کے حکم کی اطاعت کریں، البتہ لوگوں کی اطاعت کے بدلے میں امام پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں جو لوگوں کے حقوق بن جاتے ہیں اس رابطے کو اصطلاح اور اسلامی ثقافت میں ''ولایت'' کہتے ہیں۔

اس سلسلے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ولایت فقیہ کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ لوگ بے وقوف ہیں یا نابالغ ہیں اور پاگل ہیں اور ولی فقیہ ان کا قیم اور سرپرست ہے، بلکہ عوام اور ولی فقیہ کے درمیان وہی رابطہ ہوتا ہے جو معاشرہ کا ایک شرعی اور قانونی حاکم کا اس کے عوام سے ہوتا ہے، البتہ ان کا آپس میں عمدہ ترین فرق یہ ہے کہ یہاں پر چونکہ حاکیت دین اور شریعت کی بنیاد پر ہوتی ہے اور ولی اور حاکم کی ولایت، الٰہی ولایت کی ایک شعاع ہوتی ہے اسی لئے ''امام'' اور ''ولی'' ایک خاص تقدس کا حامل ہوتا ہے۔

''ولی فقیہ'' کی ''ولایت مطلقہ''

ایک اور مسئلہ جو فقیہ کی ولایت کے متعلق ہے وہ ہے اس کی ''ولایت مطلقہ'' اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک معاشرہ کیلئے شرعی رہبر کی ان تمام چیزوں میں اطاعت ضروری ہے جن کی ضرورت لوگوں کو اپنے تمام معاشرتی اور اجتماعی امور میں ہوتی ہے۔

''مطلق'' ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو تمام حکومتی امور میں ''ولایت فقیہ'' کی اطاعت کرنی چاہیئے ایسا نہ ہو کہ کچھ امور میں تو ولی فقیہ کی اطاعت کریں اور باقی امور میں کسی اور سیاسی حکومت کی، جبکہ ''ولایت'' اور ''حکومت'' کو جدا کر دیا گیا ہو، کیونکہ ولایت فقیہ کی تھیوری یہ ہے کہ تمام سرکاری مشینری ایک نقطہ پر مجتمع ہوتی ہے اور ان تمام امور میں ولی فقیہ حاکم ہوتا ہے، باقی تمام لوگوں کو اس کی اطاعت کرنا چاہیئے۔

ایسے نظام میں صدر مملکت کی قانونی حیثیت بھی ولی فقیہ کے ''اذن'' اور ''نصب'' پر موقوف ہے، چنانچہ اس بارے میں امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اگر فقیہ کا تعلق ختم ہو جائے اور ولایت کا کوئی تعلق نہ ہو تو، یہ طاغوت ہوگا، یا خدا یا پھر طاغوت، اگر صدر مملکت، فقیہ کے ذریعہ نصب نہ ہو تو یہ غیر قانونی ہوگا، جب غیر قانونی ہوا تو طاغوت ہوگا اور اس کی اطاعت طاغوت کی اطاعت ہوگی''۔ (صحیفہ نور جلد ۹ ص ۲۵۳)

ولایت فقیہ کا معنی ہے کہ حکومت کی سربراہی کا اعلیٰ مقام جہاں پر امام معصومؑ کا جانشین رونق افروز ہوتا ہے، فقیہ کا دوسرے لوگوں سے یہ فرق ہوتا ہے کہ جسے ایک کلمہ میں ادا کیا جا سکتا ہے کہ وہ تمام لوگوں سے زیادہ امام معصوم علیہ السلام سے مشابہ ہوتا ہے، ہر دور میں جو شخص علم، تقویٰ اور عوام الناس کی بہتری کی تشخیص کے لحاظ سے امام معصوم کے مشابہ ہو وہ حکومت کا سربراہ اعلیٰ ہوتا ہے اور معاشرہ کے تمام افراد خواہ وہ فقیہ ہوں یا غیر فقیہ، لوگوں کا منتخب شدہ ہوں یا غیر منتخب، قاضی ہوں یا غیر قاضی غرض ہر شخص اور ہر عہدے کے مالک حکومتی امور میں اس کی اطاعت کرنا ہوگی، جس طرح کہ اگر خود امام معصوم علیہ السلام سربراہ حکومت ہوتے تو لوگوں کو ان کی اطاعت کرنا ضروری ہو جاتی۔

امور حکومت میں امام معصوم علیہ السلام اور ولی فقیہ میں نمایاں فرق علم جیسے عامل کا ہوتا ہے امام معصوم علیہ السلام کا علم خداداد ہوتا ہے امام کو کسی سے کسب حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے وہ کسی بھی امر میں دوسروں کی راہنمائی اور مشورے کا محتاج نہیں ہوتا البتہ لوگوں کی راہنمائی اور کئی دوسرے مصلحتوں کے پیش نظر مشورہ کی نیت سے استفادہ کرتا ہے ''وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ'' (شوریٰ/ ۳۸) اور ''وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ''۔ (آل عمران/ ۱۵۹)

غیر معصوم رہبر اس طرح نہیں ہوتا، اسے ہر امر میں اس امر کے ماہر (سپیشلسٹ) سے

مشورہ کرنا ہوتا ہے یہ جو ہم اپنے اسلامی نظام میں ''شوریٰ'' کو موجود پاتے ہیں مثلاً ''مجلس شوریٰ اسلامی'' یا کوئی اور ''شوریٰ'' تو اس کا فلسفہ یہی ہے کہ غیر معصوم رہبر تمام چیزوں کا ماہر نہیں ہوتا، لہٰذا اسے متعلقہ ماہر لوگوں سے مشورہ کرنا چاہئے اوران سے نظریہ معلوم کرنا چاہئے تا کہ مطمئن ہو جائے کہ معاشرے کی مصلحت کا کیا تقاضا ہے؟ تا کہ اس بارے میں مناسب حکم دے اور جب وہ اس کا حکم صادر کردے گا تو اس کی اطاعت ہر ایک پر واجب ہو جائے گی، حتیٰ کہ دوسرے تمام فقہاء اور مراجع پر بھی۔

اس مسئلہ کی مثال کہ تمام فقہاء جسے قبول کریں یہ ہے کہ: ''اگر فقیہ کسی موقع پر کوئی کوئی فیصلہ کرے اور حکم صادر کردے تو دوسرے کسی بھی فقیہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اسے توڑ دے یا اسے ختم کردے، اب فقیہ کے حکم کو نقض کرنا اور توڑنا حرام ہو جائے گا''۔

جب کوئی فقیہ حکومت کا سربراہ ہو اور اسلامی امور کے نظم و نسق کو اپنے اختیار میں لے لے تو وہ جو بھی حکم کرے گا کوئی دوسرا حاکم اس کو توڑنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اسے اس کی اطاعت کرنا ہوگی۔

آیا ''فقیہ'' کی ''ولایت مطلقہ'' سے ''شرک'' لازم آتا ہے؟

بعض جاہل یا مطلب پرست لوگ ولایت فقیہ کا ایک اور طرح سے معنی کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ولایت مطلقہ صرف اور صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ اس ساری کائنات میں صرف ایک ہی وجود مطلق ہے جس کا نام ہے ''اللہ'' لہٰذا خدا کے علاوہ کسی کے پاس بھی ولایت مطلقہ نہیں ہے اور ولی فقیہ کی ولایت مطلقہ کا قائل ہونا گویا خدا کے ساتھ شریک قرار دینا ہے''۔

ان لوگوں کا یہ بیان اسلامی تعلیمات سے باخبر لوگوں کیلئے ایک ہنسی مذاق سے زیادہ

حیثیت نہیں رکھتا، چہ جائیکہ اسے کوئی علمی یا سنجیدہ اعتراض کہا جائے، کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو اطلاق خداوند تعالٰی کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی بھی اس میں اس کا شریک نہیں وہ ہے اس کا وجود کے لحاظ سے مطلق ہونا، جسے اسلامی فلسفہ میں ''صرف الوجود'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، جس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ خداوند تعالٰی ایک ایسا وجود ہے جس کی کوئی حد وانتہا نہیں، نہ کوئی قید اور حد مقرر ہے، جبکہ ہمای اس بحث یعنی ''ولایت فقیہ'' کی بحث میں ''اطلاق وجودی'' کے بارے میں گفتگو نہیں ہو رہی، بلکہ ''اطلاق ولایت'' کے بارے بحث ہو رہی ہے، یعنی ہمارا مدعا یہ ہے کہ خداوند تعالٰی نے اپنے پیغمبرؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کیلئے ''ولایت مطلقہ'' مقرر فرمائی ہے اسی طرح امام معصومؑ بھی اپنے لئے جانشین مقرر فرماتا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے: ''مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مِمَّنْ قَدْرَوٰی حَدِيْثَنَا وَنَظَرَ فِيْ حَلَالِنَا وَحَرَامِنَا وَعَرَفَ اَحْكَامَنَا فَيَرْضَوْا بِهٖ حِكَمًا فَاِنِّي قَدْ جَعَلْتُهُ عَلَيْكُمْ حَاكِمًا فَاِذَا حَكَمَ بِحُكْمِنَا فَلَمْ يَقْبَلْهُ مِنْهُ فَاِنَّمَا اسْتَخَفَّ بِحُكْمِ اللّٰهِ وَعَلَيْنَا رَدَّ وَالرَّآدُّ وَالرَّآدُّ عَلَيْنَا وَهُوَ عَلٰی حَدِّ الشِّرْكِ بِاللّٰهِ'' تم میں سے جو شخص ہماری کوئی روایت کرتا ہے، ہمارے حلال وحرام کو بھی مدنظر رکھتا ہے، ہمارے احکام کو سمجھتا ہے، تو چاہیئے کہ وہاں کے لوگ اس کے حاکم ہونے پر راضی ہو جائیں کیونکہ میں نے اسے تمہارے اوپر حاکم مقرر کیا ہے، پس وہ جب بھی حکم صادر فرمائے اور کوئی اسے قبول نہ کرے وہ حکم خدا کو سبک سمجھے گا اور ہمارے حکم کو ٹالے گا، جو ہمیں ٹالے گا وہ خدا کو بھی ٹالے گا اور اس کا گناہ، خدا کے ساتھ شریک قرار دینے کی حد تک پہنچ جائے گا۔ (اصول کافی جلد ۱ ص ۶۷ روایت ۱۰)

آیا "فقیہ" کی "ولایت مطلقہ" اسلام سے چھٹکارہ ہے؟

کچھ اورروگ ہیں جو خود کو "اسلام شناس" کہلواتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان میں عمامہ پوش زیادہ ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ "ولایت مطلقہ" کے معنی ہیں "اسلام سے اطلاق" یعنی اسلام سے چھٹکارہ، بالفاظ دیگر ایسی ولایت جو اسلام سے متعلق ہو، یعنی لازم نہیں ہے کہ ولی فقیہ اسلامی احکام پر عمل کرے بلکہ اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف بھی فیصلہ کرسکتا ہے۔

بعض اوقات انسان کو کچھ ایسی باتیں سننے کو ملتی ہیں جن سے وہ حیران ہو جاتا ہے، خدا جانے یہ کج اندیشی ہے یا خود غرضی؟ وہ نہیں جانتے کہ خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ سے جو اس کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز شخصیت ہیں اور انہیں ولایت کے بالاترین مرتبے سے نوازا ہے چنانچہ ارشاد فرماتا ہے: "وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ" اگرحتی کہ پیغمبر بھی اپنی طرف سے اور اس کے برخلاف کوئی بات کرے جس کا ہم نے اسے حکم دیا ہے، تو ہم پوری قوت سے اس کا مواخذہ کریں گے اس کی رگ حیات کو کاٹ دیں گے۔ (الحاقہ/۴۴تا۴۶)

دیکھا آپ نے اللہ تعالیٰ اپنی محبوب ترین ہستی کے بارے میں یہ فرما رہا ہے تو پھر ان آیات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ "اسلام میں فقیہ کو حق حاصل ہے کہ اسلام کو نقض اور نسخ کرسکتا ہے؟ کیا ولایت مطلقہ فقیہ کا یہی معنی ہے؟" یہ شیطانیت آمیز باتیں اور ولایت مطلقہ فقیہ کے معنی میں تحریف کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

یہاں پر "ولایت فقیہ"، "ولایت مقیدہ" کے مقابلے میں ہے، جب "حکام عدل" کے ہاتھ آزاد نہیں ہوتے تو اس وقت فقہاء خاص صورتوں میں اپنی ولایت کو کام میں لاتے ہیں اور

''حکومت در حکومت'' تشکیل دیتے ہیں، بطور مثال پہلوی دور حکومت میں فقہاء سے تو جینے کا حق بھی چھین لیا گیا تھا اور متدین افراد اپنے بعض خصوصی امور میں۔ مثلاً نابالغ بچوں کیلئے قیم (سرپرست) کی موقوفہ کیلئے متولی وغیرہ مقرر کرنے کیلئے۔ فقہاء سے اجازت حاصل کیا کرتے تھے، ان امور کو فقہی اصطلاح میں ''امور حسبیہ'' کہتے ہیں۔

ایسے زمانے کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ جس میں ولی فقیہ ''مبسوط الید'' (کامل اختیارات کا حامل) نہیں ہوتا اور فقط ایک محدود حد تک ولایت کا حق استعمال کرسکتا ہے۔

ولایت مطلقہ اس زمانے میں موثر ہوتی ہے جب فقیہ پوری طرح مبسوط الید ہو اور حکومت بھی اس کے اختیار میں ہو تو ایسے زمانے میں فقیہ کی ولایت مطلق ہوتی ہے، یعنی فقیہ ان تمام مسائل میں جو حکومت سے متعلق ہیں اسلامی احکام اور معاشرتی بھلائیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مداخلت کر کے ازخود فیصلے کرسکتا ہے اور اس کا امر اور فیصلہ واجب التعمیل ہوگا اور اس کے رسول اور ان لوگوں کو اپنا ولی سمجھتے ہیں جو ایمان لاچکے ہیں (وہ کامیاب اور کامران ہے) اس لئے کہ حزب اللہ ہی کامیاب و کامران ہے۔ (سورہ مائدہ/۵۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ولایت الٰہی اورولایت اہل بیتؑ دوعلیحدہ چیزیں نہیں

ولایت اورحزب اللہ

قرآن مجید میں دومقامات پر''حزب اللہ'' کے جملے کواستعمال کیا گیا ہے۔ان میں سے ایک کوسورہ مائدہ کی ۵۶ویں آیت میں ارشادہوتا ہے۔''اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ '' تمہاراولی توبس اللہ اوراس کا رسول ہے اوروہ لوگ ہیں جوایماندر ہیں وہی جونماز قائم کرتے ہیں اوررکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔اور جوشخص خدا، رسول اور ایمانداروں کواپنا ولی مانتا ہے (کامیاب وکامران ہے کیونکہ) اللہ کا گروہ ہے ہی غالب۔

یہ آیت شریفہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کے رکوع کی حالت میں راہ خدا میں خرچ کرنے کے بارے میں ہے۔شیعہ،سنی مفسرین اورمحدثین نے اس آیت کے شان نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ''ایک سائل مسجد کے دروازے پرآیا اوراس نے اپنی ضرورت اور احتیاج کوبیان کیا،لیکن کسی نے کچھ نہ دیا اس وقت امیرالمومنین علیہ السلام نماز پڑھنے میں مشغول تھے اوررکوع کررہے تھے،اسی عالم میں سائل کواپنی انگشتری کا اشارہ کیا اوراس نے وہ لے لی۔ اس واقعہ کے بعد آیہ مذکورہ آن جناب کی شان اورمقام ومنزل کے بارے میں نازل ہوئی۔

اسی آیت میں''زکوٰۃ'' کاذکرآیا ہے۔قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کاتعلق واجب

زکوٰۃ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ واجب اور مستحب دونوں کے لئے اس کا اطلاق ہوتا ہے بہر صورت آیت مجیدہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ کہہ رہی ہے کہ جو لوگ اللہ، رسول اور ان مومنین کی ولایت کو قبول کرتے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے وہی ''حزب اللہ'' ہیں۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ خداوند متال نے اس آیت میں ''اہل ولایت'' اور ''حزب اللہ'' کو ایک قرار دیا ہے۔

دوسری آیت کہ جس میں حزب اللہ کا تذکرہ ہے وہ سورہ مجادلہ کی بائیسویں آیت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ''لَاتَجِدُ قَوْمًا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَیُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' تم ایسی قوم نہیں پاؤ گے جو خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں اور (ساتھ ہی) ان لوگوں کو دوست رکھتے ہوں جنہوں نے خدا اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں بھائی ہوں یا ان کا خویش قبیلہ۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو لکھ دیا ہے اور اپنی جانب سے روح کے ذریعہ ان کی تائید کی ہے۔ اور انہیں ایسی بہشتوں میں داخل کر دے گا جن کے (درختوں) کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی یہی لوگ ''حزب اللہ'' ہیں؟ حجابات خدا کا حزب ہی تو فلاح پانے والا ہے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی ''اہل ولایت'' اور ''حزب اللہ'' کا ذکر فرمایا ہے۔

اور یہ یاد دہانی کرائی ہے کہ ایسے لوگوں کو کہیں نہیں پاؤ گے جو خدا اور قیامت کے دن پر

ایمان رکھتے ہوئے اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر وہ دشمن لوگ ان کے باپ، اولاد، بھائی یا نزدیکی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔

جی ہاں! جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے وہ اس کے دشمنوں کے ساتھ ہرگز دوستانہ مراسم برقرار نہیں کرے گا۔ کسی بھی وقت ''خدا پر ایمان''، ''دشمنانِ خدا کے ساتھ دوستی'' کے ساتھ اکٹھا نہیں ہوسکتا۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ: ''ان کے اعمال کی جزا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ان کے دل میں ثابت کردیا ہے ''كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ'' ساتھ ہی ان کی دوسری جزا یہ ہے کہ اللہ نے الٰہی روح کے ذریعے ان کی تائید فرمائی ہے ''وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ''، ''روحِ الٰہی'' کیا ہے؟ درگاہِ الٰہی کے مقرب اور بزرگ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے۔

ان کی یہ دونوں جزائیں دنیا میں ہیں جبکہ ان کی آخرت کی جزا انہیں بہشت میں داخل کرنا ہے ''وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا'' اور ایک اور اخروی جزا جو سب سے بالاتر ہے'' رضوان اللہ خدا کی خوشنودی ہے ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ'' اور قرآن پاک کی رو سے خدا کے بندوں کے لئے عظیم ترین جزا ''رضوان اللہ'' ہے جب کہ خود ارشاد فرماتا ہے: ''وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'' اور خدا کی خوشنودی سب سے بڑھ کر ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ (توبہ/۷۲)

رہی یہ بات کہ خدا کی خوشنودی کیا ہے؟ اس کا اثر کیونکر ظاہر ہوتا ہے؟ اور یہ نعمت دوسری تمام نعمتوں سے بالاتر کیوں ہے؟ یہ سب ایسے سوالات ہیں جو ہماری موجودہ بحث سے خارج ہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت بڑی جزا جو اپنے بندوں کے لئے قرار دی ہے اور اپنے اولیاء کے لئے مقرر فرمائی ہے وہ اس کی ''رضا'' ہے اور اہلِ ولا اپنی جزا کے مستحق قرار پائے ہیں۔ اور یہ ''رضا'' صرافین کے درمیان میں ہے۔ یعنی خداوندِ عالم اور ولایت والوں

کے درمیان ہے۔ یعنی خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں

"رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ" اور آخر میں فرماتا ہے کہ یہ لوگ حزب اللہ ہیں اور انہی کے لئے کامیابی و کامرانی ہے۔ "اُوۡلٰئِکَ حِزۡبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزۡبَ اللّٰہِ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ" ان دونوں آیات مائدہ/۵۶ اور مجادلہ/۲۲ کے مطالعہ اور تطبیق سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اہل بیت اطہار علیہم السلام "حزب اللہ" کا بہترین تام و کامل مصداق ہیں، کامیابی و کامرانی کے اعلیٰ ترین مراتب انہی کے لئے ہیں علاوہ ازیں وہ دنیا میں خدا کے مؤید بندے ہیں "اَیَّدَھُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ" اگر ہم اس بات کا دعوی کریں کہ خداوند عالم کی اس قسم کی تائید۔ تائیدِ "بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ" ان کے لئے دنیا میں بزرگ الٰہی نعمت ہے تو غلط نہیں ہوگا اس دنیا میں بے شمار نعمتیں موجود ہیں اور ان سے تمام انسان خواہ مومن ہوں یا کافر، بہرہ مند ہو رہے ہیں۔ اور برابر کے شریک ہیں مثلاً زندگی، عقل، صحت وسلامتی، خوراک و پوشاک اور رہائش و مسکن لیکن ان نعمتوں میں کچھ ایسی نعمتیں بھی ہیں جو صرف ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں جو اپنی عقلوں سے صحیح معنوں میں استفادہ کرتے ہیں اور خداوند عالم ان کے اس صحیح استفادے کی وجہ سے ان کی عقلی نصوانیت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ابتدائی مرحلے میں ہدایت کی نعمت ہر کسی کو عطا ہوتی ہے۔ لیکن اس سے استفادہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو صاحبان تقویٰ ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر غیبی تائید اور امداد کا استحقاق پیدا کر لیتے ہیں اور غیبی تائید الٰہی کا اعلیٰ اور بالاترین مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم ایک بہت عظیم اور عالی قدر فرشتے کے ذریعہ کسی کی تائید فرمادے۔

یہ فرشتہ انسان کو شیطان اور گمراہی کے دوسرے بہت سے عوامل سے بچائے رکھتا ہے۔ اور ان سے کبھی مغلوب نہیں ہونے دیتا۔ بہرحال یہ گروہ جو تائیدات خداوندی کے مختلف مراتب کی شائستگی پیدا کر لیتا ہے تو "حزب اللہ" کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔

''حزب اللہ'' کے مقابلے میں ایک اور گروہ ہے جسے قرآن مجید نے ''حزب الشیطان'' کا نام دیا ہے۔حزب الشیطان کی تعبیر قرآن مجید میں فقط معدہ مجادلہ کی ۱۹ ویں آیت میں بیان ہوئی ہے۔اور قرآن مجید اسی سورہ میں قبل اس کے کہ ''حزب اللہ'' (آیت ۲۲) کے اوصاف بتائے چند آیات (۱۴ تا ۱۹) کے ضمن میں ''حزب الشیطان'' کی خصوصیات کو بیان فرمایا ہے۔حزب اللہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو ''ولایت'' کے ساتھ قبول کیا ہے اور اسے اپنا ''ولی'' مانا ہے۔اور الٰہی ولایت کے قبول کرنے کے بعد جب ان سے خدا کے رسولؐ کا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے پیغمبرؐ کی ولایت کو بھی دل و جان سے خرید لیا۔اسی طرح انہوں نے رسول خداؐ کی ولایت کے بعد آنحضرتؐ کے برحق جانشینوں یعنی ائمہ اطہار علیہم السلام کی ولایت کو بھی دل اور آنکھوں پہ رکھا تو ایسی صورت میں انہوں نے اپنا الٰہی فریضہ باحسن وجوہ انجام دیا اور خدا نے بھی انہیں اپنی اعلیٰ ترین جزا اور پاداش سے نوازا۔

ان کے مقابلے میں ''حزب الشیطان'' ہے جو، پیغمبر خدا اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی ولایت سے بے بہرہ ہیں اور خود کو شیطان کی ولایت میں دے دیا اور اس کے تابع فرمان بنا لیا ہے۔

قبول ولایت کے دو اہم عامل

یہ بات پیش نظر ہے کہ ولایت الٰہی، ولایت پیغمبرؐ اور امیر المومنین علیہ السلام اور دیگر ائمہ اطہارؑ کی ولایت کے مختلف مراتب ہیں اور جو بھی لوگ اس ولایت کے حامل ہوتے ہیں وہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔اس ولایت کے بالاترین مراتب تک پہنچنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ 1۔معرفت اور پہچان 2۔قوی ارادے کا ہونا اور تسلسل کے عمل کرنا۔

تاریخ گواہ ہے کہ اب تک بہت ساری دنیائے حضرت رسولؐ خدا کی معرفت حاصل کی، آپ پر ایمان لائے۔ اسلام کو تقویت بخشنے کے لئے جو کچھ ان کے پاس تھا اسے خرچ کر دیا اور اس بارے کئی قسم کی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ لیکن ان کی بہت بڑی مشکل تھی کہ انہوں نے ''پیغمبرؐ کے جانشین کی معرفت'' حاصل نہیں کی۔ البتہ اس بارے میں وہ بے مقصد بھی تھے۔ اس لئے کہ ان میں سے بہتیروں کو اس کی توفیق ہی نصیب نہیں ہوئی اگر ان کے لئے ولایت اہل بیتؑ ثابت ہو جاتی تو وہ اس کو قبول کرنے سے انکار بھی نہ کرتے۔ ایسے لوگ ولایت اہل بیتؑ کی معرفت کے لحاظ سے استصناف یا کمی کا شکار ہو گئے۔

ایک اور گروہ جو پہلے عامل کی شناخت و معرفت میں کسی مشکل کا شکار نہیں ہوئے۔ لیکن ان کی مشکل دوسرا عامل تھا۔ انہوں نے معرفت تو سب کی حاصل کر لی بلکہ عمل کے میدان میں تقصیر اور کوتاہی کا مظاہرہ کیا اور اپنا عملی فریضہ انجام نہیں دے پاتے جبکہ تیسرا گروہ وہ ہے جنہوں نے معرفت کے تمام مراحل کو طے کر لیا خواہ وہ معرفت اللہ کی ہو یا رسولؐ اور ائمہ طاہرین علیہ السلام کی۔ ہر ایک کی معرفت ان کے نصیب ہوئی اور عمل کے میدان میں بھی ان کے فرامین کو دل و جان سے خرید لیا۔ اور اس امتحان میں بھی سرخرو اور سرفراز ہوتے۔ ''حزب اللہ'' کا قرار پائے اور مطلق فلاح و کامرانی کو حاصل کر لیا۔ انہی کے بارے میں ہے کہ: ''وَلَااِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ''(مجادلہ/۲۲) یہی معلوم ہوا کہ ''حزب اللہ'' اور ''اہل ولایت'' کے زمرے میں شامل ہونے کے لئے خداوند عالم کی طرف سے دو (۲) توفیقات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک معرفت کے حصول کے لئے خدا کی توفیق دوسرے حاصل شدہ معرفت کے پیش نظر عمل کی توفیق، خداوند عالم کے دشوار امتحانات میں سے ایک امتحان ''میدان عمل'' میں ہے اور یہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب دنیوی زندگی میں کسی شخص کے مفادات اور لذتیں اس کے عقائد کے ساتھ ہم آہنگ

نہ ہوں۔ یا با الفاظ دیگر اگر وہ چاہتا ہے کہ اپنے عقائد کے مطابق عمل کرے تو اسے مجبوراً اپنی لذتوں اور خوشیوں سے دستکش ہونا پڑتا ہے تو یہی اس کا مقام امتحان ہے کہ آیا وہ اپنی لذتوں ذاتی مفادات اور خوشیوں سے دستبرداری کرتا ہے یا جس پر وہ ایمان لا چکا ہے اور پختہ عقیدہ رکھتا ہے اسے اختیار کرنے سے گھبراتا ہے؟

سوال؟

اگر اس قسم کا امتحان ہمارے پیش آ جائے تو کیا ہم نے اولیاء اللہ (یعنی نبی اور ائمہ اطہار علیہم السلام) کے ساتھ جو پیمان اور بیعت کی ہوئی ہے اس پر قائم رہیں گے یا اپنے ذاتی مفادات اور خواہشات کو مقدم کریں گے؟۔

''ولایت'' کا مفہوم کیا ہے؟ ایک لمحہ فکریہ

یہاں ایک ایسے مطلب کے بارے میں ہمیں قدرے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اصولی طور پر اللہ، رسول اللہ اور اولیاء اللہ یعنی ائمہ معصومین علیہم السلام کی ولایت سے مراد کیا ہے؟۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے بطور مقدمہ اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بالعموم کی زبان کے تمام کلمات کا کسی دوسری زبان میں بعینہ ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔ جو لوگ زبان شناسی سے آشنا ہیں اور مختلف زبانیں جانتے ہیں یا ترجمہ کرنے کے ماہرین وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، مثال کے طور پر بعض اوقات ایک زبان کے کلمہ کا ترجمہ کرتے وقت دوسری زبان میں دقیق طور پر اس کا اس طرح ترجمہ کیا جائے قطعاً ناممکن ہے۔ اس کے لئے کئی دوسرے کلمات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے کلمات میں سے عربی کا ایک کلمہ ہے

جسے کسی دوسری زبان فارسی یا اردو وغیرہ میں تبدیل کرتے وقت سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہے لفظ ''ولایت'' کہ بعض اوقات اس کا ترجمہ ''دوستی'' کہا جاتا ہے چنانچہ اگر یہی معنی اس جگہ مراد لیا جائے تو ''اہل ولایت وہ لوگ ہوں گے جو اہل بیتؑ کو دوست رکھتے ہیں، جبکہ کبھی اس کا معنی ''اطاعت'' بھی کیا جاتا ہے۔ اگر اس جگہ یہی معنی مراد لیا جائے تو اس کا معنی ہوگا کہ اہل ولایت وہ لوگ ہیں جو اہل بیتؑ کی اطاعت کرتے ہیں، اور کبھی اس کا معنی ''نصرت'' اور بعض اوقات ''سرپرستی'' وغیرہ کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر اس کلمہ کو استعمال کیا ہے مثلاً فرماتا ہے ''تمہارا اولی صرف اللہ، اس کا رسولؐ اور وہ صاحبان ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔ (مائدہ/۵۵-۵۶) یہاں پر ''ولی'' کا مصداق حضرت علیؑ اور ان کے بعد دوسرے ائمہ اطہار علیہم السلام ہیں۔ اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''حضرت امیرؑ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی ولایت کس معنی میں ہے؟'' اگر اس طرح کی آیات میں ''ولایت'' کو ''دوست رکھنے'' کے معنی میں لیا جائے تو اسلامی امہ اور عالم اسلام میں بہت کم افراد ہی ہوں گے جو اس ولایت سے محروم ہوں، حتیٰ کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کے دور میں اس قسم کے لوگوں اور گروہوں کا نام ونشان تک موجود نہیں اور ان کی نسل تک منقرض ہو چکی ہے جبکہ گزشتہ دور میں یا اب بھی ناصبی اور خارجی ٹولے تھے جو اہل بیتؑ کے ساتھ مخالفت کا اظہار کیا کرتے تھے اور ان سے دشمنی کرتے تھے اور آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں تو اس طرح کے لوگوں کے خدا اور رسولؐ پر اصل ایمان کے بارے شک کیا جائے گا۔ کیونکہ حضرت رسول خداؐ نے اہل بیت طاہرین علیہم السلام کے بارے میں جو تاکید، تلقین وصیت اور سفارش کی ہے جو لوگ پیغمبر کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں فطری طور پر انہیں اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ محبت اور دوستی کا اظہا کرنا چاہیئے۔

بہر صفت آج کل کے دور میں بڑی مشکل سے ہی کوئی ایسا مسلمان ملے گا جو اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ ولایت بمعنی دوستی نہ رکھتا ہوگا۔ میرا بہت سے اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے رابطہ ہے، میں نے انہیں نزدیک سے دیکھا ہے کہ وہ اہل بیتؑ کے ساتھ بڑی محبت کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے سنی مسلمان بھی ہیں جو اہل بیتؑ کے ساتھ محبت اور اظہار دوستی کے لحاظ سے ہم شعیوں سے بھی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ مجھے آستانہ حضرت معصومہ (قم) علیہ السلام کے متولی کے ہمراہ ملائیشیا کا دورہ کرنے کا اتفاق ہوا تو وہاں پر ایک دن ناشتے کا بندوبست مصر کے اہل سنت عالم دین کے ہاں تھا، ہماری اس نشست میں مصر کے ایک اور مہمان بھی تشریف فرما تھے۔ وہاں پر مصری مہمان نے اہلبیت اطہارؑ کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ قصیدہ اس قدر شاندار تھا کہ میں اور متولی آستانہ حضرت معصومہ (س) رونے لگ گئے اب کیوں نہ ہو؟ جبکہ ایک سنی مسلمان ایک اجنبی ملک میں حضرت امیرؑ اور اہل بیتؑ کی شان میں اس قدر خوبصورت اور عالی شان اشعار پڑھے اس سے انسان پر اتنا گہرا اثر نہ ہو؟۔

اسی سفر میں اہل سنت کے ایک مصری بزرگ عالم دین سے بھی ملاقات ہوئی۔ جو سعودی عرب کی طرف سے قائم ''رابطۃ لعالم اسلامی'' میں تبلیغی اور ثقافتی کاموں میں مصروف تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ: ''آپ لوگ حضرات اہل بیت علیہم السلام سے محبت کرتے اور انہیں دوست رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ مجھ سے اہل بیتؑ کی دوستی کے بارے میں سوال کر رہے ہیں؟ ''نَحۡنُ مَفۡتُوۡنُوۡنَ بِاَهۡلِ الۡبَيۡتِ'' ہم تو اہل بیتؑ کے شیدا ہیں'، بنابریں اگر 'ولایت'' کے معنی ''دوستی'' کے ہیں تو پھر بڑی مشکل سے ہی کوئی ایسا شخص ملے جو اسلام کا دعویٰ کرتا ہو مگر اہل بیتؑ سے دوستی نہ رکھتا ہو البتہ آغاز اسلام میں کچھ منافق لوگ تھے

بظاہر تو پیغمبر اسلامؐ سے دوستی کا اظہار کیا کرتے تھے مگر حقیقت میں آپؐ کی ذات پر ایمان نہیں لائے تھے اسی وجہ سے ان کے اہل بیت علیہم السلام سے بھی تعلقات اچھے نہیں تھے۔

بہر حال ''ولایت'' کے مسئلہ میں اہل بیت علیہم السلام سے دوستی سے بڑھ کر امر مطلب ہے۔اور ولایت سے مراد فقط اہل بیت کے ساتھ اظہار محبت اور دوستی نہیں ہے۔

''غدیر'' ولایت علی علیہ السلام کا ناطق ترجمان

بہترین اور واضح ترین چیز جو ولایت امیر المومنین اور ائمہ اطہار اہل بیت علیہم السلام کی ولایت کے مقصود کو روشن کرتی ہو شاید ''حدیث غدیر'' ہی ہو۔ داستان غدیر بطور متواتر شیعہ سنی بزرگان اسلام سے نقل ہوئی ہے۔ بہت سے بزرگ علماء نے اس مسئلے کو روشن کرنے میں اپنی عمریں صرف کردی ہیں وہاں افراد میں سے ایک عرصہ حاضر کے محقق علامہ امینی رضوان اللہ علیہ ہیں، کتاب شریف ''الغدیر'' جوان مرحوم کی زندگی کا ایک نتیجہ شمار ہوتی ہے حدیث غدیر اور غدیر رقم کے ناقابل واقعہ کا ایک عظیم اور جامع انسائیکلو پیڈیا یا دائرۃ المعارف ہے۔

مرحوم علامہ امینی نے اس کتاب کو کئی جلدوں میں مرتب فرمایا ہے، افسوس کہ کہ اس کی آخری جلد ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، (البتہ اب شائع ہو چکی ہے۔ از مترجم) مرحوم نے اس قیمتی مجموعہ کو تالیف کرنے کے لئے بہت سی تکلیفیں اٹھائیں، کافی عرصے تک خون جگر پیتے رہے کہ یہاں ہر جس کے ذکر کی گنجائش نہیں۔

بہر صورت مسئلہ غدیر نہایت ہی اہم اور ہر حیثیت سے لائق توجہ اور قابل غور وفکر ہے، حضرت رسالت مآبؐ اپنے آخری حج جو ''حجۃ الوداع'' کے نام سے مشہور ہے کی طرف سفر کرنے سے پہلے حکم دیا کہ اعلان کردیا جائے کہ اسلامی سرزمین کے تمام نقاط سے تمام مسلمان اور ہر وہ شخص جو

سفر کرنے کے قابل ہے مناسک حج کی ادائیگی کے لئے مکہ روانہ ہوں۔ اسی وجہ سے اس دور میں مسلمانوں کا عظیم ترین اجتماع تھا۔ تمام حجاج نے آنحضورؐ کی معیت میں اعمال حج بجالائے۔

جب اعمال حج مکمل ہوئے اور مسلمان اپنے اپنے شہرودیار کی طرف مکہ معظّمہ سے باہر نکلے جس وقت اس جگہ پہنچے جہاں سے قافلوں کے رستے جدا ہوئے تھے تو حضور پاکؐ نے حکم دیا کہ سب لوگ رک جائیں اور سامان سفر اتار دیں۔ اسلامی روایات کے مطابق حضور علیہ السلام کے اس اقدام کی دلیل یہ تھی حضرت جبرائیل علیہ السلام اپنے پروردگار کا اہم پیغام لے کر نازل ہوئے کہ اس پیغام کو رسول خدا صلے اللہ علیہ والہ وسلم اسی جگہ پر لوگوں تک پہنچائیں، چنانچہ ظہر کا وقت قریب تھا آفتاب بڑی شدت کے ساتھ غازت بکھیر رہا تھا۔ حضور اکرمؐ نے حکم دیا جو لوگ آگے جاچکے ہیں واپس آجائیں اور جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ آن ملیں کیونکہ ایک اہم پیغام پہنچانا ضروری ہوگیا ہے۔ لہذا تمام مسلمانوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔

آیا اس قسم کا اہتمام اور یہ سارے انتظامات صرف اس لئے تھے کہ حضور سرور کائنات لوگوں سے فرمائیں کہ "علیؑ کو دوست رکھو" کیا اس سے پہلے اہل بیت علیہم السلام کی محبت کے بارے میں متعدد آیات نازل نہیں ہوچکی تھیں؟ آیا خود سرکار ختمی مرتبتؐ نے اپنی ساری زندگی میں امیرالمومنین اور اہل بیت علیہم السلام کی صووت اور محبت کے بارے میں تاکید نہیں فرمائی تھی؟ آخر وہ کونسی بنیادی ضرورت تھی کہ حضور رسالت مآبؐ نے اپنی زندگی کے آخری سال میں اس قدر شدید گرمی میں اور مسلمانوں کے عظیم ترین اجتماع میں لوگوں کو محبت کا پیغام دیا جائے؟ تسنن اور تشیع کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس دن یہ آیت نازل ہوئی: "یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکَافِرِیْنَ" "اے رسول! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا

گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو رسالت کا کوئی کام ہی انجام نہیں دیا۔ خدا تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ یقیناً خداوند عالم کافروں کی قوم کو ہدایت نہیں کرتا (؟) اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ سے فرماتا ہے کہ اگر آپؐ نے یہ پیغام لوگوں تک نہ پہنچایا تو اپنی اصل رسالت کا کوئی کام انجام نہ دیا "اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ" اس پیغام کے پہنچانے میں لوگوں سے نہ ڈریں، خدا خود ہی آپ کی حفاظت فرمائے گا "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" آیا صرف یہ کہہ دینا کہ علیؑ کو دوست رکھو' اس قدر خطرناک تھا کہ اس کا اقدام کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت کو حفاظت کی ضمانت دی جا رہی ہے۔

اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ غدیر محبت اور مودت سے بالاتر ہے، اس لئے کہ سرکار رسالتؐ نے اس دن مسئلہ "ولایت" کو لوگوں کے پیش کیا اور فرمایا: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ" "جس کا میں مولا ہوں اسی کا یہ علیؑ مولا ہے۔ البتہ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ولایت کا کیا معنی ہے؟

"ولایت" کا لغوی معنی

"ولایت" کا لفظ "ول ی" کے مادہ سے لیا گیا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب دو چیزیں پہلو بہ پہلو یا آگے اور پیچھے اس طرح ساتھ ساتھ ہیں کہ ان کے درمیان کوئی مانع موجود نہ ہو مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ "هٰذَا الْعَدَدَ دَيْلِيْ عَدَدًا" آخر یہ بھی یہ عدد دوسرے عدد کے پیچھے ہے۔ جیسے تین کا عدد جو دو کے بعد ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے دو ارتباط "پیوند" اور "اتصال" کے الفاظ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان میں سے کوئی لفظ صحیح معنوں میں اس کی برابری نہیں کر سکتا۔

جب یہ لفظ دو ذی شعور موجودوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جب ا
دونوں کے درمیان ایک ایسا قوی رابطہ ہو جو ان کے تمام وجودی امور کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا
دوران نوں کے درمیان رابطے میں اور دو چیزوں کے درمیان رابطے میں فرق ہے بالفاظ دیگر
ل ی'' کے مادہ کے معنی میں عمومی معنی پایا جاتا ہے اور جب انسان کے بارے میں بحیثیت ایک
ذی شعور موجود کے استعمال ہو تو فریقین کے انسانی رشتوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اور ان دونو
انسانوں کے درمیان کوئی مانع موجود نہیں ہوتا۔ انسانی امور تین طرح کے ہوتے ہیں 1۔ معرفت
2۔ محبت 3۔ معرفت اور محبت کا حاصل جمع یا نتیجہ۔ چنانچہ جب ''و ل ی'' کا مادہ دو انسانوں کے
بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا معنی یہ ہو جاتا ہے کہ وہ دونوں اس حد تک ایک دوسرے کے
نزدیک ہو چکے ہیں کہ مذکورہ تینوں امور میں یک جان دو قالب ہو چکے ہیں۔ یعنی ان دونوں
معرفت ایک جیسی ہے، محبت اور جذبات ایک جیسے ہیں اور معرفت و محبت کا مجموعی نتیجہ ایک جیسا
کہ حتیٰ کہ ان کا کردار و رفتار ایک جیسی ہیں یہ ہے ولایت کا حقیقی مفہوم۔

بنابریں ولایت کا رابطہ یک طرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہے اور دونوں ایک دوسرے کی نسبت
تاثیر اور تاثر کا تعلق رکھتے ہیں، ظاہری سی بات ہے جب دو دوستوں کی سوچ ایک ہو، محبت کے
جذبات مشترک ہوں اور رفتار و ردعمل اور کردار ایک دوسرے کے لئے موثر ہوں ان کا کردار ا
میں اور اس کا اس میں تاثیر پیدا کر دیتا ہو تو اس وقت اس بات کی سمجھ آئے گی کہ ''وَالْمُؤْمِنُو
وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ''مومن خواہ مرد ہوں یا عورتیں ایک دوسرے کے ا
ہیں۔ (توبہ/۷۱)

یعنی یہ مومن اس کا اور وہ مومن اس کا ولی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے میں تاثیر ر
ہیں۔ البتہ ذی شعور موجود کا تعلق صرف انسان کی ذات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ممکن ہے

بعض اوقات یہ رابطہ ''انسان'' اور ''اللہ'' کے درمیان بھی وجود میں آسکتا ہے۔

''خدا'' اور ''انسان'' کے درمیان ولایتی رابطے کی وضاحت

جن علاقوں میں ''ولایت'' کا رابطہ ''اللہ'' اور ''انسان'' کے درمیان پیدا ہو جاتا ہے تو کیا اس کا معنی بھی وہی ہوتا ہے کہ خدا ہمارے اندر اور ہم خدا کے اندر اثر پیدا کرتے ہیں؟ جواب بالکل واضح ہے کہ اس صورت میں ''تعامل اور تفاعل'' کی بات درمیان میں نہیں ہے، بلکہ معاملہ سو فیصد یکطرفہ ہے۔ اور وہ یہ کہ اثر اور تاثیر خدا کی ذات کی طرف سے ہوتی ہے۔ خدا اور بندے کے درمیانِ ولایت کے رابطے کا یہ معنی ہے کہ انسان کی معرفت، خدائی معرفت ہوتی ہے۔ اس کی محبت خدائی محبت ہوتی ہے۔ اس کا کسی کے ساتھ سلوک خدائی سلوک ہوتا ہے اور اس قسم کا انسان، خدا کو سب سے زیادہ دوست رکھتا ہے ''وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰه'' ایماندار لوگ خدا سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ (بقرہ/۱۶۵)

بنابریں خدا اور انسان کے ''ولایتی رابطے'' میں خدا انسان سے اثر حاصل نہیں کرتا بلکہ اصولی طور پر خداوند عالم کسی بھی چیز کی تاثیر سے متاثر نہیں ہوتا۔ البتہ یہاں پر بھی ولایت کا رابطہ دوطرفہ ہے ''اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ اٰمَنُوا'' (بقرہ/۲۵۷) بھی کہا جاتا ہے اور ''اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ'' بھی کہا جاتا ہے یعنی اللہ مومنوں کا ولی ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ علیؑ اللہ کے ولی ہیں یا کہا جاتا ہے: ''اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ'' آگاہ ہو کر خدا کے اولیاء پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوتے ہیں۔ (یونس/۶۲)

باوجود یہ کہ یہاں پر بھی ولایت کا رابطہ دوطرفہ ہے لیکن تاثیر فقط ایک طرف سے ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر رابطہ اتصال و پیوند تو دوطرفہ ہے کہ انسان خدا کے ساتھ اور خدا انسان کے ساتھ

رابطے میں ہیں لیکن تاثیر و تاثر یکطرفہ ہے۔

دو انسانی افراد یا خدا اور انسان کے درمیان رابطے کے علاوہ ولایت کا رابطہ بعض اوقات ''فرد'' اور ''معاشرہ'' کے درمیان بھی ہوتا ہے، جب کہ خداوند عالم فرما تا ہے: ''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِم '' پیغمبر خدا، خود مومنین کے اپنے لفظوں کی نسبت ان سے زیادہ حق رکھتا (اور نزدیک تر) ہے۔ (احزاب/۶)

یہاں پر رابطہ کا ایک فریق ذات سرکار رسالتؐ ہے اور دوسرا فریق ''اسلامی ائمہ'' ہے، کبھی کبھی اس ولایت کو ''ولایت النبیؐ'' علی الامتہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

بطور کلی جب ''ولایت امر'' کہا جاتا ہے تو اس سے مراد ایک انسانی مجموعہ کا ''ولی امر'' سے رابطہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ''ولی امر مسلمین'' وہ ہوتا ہے جو عائمہ المسلمین کے ساتھ نزدیکی اور مضبوط رابطہ رکھتا ہو، اور مسلم امہ اپنے معاشرتی اور سیاسی امور میں بغیر کسی فاصلے کے اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے اور اسی سے اثر قبول کرتی ہے۔

''پیغمبرؐ'' اور ''اہل بیتؑ'' کی ولایت اور ''خداوند عالم'' کی ولایت

اگر غور سے دیکھا جائے تو اصل میں اور درحقیقت ولایت صرف اور صرف خدا ہی کے لئے ہے ''اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا '' اللہ مومنوں کا ولی ہے (بقرہ/۲۵۷) لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی دوسرے افراد کو ''ولایت'' کے لئے مقرر کر دے۔ جیسا کہ اس نے یہ کام اپنے پیغمبر اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے لئے کیا ہے ''اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَهُمْ رَاکِعُوْنَ '' (مائدہ/۵۵) تمہارا ولی اللہ ہے، اس کا رسولؐ ہے اور صاحبان ایمان نمازی ہیں جو حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی ولایت انسانوں پر ذاتی اور اصل ہے کہ بعد اس کا اعلیٰ درجہ اپنے پیغمبرؐ کو عطا کیا ہے کیونکہ پیغمبرؐ وہ اعلیٰ ترین انسانی شخصیت کے مالک ہیں کہ تمام مومنین کو آپؐ کی ذات کے ساتھ ولایت کا رابطہ برقرار کرنا ضروری ہے مومنین چونکہ رسولؐ خدا کو اپنا ''ولی'' سمجھتے ہیں اسی لئے اپنی شناخت اور معرفت کو بھی انہی کے تابع قرار دیتے ہیں اور اپنا دین بھی انہی سے حاصل کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ''كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنْكُمْ وَيَتْلُوْا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ وَالْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ وَمَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ''جس طرح کہ ہم نے اپنا ایک رسول تم میں سے تمہارے درمیان بھیجا ہے کہ وہ ہماری آیات کو تمہارے آگے پڑھتا ہے اور تمہیں یاد کراتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تم جو نہیں جانتے، وہ تمہیں پڑھاتا ہے۔

اللہ سے تبعیت اور پیچھے چلنا محبت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور مومنین کا پیغمبرؐ کی ذات سے محبت کا بالاترین رابطہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْم'' کہہ دیجئے اے پیغمبرؐ! اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ خدا تمہیں دوست رکھے اور تمہارے گناہ بخش دے اور خدا کو بخشنے والا مہربان ہے۔ (آل عمران/۳۱)

اگر تم خدا کی دوستی میں سچے ہو تو تمہارا فرض بنتا ہے کہ میرے (رسول خدا کی) پیروی کرو کیونکہ میں اللہ کا نمائندہ ہوں اور خداوند عالم کا مطلوب ومقصود تمہیں بتاتا ہوں اگر کوئی شخص کسی کو دوست رکھتا ہے تو وہ اس تلاش میں ہوتا ہے کہ اس کا محبوب اس سے کیا چاہتا ہے؟ تاکہ وہ انجام دے اسی لئے یہ آیت بھی فرما رہی ہے: کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو تمہیں چاہئے کہ یہ دیکھو خدا تم سے کیا چاہتا ہے تاکہ تم اس کی پیروی کرو خدا کا مطلوب ومقصود، اس کا نمائندہ یعنی

رسول تمہارے لئے بیان کر رہا ہے۔ اسی لئے اگر تم واقعی خدا سے سچی دوستی رکھتے ہو تو اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اس امر کی دلیل یہ ہے چونکہ تم براہ راست خدا سے رابطہ نہیں ہے اور تمہیں اس کے مطلوب کا براہ راست پتہ نہیں چل سکتا۔ اسی لئے تم نہیں جانتے کہ تمہارا محبوب (اللہ) تم سے کیا چاہتا ہے: ''وَمَا كَانَ اللّٰهُ وَلِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ'' خدا ایسا نہیں ہے کہ تمہیں غیب سے مطلع کر دے، لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے چن لیتا ہے۔ (آل عمران/۱۷۹)

تمہارے اندر وہ کمال وجودی نہیں ہے کہ براہ راست خداوند عالم سے رابطہ قائم کر سکو۔ لیکن خداوند عالم نے اپنے کچھ بھیجے ہوئے لوگوں کو منتخب کیا ہوا ہے جو اس کی لیاقت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور وہ انہی کے ذریعہ تم تک اپنے مطلوب کو پہنچاتا ہے، اب جبکہ پیغمبر خدا کے ذریعے اس کا مطلوب تم تک پہنچ چکا ہے، اگر تم خدا کی محبت کے دعویٰ میں سچے اور ثابت قدم ہو تو پیغمبر خدا کی تعلیمات کی پیروی کرو۔ تاکہ خدا بھی تمہیں دوست رکھے۔

آیا عاشق کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا چیز محبوب ہوتی ہے کہ اس کا معشوق اس سے دوستی کا دم بھرے؟ آیا اس کے لئے اس سے زیادہ پسندیدہ بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے علم ہو جائے کہ اس کا معشوق اس سے راضی اور خوش ہے۔

عاشق کے لئے معشوق کی مسکراہٹ اور اس کی رضا کا حصول سب سے زیادہ شیریں ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ خود اللہ ہو تو اس کی رضامندی کی کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی۔ جب کہ وہ خود فرما رہا ہے: ''رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'' خداوند عالم رضا اور خوشنودی سب سے بڑی ہے یہی تو عظیم کامیابی ہے۔ (توبہ/۷۲)

بہر حال ولایت الٰہی کو قبول کرنے سے یہ بات لازم آجاتی ہے کہ اپنی معرفت خدا۔

حاصل کرو۔ اس کی محبت دل میں رکھے رہو۔ جب تمہاری محبت اور معرفت کا خدا سے اس طرح رابطہ برقرار ہو جائے گا تو فطری طور پر تمہارا کردار بھی اسی کے ارادہ کے تابع ہو جائے گا۔ اور اسی کا نام ہے ''ولایۃ اللہ'' اس کے بعد ولایت پیغمبر کا مرتبہ ہے اور پیغمبر خدا کے بعد یہ ولایت حضرت امیر علیہ السلام میں جلوہ گر ہے۔ اور آپؑ کی ولایت کا سورہ مائدہ کی ۵۵ ویں: ''اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہ'' سے تعارف کرایا گیا ہے۔

کیونکہ شیعہ سنی صورتیں و مفسرین کے بقول یہ آیت حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان کے بعد دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام خاص دلائل کی رو سے اسی ولایت میں شامل ہیں۔

ماننا پڑے گا کہ جو شخص واقعاً ایمان رکھتا ہے اور ''ولایت اللہ'' کے تابع ہے اسے چاہئے کہ ''ولایت رسول'' کے بہرہ مند ہو اور اپنے تمام وجود کے ساتھ پیغمبر اسلام کو دوست رکھے اور آنحضرتؐ کے ہر ایک فرمان پر دل و جان سے عمل کرے۔

آیا ''ولایت'' صرف ''رسول خداؐ'' کی ذات میں ہی منحصر ہے

مسلمان اور جو لوگ ''ولایت رسول اللہ'' سے بہرہ مند ہیں ان کا اس بات میں تو اختلاف نہیں ہے کہ ''دینی معارف و معلومات حضرت رسالت مآبؐ سے حاصل کی جائیں'' اختلاف اس بات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کن ہستیوں کی بات ''حجت'' ہوگی؟ اور ہم اپنی معرفت کے حصول کے لئے کس کی طرف رجوع کریں؟ مسلمانوں کی اکثریت اس بات کی معتقد ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد جو شخص ہمیں براہ راست صحیح اور یقینی شناخت و معرفت عطا کرے۔ موجود نہیں ہے، اسی لئے کسی کی بات بھی ہمارے لئے ''حجت'' نہیں ہو سکتی۔ اور

قرآن مجید جو کہ کلام الٰہی ہے ہمارے پاس کے سوا اور کوئی حجت نہیں ہے۔

جبکہ ان کے برعکس ایک گروہ وہ ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ بے حد وحساب دلائل اس بات کے لئے موجود ہیں بعد از ان حضرت جیل اکرم مسلمانوں کی شرعی تکلیف کو واضح کر رہی ہیں۔مثلاً قرآن مجید کی یہ آیت: ''اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ .... وَهُمْ رَاكِعُوْنَ'' (مائدہ/۵۵) یا خود سرکار ختمی پر بہت کا فرمان ذیشان ''اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ ''میں تم لوگوں میں دوگراں قدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت اہل بیت۔(بحار جلد ۲۳ آیات ۱۴۱)

اس حدیث پاک میں رسول گرامی کی عترت کو قرآن یعنی کتاب خدا کے ہم پلہ اور ہم وزن قرار دیا گیا ہے جب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بات کا وزن بھی وہی ہے جو قرآن پاک کی آیات کا ہے۔یہی تو وجہ ہے کہ ہم شعیان اہل بیت رسولؐ سے خود رسول پاکؐ کی مانند محبت کرتے ہیں اور انہیں عشق کی حد تک چاہتے ہیں۔اس لئے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام بھی خود رسول پاکؐ کی مانند خداوند ذوالجلال کے نزدیک قریب ومنزلت کے حامل ہیں ولایت الٰوی پہلے مرحلے میں رسول خدا کی ذات میں جلوہ گر ہوتی ہے اور آپؐ کے بعد اس ہستی میں نمودار ہوتی ہے جسے حضور سرور کائناتؐ نے اپنے سے وہی نسبت دی ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔یعنی وہی باعظمت ہستی جس کو حضورؐ نے مخاطب کر کے فرمایا: ''وَاَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلاَّ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَانَبِیَّ بَعْدِیْ ''تمہیں مجھ سے وہی منزلت حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰؑ سے حاصل تھی،مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔(ایضاً باب ۲۷ روایت ۵)

شیعہ،سنی معتبر کتب کے حوالوں سے نقل کی بنیاد پر حضرت رسولؐ خدا نے حضرت علی علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمایا ہے کہ اسی حدیث کی بنیاد پر جس طرح حضرت ہارون جناب موسیٰ

علیہ السلام کے جانشین تھے ان کا فرق صرف ''نبوت'' اور ''امامت'' کا ہے یعنی حضرت علی علیہ السلام نبی نہیں تھے، امام تھے اسی لئے آنحضرتؐ کے اہل بیت اطہارؑ آپؐ ہی کے ہم پلہ قرار پائے۔

اس طرح سے اگر کوئی شخص ''خدا کی ولایت'' کو قبول کرنے میں صادق ہو تو اس کا لازمی امر یہی ہوگا کہ رسول اکرمؐ کی پیروی کرے اور آنحضرتؐ کی ولایت کو تسلیم کرتے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص رسول خداؐ کی ولایت کو تسلیم کرنے میں سچا ہے تو اس کا لازمی امر یہ ہوگا کہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی پیروی کرتے ہوئے اور ان کی پیروی اور اتباع کرے کیونکہ یہی قدسیہ، آنحضرتؐ کی برحق جانشین ہیں اور انہی کی اطاعت، رسول خدا کی اطاعت کی مانند ہے۔ کیونکہ فقط اسی صورت میں ہی لوگوں کا دین مکمل ہوتا ہے اور اس کے عقائد کسی قسم کے نقص اور کمی سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

جیسا کہ متعدد روایات میں یہی چیز بیان ہوئی ہے جب تک حضرت رسول خدا کی ولایت کو تسلیم نہ کیا جائے دین مکمل نہیں ہوتا، اور جب تک حضورؐ کے برحق جانسین حضرت ائمہ اطہار علیہم السلام کی ولایت کو تسلیم نہ کیا جائے، حضرت رسالت آبؐ کی ولایت کی قبولیت کا دعویٰ سچا ثابت نہیں ہو سکتا۔

حضرات ائمہ اطہار علیہم السلام کی ''معرفت اور پہچان'' حاصل کر لینے کے بعد عمل کی نوبت آتی ہے۔ لہذا لازمی اور ضروری ہے کہ مقام عمل میں بھی ان پاک معصومین کو اپنے لئے نمونہ قرار دیا جائے۔ اور ان کی اطاعت و پیروی کی جائے۔ مسلم امہ کا فرمانروا موجود ہے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کے فرمان کی اطاعت کریں اور اس کے نقش قدم پر چلیں۔ یعنی وہی چیز جس کے بارے میں سرور کائنات نے غدیر خم کے موقع پر سفارش کی تھی۔ کہ ''مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ

فَھٰذا عَلِیٌّ مَوْلاہ ''اور یہ وہی چیز ہے جس کی بنیاد پر دین کامل ہوا اور اللہ نے یہ سند عطا فرمائی ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ .... الاِسْلامَ دِیْنًا '' (مائدہ/۳) اس مسئلے کی اہمیت اس قدر تھی کہ حضرت رسول خداؐ کو اس دن تمام بندوبست کرنا پڑا حضورؐ نے کم از کم ستر ہزار اور حجاج کے مجمع کو غدیر کے میدان میں اور گرم صحرا میں چلچلاتی دھوپ میں ٹھہر کر ان تک پیغام ولایت پہنچایا۔

ورنہ آیت تو کہہ چکی تھی کہ اگر ولایت علیؑ لوگوں تک نہ پہنچائی تو رسالت ناتمام اور دین ناقص رہے گا۔

واضح سی بات ہے کہ علی علیہ السلام کو دوست رکھنے کا پیغام اس قدر اہم نہیں تھا کہ اس کے لئے اس قدر بندوبست اور انتظام و انصرام کیا جائے۔ اور اس کی بنیاد پر دین مکمل ہو جائے۔ یہ دوستی ہی ایسی ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے ان جنابؑ کی عملی پیروی کی جائے اور ان کے فرمان کو واجب الاطاعت جان کر اُس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اور یہ ایک ایسی دوستی ہے جو خدا اور رسولؐ کے دشمنوں کے ساتھ کے سازگار نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

''لَاتَجِدُھَا قَوْمًا ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' تم ایسی قوم نہیں پاؤ گے جو خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور (ساتھ ہی) ان لوگوں کو دوست رکھتے ہوں جنہوں نے خدا اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے، بھائی ہوں یا ان کا خوش قبیلہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو لکھ دیا ہے۔ اور اپنی جانب سے روح کے ذریعے ان کی تائید کی ہے اور انہیں ایسے بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی یہی لوگ ''حزب اللہ'' ہیں۔ جی ہاں! خدا کا حزب ہی تو فلاح پانے والا ہے۔ (مجادلہ/۲۲)

اس آیت میں خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ سے فرما رہا ہے کہ آپؐ کو ایسے لوگ نہیں ملیں گے جو خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہوئے خدا کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہوں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جو اپنے دلوں میں خدا کے دشمنوں کے ساتھ ان کی محبت ہو اور ان سے چوری چھپے اظہار محبت بھی کرتے ہوں اور اللہ اور قیامت پر بھی ان کا ایمان ہو۔ اگرچہ وہ قسمیں بھی کھائیں کہ ہم مومن ہیں لیکن فرماتا ہے کہ کہ ایسے لوگ جھوٹے ہیں ارشاد ہوتا ہے: ''اِذَا جَاءَ کَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلَهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اَنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ'' جب منافقین آپؐ کے پاس آکر کہتے ہیں کہ ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ واقعاً اللہ کے رسول ہیں۔'' اور خدا (بھی) جانتا ہے کہ آپؐ یقیناً اس کے رسولؐ ہیں اور خدا گواہی دیتا ہے کہ منافق لوگ سخت جھوٹے ہیں۔ (سورہ منافقون ۱/۱)

منافق لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ خیر، صلاح اور بہتری کے سوا وہ اور کچھ نہیں چاہتے، مگر قرآن کہتا ہے کہ ''خدا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹوں کا ٹولہ ہے، وہ اپنے ذاتی مفادات کیلئے کسی اور بات کے منتظر ہی نہیں۔ انہیں اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ دشمن ان پر غالب آجائیں گے اس وقت ان کی سخت تباہی ہوگی، اسی لئے وہ ابھی سے ہی اپنے ''وڈیروں'' کے لئے رقص کررہے ہیں، توجہ فرمایئے ''فَتَرَی الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَا اَسَرُّوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ'' ''جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے آپؐ انہیں دیکھیں گے کہ وہ ان کے ساتھ دوستی کرنے میں جلدی کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ''ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ ہی پیش نہ آجائے'' امید ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی طرف سے فتح یا کوئی اور امر سامنے لے آئے تا کہ یہ لوگ جو کچھ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں اس پر

پشیمان ہوں۔(مائدہ/۵۲)

منافقین کہتے ہیں کہ شاید کوئی حادثہ پیش آجائے اور کوئی مصیبت ہمیں آپہنچے تو اس وقت ہم بے یارومددگار رہ جائیں گے۔مگر خداوند عالم فرماتا ہے اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ ان کے برعکس کردے گا۔ دشمن کی دھمکیاں خود انہی کے اپنے ہی گلے پڑ جائیں گی۔نادیدہ خدائی عذاب ان کی بساط الٹ دے اس دن وہ لوگ سخت پشیمان ہوں گے جو دشمنوں سے رابطے برقرار رکھے ہوئے ہیں اور ان کی بولیاں بول رہے ہیں انشاءاللہ وہ دن دور نہیں جب امریکہ رسوا اور ذلیل وخوار ہوگا۔

جب دنیا کی نام نہاد سپر طاقتیں چکنا چور ہوں گی۔جب وہ لوگ خجالت ورسوائی کی وجہ سے سر نہیں اٹھا سکیں گے جو کہتے ہیں کہ امریکہ کے ساتھ نتھی رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

جب انہیں اس کے سوا کوئی راہ نظر نہیں آئے گی اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔اور امریکا سے تعلقات کی نفی کریں۔

جبکہ خدا اور قیامت پر ایمان رکھنے والے، خدا کے دشمنوں کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کبھی بھی تعلقات استوار کرنے کی نہیں سوچتے ایسے ہی لوگ تو ''حزب اللہ'' ہیں۔جو حقیقی ولایت کے حامل ہیں۔انجام کار حقیقی فتح وکامرانی انہی کے حصے میں آئے گی۔کیونکہ خدا فرماتا ہے ''وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ الْغَالِبُوْنَ'' جو شخص خدا اور اس کے رسول اور ان لوگوں کو اپنا ولی سمجھتا ہے جو ایمان لا چکے ہیں (وہ کامیاب اور کامران ہے) اس لئے کہ حزب اللہ ہی کامیاب وکامران ہے۔(سورہ مائدہ/۵۶)

امام علی علیہ السلام حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی طرح ''مقدس'' ہیں

(عظیم عیسائی دانشور اور مفکر جارج جرداق لبنانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مترجم

بیروت (لبنان) کے عیسائی دانشور "جارج جرداق" کے نام سے اکثر و بیشتر مسلمان آگاہ ہیں، ان کی وجہ شہرت جہاں ان کی تصنیفات و تالیفات ہیں وہاں امیر المومنین علی علیہ السلام کی سیرت و شخصیت پر چھ جلدوں پر مشتمل لکھی جانے والی کتاب "**الامام علی صوت العدالة الانسانية**" بھی ہے، ان سے مزید آشنائی کیلئے ذیل میں ہم بیروت سے شائع ہونے والے رسالہ "المنبر" میں درج معروف عیسائی ادیب، دانشور، مولف اور استاد "جارج جرداق" کا وہ انٹرویو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جسے تہران سے شائع ہونے والے شہرہ آفاق روزنامے "کیہان" کے شمارہ ۱۸۳۰۹ صفحہ سات پر شائع کیا گیا ہے۔

المنبر عربی میں شائع ہوتا ہے اور کیہان فارسی میں اور ہم روزنامہ کیہان سے ترجمہ کر کے ہدیہ قارئین کر رہے ہیں امید ہے قارئین کی بصیرت میں اضافہ کا موجب ہوگا، یاد رہے کہ استاد موصوف وہ شخصیت ہیں جنہوں نے "علیؑ صوت العدالہ الانسانیہ" نامی معروف شہرہ آفاق کتاب تحریر کر کے اپنا نام ابد تک کے لئے علی علیہ السلام کے دوستوں، محبوں بلکہ عاشقوں میں درج کرا دیا ہے۔ جس کا ترجمہ اردو زبان میں ہے "ندائے عدالت انسانیؑ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، چونکہ اس انٹرویو میں نہایت ہی اہم مطالب کو بیان کیا گیا ہے لہذا اس کا ترجمہ اردو دان طبقہ کے استفادہ کے لئے یہاں پر شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔

مقدمہ

آپ جہاں پر بھی ''عدالت'' کی تلاش میں نکلیں گے وہیں پر علیؑ کو موجود پائیں گے، جہاں پر آپ بھی ''انسانیت'' کو تلاش کریں گے وہیں پر علیؑ کو بے نظیر پائیں گے کیونکہ علیؑ ہر اچھائی کا بہترین نمونہ اور ہر خوبی کی اعلیٰ ترین مثال ہیں کوئی بھی شخص انسانیت، عدالت، سخاوت، آزادی فکر، جود وسخا اور شجاعت و بہادری میں آپ کی برابری نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی آپ کے علم، ادب، فصاحت، بلاغت وسعت قلبی، نرم دلی اور مہربانی کی گرد پا کو نہیں پہنچ سکتا ہے، اللہ اللہ! کہاں وہ اور کہاں ابوالحسنؑ ؟ کہاں زمین کا ''چاند'' اور کہاں ''آسمانی چاند'' دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

امام علی علیہ السلام تمام انسانی فضائل کا مجسم نمونہ ہیں، ہر فضیلت ومنقبت آپ ہی کے نام کے مساوی ہے۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ علیؑ کو انہی بلند مرتبہ معانی کے ساتھ یاد کیا جائے جو ان میں تجلی کر چکے ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے آج تک بلکہ قیامت تک عالم انسانیت میں آپ کا کوئی ثانی نہیں اگر ''شبر'' کے پاس ''چشم بینا'' ہوتی تو اسے معلوم ہوتا کہ علیؑ کے اس دنیا سے چلے جانے کی وجہ سے عالم انسانیت کو کس قدر نقصان ہوا ہے۔ اور کس قدر عظیم سانحہ سے دو چار ہو کر خسارہ اٹھا چکا ہے؟

چونکہ امام علی علیہ السلام انسانی اقدار کا جلوہ اور تمدن انسانی کی شمع ہیں لہٰذا تمام بزرگوار شخصیتیں ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے ہوئے ہیں اور جو کام وہ انجام دے سکتی ہیں تو بس

یہی کہ اپنا سر گھٹنوں میں جھکائے اس کی بزرگی اور عظمت کے آگے کمر خم کئے ہوئے ہیں۔
یہ بزرگوار ہستیوں کا تعلق کسی بھی ملک کسی بھی ملک، کسی بھی تمدن، کسی بھی کلچر اور کسی بھی نظریہ سے ہے جب فرزند ابو طالبؑ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوتی ہیں تو خود کو حقیر سمجھتی اور ان کی بارگاہ میں کورنش بجالانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں پاتیں۔ اور اس عظیم الشان ہستی کا عشق ان کے تمام وجود کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے اور کون ایسا شخص ہے جو ان کی ذات کا عاشق نہ ہو اور اس بات کا اعتراف نہ کرے کہ وہ ایک بے بدل شخصیت کے مالک ہیں۔

یہی وجہ سے کہ ہر دین و مذہب سے تعلق رکھنے والے اور مختلف اور گوناگوں فلسفی اور فکری مکاتب سے تعلق رکھنے والے دانشمندوں، ادیبوں، سیاستدانوں، روشن خیالوں، اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں اور حق و حقیقت کے طلب گاروں اور نیکی اور فضیلت کے ساتھ محبت کرنے والوں نے جب بھی اس بے مثال شخصیت کی طرف دیکھا اسے عزت و احترام اور تعجب اور حیرت کی نگاہوں سے ہی دیکھا۔

ایسی نابغہ روزگار ہستی جس نے پوری کائنات کو اپنے عظیم کارناموں سے ششدر کر رکھا ہے اور اپنی عدالت و انسانیت کا سایہ اس جہان ہستی پر ڈالا ہوا ہے ان بزرگوار لوگوں میں سے عالم مسیحت کے مشہور و معروف دانشور اور ادیب ''جارج جرداق'' لبنانی ہیں، جنہیں علیؑ کی ذات کے بارے ''دوبارہ انکشاف'' کے سبب نے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس عظیم المرتبت ہستی کے تعارف کے لئے چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب حیطہ تحریر میں لے آئیں۔ اور یہ عظیم علمی ذخیرہ ''علیؑ، ندائے عدالت انسانی'' کے عنوان سے انسانیت کو ''تحفے'' کی صورت میں پیش کریں۔
ایک ایسا علمی سرمایہ جس کی شہرت چاردرانگ عالم پھیلی ہوئی ہے اور دور حاضر میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

''المنبر'' کا کہنا ہے کہ جب اس نے اس عظیم شہرہ آفاق کتاب کے مصنف کے ساتھ ملاقات کی ٹھان لی تا کہ ان سے زیادہ سے زیادہ آشنائی حاصل ہو تو ملاقات کے دوران انہیں حق اور خیر کا عاشق صادق پایا۔ ایسا عاشق کہ عشق نے جنہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اس قدر عظیم کتاب کی تصنیف کریں ایسی تصنیف جس کا مصنف خود کہے کہ یہ میرا پسندیدہ ترین اور دلچسپ ترین کارنامہ ہے۔

جس زاویہ سے دوسرے لوگوں نے علیؑ کو دیکھا ہے۔ استاد جرداق نے انہیں اس زاویہ سے نہیں دیکھا۔ بلکہ وہ انہیں تخلیق الٰہی کا ایسا عظیم شاہکار سمجھتے ہیں جو انسانی فکر و ضمیر کا اعلیٰ نمونہ، عدالت، آزادی اور مساوات کا کامل نمونہ ہیں۔

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ علیؑ کا اصل مقصد اس دنیا میں لوگوں کو سعادت اور خوش بختی سے ہم کنار کرنا تھا جو معاشرتی تقاضوں کے عین مطابق اور وہ بھی عدالت اور ارتقاء کے زیر سایہ ہو۔ لیجئے اب اصل انٹرویو کا مطالعہ فرمائیں۔

سوال:☜ سب سے پہلے تو ہم یہ چاہیں گے کہ آپ اپنی زندگی اور اپنے کارناموں سے ہمیں آگاہ فرمائیں؟

جواب:☜ میرا نام ''جارج سجعان جرداق'' ہے، جنوبی لبنان کی سرزمین ''جدیدہ رجیعون'' کے خطہ میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ لبنان کے زیبا ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ جس میں یادگار تاریخی واقعات سے رونما ہو چکے ہیں نسبی لحاظ سے قبیلہ ''قحطان'' کی شاخ ''عنان'' کے خاندان سے تعلق ہے۔ جو ایک مکمل عربی طالب معرفت خاندان ہے میرے بڑے بھائی انجینئر فواد جرداق ہیں۔ جو ماہر لغات، شاعر اور انجینئر ہیں، میرے بچپن ہی سے انہوں نے میری خصوصی تربیت کی ہے۔

میری ابتدائی تعلیم اپنے ہی گاؤں کے ایک سکول میں ہوئی۔ اس گاؤں کے رہنے والے کثرت سے علم و دانش کے حصول میں شہرت رکھتے ہیں۔ اور انہی میں سے ایسی سر برآوردہ شخصیت بھی ہیں جو بیسوی صدی میں عالم طب میں عظیم ترین منی منائی ہستی ہیں اور ان کا نام ہے ''میخائیل الدبعی''۔

پڑھائی کے دوران چھٹیوں کے ایام میں فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سکول سے دو کتابیں لے کر چلا جاتا تھا ایک تو ''دیوان متنبیّ'' اور دوسری شیخ ناصیف بازجی کی لکھی ہوئی کتاب ''مجمع البحرین'' اور یہ کتابیں لے کر قدرتی مناظر سے معمور پرکیف فضا اور سایہ دار درختوں یا چلتے پانی کے کنارے جا کر مطالعہ میں مصروف ہو جاتا یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارا علاقہ سرسبز باغات اور ابلتے چشموں سے لبریز تھا جن کی تعداد سیکٹروں میں تھی اس قسم کے مرغزار کی وجہ سے عرب عوام ایسے علاقوں کو ''مرج'' کہتے ہیں۔ لہذا ہمارے چشموں اور دیہاتوں کو بھی ''مرج العیون'' یا ''مرجیون'' کہتے ہیں۔

ایک مرتبہ میرے بھائی نے مجھے ایسی حالت میں مطالعہ کرتے دیکھا تو انہوں نے مجھے بہت تشویق دلائی اور حوصلہ بڑھایا جس سے میں نے اپنے سلسلے کو جاری رکھا۔ حتیٰ کہ میں نے تہیہ کر لیا کہ مطالعے کے شوق میں اگر سکول کو چھوڑ پڑ جائے تو چھوڑ دوں گا انہوں نے ایک ایک مرتبہ مجھے کتاب ''نہج البلاغہ'' لا کر دی اور کہا اس کتاب کا خصوصی طور پر مطالعہ کرو، اگر ہو سکے تو جتنا یاد کر سکتے ہو اسے حفظ کر لو کیونکہ یہ نہایت ہی سودمند کتاب ہے''۔

چونکہ میرا حافظہ بہت اچھا تھا اور ابھی میری عمر تیرہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان تینوں کتابوں خصوصاً نہج البلاغہ کے بہت سے مطالب کو میں نے حفظ کر لیا اور آج بھی یہ مطالب میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

ایک عرصہ کے بعد میرے ایک قریبی رشتہ دار نے جس کا نام ''منصد جرداق'' ہے۔ مجھے ریاضیات اور علوم طبیعی (سائنس) کی اعلیٰ تعلیمات کے لئے صوویت بھیجنے کا کیونکہ موصوف عصر حاضر کے نہ صرف شرق عربی میں بلکہ پوری دنیا میں ریاضیات کے عظیم دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں۔

لیکن میں اپنے علاقہ سے شدید محبت، کے قدرتی اور روحانی مناظر نیز شعر و ادب سے شدید وابستگی کی وجہ سے اس جگہ کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لہذا میں نے انہیں صاف جواب دے دیا اور وہاں سے بیروت چلا گیا اور وہاں کے ''بطرکیہ'' کالج میں داخلہ لے لیا۔ جس کے طالب علم زبان اور ادب عربی کی وجہ سے شہرت کے حامل ہیں۔

اس کالج کے انتخاب کی وجہ اور اس میں حصول علم کی وجہ سے وہ واقفیت تھی جو میں اس کے ماضی اور سابقہ علمی حالات کے بارے میں رکھتا تھا۔ اور خاص طور پر جانتا تھا دو ہزار سال کے دوران عربی زبان کے علمی لاطلاق عظیم دانش شیخ وابراہیم یازجی اسی کالج کے استاد رہے ہیں۔ اور مشہد شاعر خلیل جبران کے فرزند اسی مادرِ علمی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور تمیح ابراہیم یازجی کے شاگرد تھے۔ مشہور یہی تھا کہ یہ علمی اور وہ عربی زبان کی تدریس میں ایک خاص روش کا پابند ہے۔ ساتھ ہی اس کے اساتذہ فرانسیسی زبان کی تدریس میں شہرت کے حامل ہیں اور اس پر اس تحصیلی زندگی میں اس کے اساتذہ میں سے مشہور و معروف ادیب رئیف خوری اور علامہ دوران، مرجع بزرگ زبان و ادبیات عرب ''فواد افرام البستانی'' تھے۔ جو ''لبنان یونیورسٹی'' کے بانی اور اس کے پہلے رئیس تھے۔ فرانسیسی زبان و ادبیات کے میرے استاد فرانسیسی زبان کے شاعر ''میشل فرید غریب'' تھے۔

جب میں اٹھارہ سال کا تھا تو اپنی سب سے پہلی کتاب ''فاگنر وزن'' کے نام سے تحریر

ایک عرصہ کے بعد میرے ایک قریبی رشتہ دار نے جس کا نام ''منصد جرداق'' ہے۔ مجھے ریاضیات اور علوم طبیعی (سائنس) کی اعلیٰ تعلیمات کے لئے صوویت بھیجنے کا کیونکہ موصوف عصر حاضر کے نہ صرف شرق عربی میں بلکہ پوری دنیا میں ریاضیات کے عظیم دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں۔

لیکن میں اپنے علاقہ سے شدید محبت، کے قدرتی اور روحانی مناظر نیز شعر وادب سے شدید وابستگی کی وجہ سے اس جگہ کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لہذا میں نے انہیں صاف جواب دے دیا اور وہاں سے بیروت چلا گیا اور وہاں کے ''بطرکیہ'' کالج میں داخلہ لے لیا۔ جس کے طالب علم زبان اور ادب عربی کی وجہ سے شہرت کے حامل ہیں۔

اس کالج کے انتخاب کی وجہ اور اس میں حصول علم کی وجہ سے وہ واقفیت تھی جو میں اس کے ماضی اور سابقہ علمی حالات کے بارے میں رکھتا تھا۔ اور خاص طور پر جانتا تھا دو ہزار سال کے دوران عربی زبان کے علمی لاطلاق عظیم دانش شیخ وابراہیم یازجی اسی کالج کے استاد رہے ہیں۔ اور مشہد شاعر خلیل جبران کے فرزند اسی مادرِ علمی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور تمیح ابراہیم یازجی کے شاگرد تھے۔ مشہور یہی تھا کہ یہ علمی اور وہ عربی زبان کی تدریس میں ایک خاص روش کا پابند ہے۔ ساتھ ہی اس کے اساتذہ فرانسیسی زبان کی تدریس میں شہرت کے حامل ہیں اور اس پر اس تحصیلی زندگی میں اس کے اساتذہ میں سے مشہور ومعروف ادیب رئیف خوری اور علامہ دوران، مرجع بزرگ زبان وادبیات عرب ''فواد افرام البستانی'' تھے۔ جو ''لبنان یونیورسٹی'' کے بانی اور اس کے پہلے رئیس تھے۔ فرانسیسی زبان وادبیات کے میرے استاد فرانسیسی زبان کے شاعر ''میشل فرید غریب'' تھے۔

جب میں اٹھارہ سال کا تھا تو اپنی سب سے پہلی کتاب ''فاگنر وزن'' کے نام سے تحریر

کی ''فا گنز'' وہی معروف جرمن فیدف اور شاعر ہیں جس کے بارے میں میں نے یہ کتاب تحریر
ہے۔ اور ''المکشوف'' پبلی کیشنز کی طرف سے شیخ ''فواد حبش'' کے ذریعہ چھپ کر منظرِ عام پر آئی
معلوم یوں ہوتا ہے کہ اس کتاب موجود عربی فصاحت و بلاغت کے نمونوں نے علامہ بزرگ ''عب
اللہ علائلی'' کو بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ یہ بات علی الاعشق کہنے پر تیار ہو
گئے کہ ''اس طرح کی فصاحت ہمارے دورِ حاضر کے ادبیات میں بے نظیر ہے''۔ جبکہ ڈاکٹر حسین
بھی اسی طرح کا عقیدہ رکھتے تھے کہ ''مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو ان کتب میں
شامل کر لیا جائے جس کی تعلیم یونیورسٹیوں کے رشتہ ادبیات کے طلباء کے لئے ضروری ہوتی
ہے۔''

بطریکہ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی میں نے دو کام باہم شروع کر دیئے، لبنان اور
عرب ممالک کے مطبوعات میں مسلسل مضامین نگاری کی بروت کے بعض کالجوں میں دو مضامین
کی تدریس ادبیات عرب اور فلسفہ۔

جن اغرز ناموں میں مسلسل مضامین لکھا کرتا تھا، ان میں سے چند ایک کے نام یہ
ہیں۔ ''المجھور الجدید'' ''الحریۃ'' ''الصیاذ'' ''الشبکۃ'' ''نساء'' الکفام العربی اور ''الامن'' اور پیرس
سے شائع ہونے والے کئی دوسرے عربی رسالے۔

مسلسل دو سال تک روزنامہ ''القیس'' میں اور ایک سال روزنامہ ''الوطن'' میں بھی کسی
وقفے کے بغیر لکھتا رہا۔ جبکہ ایک عرصے تک روزنامہ ''امرای العام'' میں بھی قلم کا امر رکھتا رہا۔ یہ
تینوں اخباروں کو ایسے شائع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں میرے بہت سے مقالات مصر اور شام کے
بعض روزناموں میں بھی غیر مرتب طور پر چھپتے رہے۔ حال حاضر میں ''الصیاذ'' انسٹی ٹیوٹ کے
روزناموں اور رسالہ ''الکفاح العربی'' اور ''الامن'' میں تسلسل کے ساتھ لکھ رہا ہوں مصنوعاتی

کاموں کے ساتھ ریڈیوں کے پروگراموں میں بھی روزانہ یا ہفتہ وار شرکت کرتا تھا مگر انہوں نے روزانہ کا ایک مشہور پروگرام "علی الطریقتی" (میرے راستے ہو) جو آج سے پندرہ سال قبل ویڈیو "صورت لبنان" سے نشر ہوتا رہا ہے۔ اور آج بھی ریڈیو کے پروگرام مینجر اور سامعین کے اصرار کے پیش نظر مسلسل نشر ہو رہا ہے۔

ایک نکتہ جو زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ جو کچھ بھی مطبوعات میں لکھتا ہوں یا جو کچھ بھی ریڈیو سے نشر ہوتا ہے وہ کسی شہر کے بغیر وہ بعینہ چھپا تا نشر ہوتا ہے۔ اور یہی میری پہلی شرط ہوتی ہے کتابوں، مقالوں، مضامین اور فیچرز وغیرہ کے لئے کسی قسم کے سینسر کے بغیر انہیں چھاپا اور نشر کیا جائے۔

اسی دوران میں نے حضرت امام علی (ع) سے متعلق کتابوں کی سیریز تالیف کرنا شروع کردی جن کی تفصیل یہ ہے 1۔ حضرت علیؑ اور انسانی حقوق۔ 2۔ حضرت علیؑ اور انقلاب فرانس کا تعلق۔ 3۔ حضرت علیؑ اور سقراط۔ 4۔ حضرت علیؑ اور ان کا دور۔ 5۔ حضرت علیؑ اور عرب قوم پرستی اور اس کے ساتھ ہی ان کے ساتھ ایک ضخیم بھی تھا جس کا نام ہے "نہج البلاغہ کی حیرت آفرینیاں" اور یہ ضمیان آخری چار برسوں میں ایک مستقل کتاب کی صورت میں تین نشریاتی اداروں "دار الفہار" بروت "دار الشرق" مصر اور "دار الغدیر" بروت سے چھپ چکا ہے۔ البتہ بعدہ میں ان تمام مجوعوں کو یک جا کر کے "علیؑ صورت العدالہ الانسانیہ، (حضرت علیؑ ندائے عدالت انسانی) کے نام سے ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع کیا جا چکا ہے"۔

کتاب "فا گنرزون" اور "امام علی علیہ السلام سے متعلق کئی جلدوں کے مجموعہ کے شائع ہونے والی کتب کی فہرست کچھ یوں ہے جو مختلف مقامات سے شائع ہوئی ہیں۔ 1۔ قصور واکواخ (محلات اور جھونپڑیاں) 2۔ ہزار صفحے پر مشتمل تاریخی "بعنوان صلاح الدین اور چرڈ شرول۔

3۔ نجوم الظہر (ظہر کے ستارے)۔ 4۔ عبقریہ العربیۃ (عرب نابغہ روزگار)۔ 5۔ صبایا وم (دوشیزائیں اور آئینے) 6۔ وجوہ من کوتون (کوتون کے چہرے) 7۔ حدیث الحمار اور بہت کہانیاں۔ اسی طرح ڈراموں، تھیٹروں اور فلموں کے لئے لکھے گئے سکرپٹ ایک ٹیلیویژ سیریل بھی تحریر کرتے ہیں۔

سوال:☜ آپ نے حضرت امام علی علیہ السلام کی شخصیت سے کیونکر، کب اور کہا آشنا ہوئے ہیں؟۔

جواب:☜ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اس عظیم الشان بزرگوار شخصیت سے میر آشنائی کا عرصہ میرے بچپن سے تعلق رکھتا ہے جب میرے بھائی فواد جرداق نے مجھے کتاب "البلاغہ" لا کر دی اور کہا: "اسے پڑھو اور جتنا اسے حفظ کر سکتے ہو حفظ کرلو، اس کے علاوہ میر۔ بھائی فواد نے مجھے امام علیؑ کے بارے میں بہت سے قصائد بھی سنائے جن حضرات کی زندگی ـ مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مثلاً آپ کی نابغہ روزگار شخصیت، بلندی فکر، انسانی عظمہ کے بنیادی اصول وغیرہ وہ یہ قصائد ان لوگوں کے سامنے بھی پڑھا کرتے تھے جو ہمارے گھر ملنے آیا کرتے تھے اور میں انہیں بڑے غصہ سے سنا کرتا تھا۔ ان قصائد میں سے ایک کو کتاب و "الصوت العدالتہ الانسانیۃ" کی پانچویں جلد کے آخر سے درج کیا گیا ہے۔

اس طرح سے امام علی علیہ السلام کی تصویر میرے ذہن و جان میں نقش ہوگئی بعینہ اسی طرح جس طرح کسی بچے کے ذہن میں باتیں، کام اور تصاویر نقش ہوجاتی ہیں۔

بہرحال زمانہ گزرتا رہا اور میں جس طرح کہ بتا چکا ہوں بیروت کے بطرکیہ کالج ـ فارغ التحصیل ہوکر بیروت کے مختلف تعلیمی اداروں میں ادبیات عرب اور فلسفہ عربی کی تدریس میں مشغول ہوگیا۔ ان دونوں مضامین کی تدریس میں میں نے ضروری سمجھ لیا تھا کہ امام علی عل

سلام کے ادبی اور فکری آثار کی تدریس بھی کی جائے۔

چونکہ انسان کے بچپن کے زمانے میں رونما ہونے والے واقعات اور جذبات تدریس کے لئے ناکافی ہوتے ہیں اور استاد جس ادبی، فلسفی شخصیت کے بارے میں تدریس کرنا چاہتا ہے اس شخصیت کے بارے میں مکمل آشنائی اور آگاہی ہونی چاہیۓ اور معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ ہونا چاہیۓ تاکہ طلباء کو ہر ممکن طریقے سے قانع کر سکے۔ میں نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ امام علیؑ کی ذات کے بارے میں خصوصی طور پر تحقیق کروں اور امام کے بارے محققین کی آراء اور نظریات کا بغور مطالعہ کروں اور آپ کی تدریس کے ادبی، فکری، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں کا بغور مطالعہ کروں تاکہ اپنے بچپن کے دنوں میں حاصل ہونے والی معلومات میں اضافہ کر سکوں۔

اس بات کا اضافہ کرتا چلوں کہ انسان جن دانشمند اور فلسفی شخصیت کے بارے میں طلباء کو درس دیتا ہے اس کے بارے میں اسے زیادہ سے زیادہ معلومات کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ لہذا میں نے بھی ان کتابوں کو پڑھنا شروع کر دیا جو امام علیؑ کے بارے لکھی گئی ہیں۔

کافی عرصہ کے مطالعہ کے بعد میرے لیے یہ بات واضح ہوئی کہ ان میں سے اکثر کتابیں تاریخی مسائل کے بارے میں ہیں جو کسی محدود اور معین زماں اور مکان کے ساتھ متعلق ہیں اور بعض اوقات ان کا رخ تاریخ کے بعض مراحل سے متعلق لوگوں کے کسی ایک گروہ کی طرف ہوتا ہے تاکہ تمام زماں و مکاں کے تمام افراد کی طرف ان کتابوں کے اکثر و بیشتر مطالب امامؑ کے خلافت کے حق دار ہونے اور کتاب لکھنے والوں کے نقطۂ نظر سے اس حق کی مقدار اور میزان کے گرد گھومتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک رائٹر نے اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق خامہ فرمائی کی ہے جس کا خود امام علیہ السلام کے فکر و اندیشہ سے کوئی مستحکم رابطہ نہیں ہے۔

اسی بناپر میں نے تہیہ کرلیا کہ ایک مرتبہ پھر نہج البلاغہ کی طرف رجوع کروں اور اسے مکمل شناخت اور بہتر معرفت کے ساتھ دوبارہ از سرِ نو پڑھوں، لہذا میں نے اسے دوبارہ پڑ شروع کر دیا، اب کے مجھے محسوس ہوا کہ امام تو گزشتہ اور موجودہ تمام محققین کے ایجادا مقالمات وتحقیقات سے عمیق اور زیادہ عظیم وبالاتر ہیں اور امام کی انسانیت کا اپنے تمام اصول مبانی کے ساتھ پاکیزہ سوچ گہری فکر، عمیق ادراک وشعور کے سرچشمہ سے سیراب ہوتی ہے جہان ہستی کے حقیقی معنی کی جلوہ نمائیاں کر رہی ہے۔ آپ کی پاکیزہ تعلیمات جو آپ کی سیر کردار اور اصول ومبانی میں متجلی ہے وہ کسی زمان ومکان کی قید سے بالاتر ہیں اور ہر زمان وم کے لئے معلم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی لئے یہ بات میرے لئے باعث تعجب بلکہ اس سوا سبب بنی کہ نادرۃ الزمن اور نابغہ روزگار ہستی کو ''ولایت'' اور دیگر موضوعات کی مباحث میں ا قلم حضرات نے کس لئے محدود ومحصور کر دیا؟

یہی وجہ تھی کہ میں نے حقیقت کے ساتھ عشق کے جذبہ کے تحت یہ عزم بالجزم کرلیا ایک دائرۃ المعارف کی صورت میں ایک جامع کتاب تحریر کروں جس میں اس عظیم ہستی کے سا فہم وشعور اور آگاہی وآشنائی کی آخری حد تک منصفانہ سلوک کیا جائے اور اہل قلم حضرات سے بارے میں جو فروگزاشتیں ہوئی ہیں ان کی تلافی کی جائے، اس کتاب کی پہلی جلد میں ''حضرت اور انسانی حقوق'' کے عنوان سے میں نے واضح دلائل سے ثابت کیا ہے کہ آنجنابؑ نے صد پہلے انسانی حقوق کو پختہ اور روشن مفہوم کے ساتھ نہ صرف خود پہچانا بلکہ دوسروں کے لئے بھی بات کا اعلان فرمایا جبکہ باقی دنیا عمومی طور پر اور یورپ بطور خاص اس سے مکمل طور پر ناآش دوسری جلد میں ''حضرت علیؑ اور انقلاب فرانس'' کے عنوان کے تحت میں نے ثابت کیا ہے فرانس کے عظیم انقلاب کے فلاسفہ کے پیشتر دنیا صاحبان کے عظیم فلسفی علی بن طالبؑ ہیں۔

تیسری جلد کا عنوان ہے ''حضرت علیؑ اور سقراط ہم سب کو معلوم ہے کہ سقراط تمام فلاسفہ کا ''باپ'' ہے اور میں نے اس جلد میں ثابت کیا ہے کہ صرف سقراط ہی نہیں بلکہ حضرت علیؑ ہر مرحلے پر سقراط کے ساتھ وجہ مشترک کے حامل ہیں اسی طرح مل ملا کر اس کی کل چھ جلدیں ہیں جبکہ آخری جلد کا عنوان ہے ''نہج البلاغہ کی محیر العقول باتیں''۔

سوال: ☜ حضرت امام علی علیہ السلام کے بارے میں آپ کا ذاتی نظریہ کیا ہے؟

جواب: ☜ یہ جو کتاب کی چھ جلدیں ہیں آیا میرے ذاتی نقطہ النظر کے بیان کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں؟ لیکن اگر آپ مصر ہیں تو میں اس کا نہایت ہی مختصر اور جامع جواب یوں دوں گا کہ ''حضرت علیؑ، انسانی فکر و نظر کا آئیڈیل ہیں وہ فکر و نظر جو دنیا پر مستقل قوانین و سنت کی حیثیت سے حکمرانی کر رہا ہے۔ اور جس میں زماں و مکان کی کسی بھی تبدیلی نے اس میں کسی کا رد و بدل نہیں کیا۔ جس طرح کہ خود ان کی اپنی تخلیق ہی کئی وسعتوں کی حامل ہے اور آپ کے وجود مسعود کائنات کی وسعتوں کو عمیق ادراک کیا ہوا تھا۔''

سوال: ☜ کیا وجہ ہے کہ آپ نے حضرت امام علی علیہ السلام کی ذات کے لئے ''عدالت انسانی'' کی صفت کا انتخاب کیا ہے؟ آیا آپ کی رائے میں امام علیہ السام عدالت کی کامل ترین صورت کے نمونہ تھے؟۔

جواب: ☜ آیا آپ یا کوئی اور امام علی علیہ السلام کی شخطیت کے بارے میں جس طرح کہ عالم واقع میں ہے اور ان کی سیرت کے بارے میں جس طرح کہ ہماری کتاب کی ان چھ جلدوں میں ہے اس تعبیر سے زیادہ واضح اور بلیغ ترین صورت میں کوئی اور صورت پیش کر سکتے ہیں جو ''صوت العدالۃ النسانیۃ'' میں ہے؟ اس نام کا انتخاب ہی واضح طور پر کتاب کے مقالب کو بیان کر رہا ہے۔

سوال:☜ کتاب ''صوت العدالہ الانسانیۃ'' کی طباعت اور نشر و اشاعت کے کیا او
نتائج اور اثرات مرتب ہوئے۔ دنیائے عیسائیت اور عالم السلام، خصوصاً اہل تشنیع اور اہل تشنن
میں اس کا کیا ردعمل ہوا؟

جواب:☜ شائع ہو جانے کے بعد کتاب کی یہ تاثیر ہوئی کہ عراق میں ''المثنی'' نام
کتب خانہ کے مالک نے اس کتاب کے شائع ہونے کے ایک ماہ کے اندر میری اطلاع کے بغی
بغداد سے دوبارہ چھاپ دیا۔ اور عراق کے کتب خانوں کو بھر دینے کے مشرق بعید کے مما لک میر
لاکھوں کی تعداد میں بھجوا دیا۔ جبکہ اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ بہت سے مشرقی مما لک نے مجھ سے
رابطہ کئے بغیر اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے شائع کئے۔

اس کا ایک اور اثر یہ ہوا کہ خود بیروت میں یہی کتاب مجھ سے پوچھے بغیر متعدد بار شائع ہوئی۔
البتہ مشرقی مما لک کے بعض ناشرین کا یہ اقدام ان کے کاروباری اور تجارتی نقطہ نظر کی عکاسی کر
ہے، عجیب لطف کی بات آپ کو بتاؤں کہ اس کتاب کے بعض عربی اور غیر عربی مترجم نسخے میر
نے اپنی جیب سے خریدے ہیں کیونکہ ناشرین اور مترجمین گرامی نے اس قدر بھی مہربانی نہیں کی
کہ اس قدر وسیع اشاعت کی حاصل کتاب کہ نہ تو کوئی عربی کتاب اس کی تعداد اشاعت تک پہنچی
ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا مترجم کتاب کے شائع کرنے کے بعد کم از کم ایک نسخہ مجھے بھیج دیں۔ تو یہ
ہے اس کتاب کی گزشتہ اور موجودہ زمانے میں مقبولیت عامہ۔

رہی آپ کی یہ بات کہ دنیائے عیسائیت میں اس کتاب کا کیسے استقبال ہوا ہے؟ تو اس بارے
میں لبنان کے ایک لاٹ پادری کے اقدام کے بارے اشارہ کروں گا۔

جب میں اس کتاب کی تالیف و تحریر میں مشغول تھا، ''الرسالہ'' نامی رسالہ کے ایڈیٹر
انچیف جو میرے ایک بزرگوار دوست تھے میرے پاس آئے اور تقاضا کیا کہ اس کی جتنی فصول

میں اس وقت تحریر کر چکا ہوں ان میں سے کم از کم دو فصلیں انہیں ضرور دوں تا کہ وہ رسالہ میں شائع کرے۔ میں نے ان کی بات کو مان لیا اور دو فصلیں انہیں دے دیں اور انہوں نے وہی تو فصلیں رسالہ کے دو شماروں میں شائع کر دیں۔

اتفاق سے ''جونیہ'' شہر (شمالی بیروت کے علاقہ) کے مدرسہ ''ہبان کرملی کے پرنسپل عظیم دانشور'' ''فادر نجم'' نے ان دونوں فصلوں کا مطالعہ کیا تو انہیں مباحث کے مضامین اور اسلوب نگاری بہت پسند آیا۔ رسالہ کے ایڈیٹر انچیف کے ساتھ رابطہ کرنے کے بعد اعلان کر دیا کہ ''کتاب کی تمام جلدیں مکمل ہو جانے کے بعد ہم حاضر ہیں کہ کتاب کی تمام جلدوں کو ''ادارہ رہبانیت'' کے خرچے پر شائع کریں'' چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور ''فادر نجم'' نے اپنے ہی خرچے پر انہیں شائع کیا۔

کتاب شائع ہو جانے کے بعد مختصر سے عرصہ میں اس کی بہت بڑی مقدار فروخت ہوئی لیکن اس بزرگوار راہب نے اس کے عظیم مقدار میں اخراجات برداشت کرنے کے باوجود بھی ایک پیسہ تک نہیں لیا۔ بلکہ فرمایا: میں نے یہ کتاب امام علی علیہ السلام کی عزت وتکریم اور موصف کے اسلوب نگارش اور رضوان کی وجہ سے شائع کیا ہے اگر آپ کی قیمت دینا چاہتے ہیں تو آپ وہ اپنے کسی پسند کے خیراتی ادارے یا کار خیر انجام دینے والی کسی انجمن کو دے دیں۔ آپ مشرق زمین کے عظیم ادیب ''میخائیل نعیمہ'' کے اس تاثرات کا مطالعہ فرمائیں جو انہوں نے اس کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں یا عرب عیسائی ادیبوں کی اس بارے میں تحریروں کو پڑھیں جو کتاب ہذا کی پانچویں جلد کے آخر میں درج ہیں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیائے سمیت نے اس کتاب کو کس طرح دل میں جگہ دی ہے۔

رہی عالم اسلام کی بات تو، اس بارے اگر آپ اسی کتاب کی پانچویں جلد کی اس فصل کا

مطالعہ کریں (اس کتاب بارے دانشوروں کی رائے) کے عنوان سے شائع ہوئی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ مسلم ادباء، دانشور اور ادیب خواہ وہ عربی ہوں یا غیر عربی خصوصی طور پر عالم تشیع میں کہ جن کے سرفہرست عرب، ایران اور بعید کئی دوسرے ملکوں عظیم شعیہ پر ہیں انہوں نے شایان شان طریقہ سے اس کتاب کا استقبال کیا ہے۔ اس کتاب بارے میں ان کے جو مشترکہ تاثرات ہیں وہ یہی کہ ''یہ کتاب وہ واحد کتاب ہے جس نے امام علی علیہ السلام کے حقیقت وجود کی نوع کے چہرہ سے نقاب الٹی ہے۔ اور دوسری کوئی بھی کتاب نہ تو ماضی میں اور نہ حال میں ایسی شائع ہوئی ہے جو اس کا مقابلہ کر سکے۔''

سوال: آیا آپ اس کتاب میں اپنی شخصیت کو پیش کر سکے ہیں؟ آیا آپ کے تمام مطلوبہ مقاصد عینی صورت میں حقیت کا روپ دھار چکے ہیں؟

جواب: اگر کوئی صاحب قلم اپنے ضمیر، قلبی احساسات اور جذبات میں سچا ہو تو وہ جو کچھ تحریر کرتا ہے اس میں اپنی شخصیت کا اظہار کر سکتا ہے۔ میں نے اب تک اپنی جو بھی کتابیں شائع کی ہیں یا اشاعت کے لئے تیار ہیں، ان میں سے کوئی بھی کتاب میرے لئے اتنا دلچسپ، دلپذیر اور محبوب تر نہیں ہے۔

آپ کے اس سوال کے بارے میں کہ ''آیا آپ اپنے مطلوبہ مقاصد کو عینی صورت میں دیکھتے ہیں؟'' تو اس بارے میں عرض ہے کہ ایک رائٹر یا ایک صاحب نظر خواہ وہ کسی بھی حیثیت کا مالک ہو خواہ وہ کہیں کا باشندہ ہو وہ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہوتا ہے یا وہ لکھ رہا ہوتا ہے اس میں وہ صادق ہو اور جو چیز دوسروں کو دیکھنے یا پڑھنے کے لئے دے رہا ہو اس پر اس نے خود اس کا اپنا ایمان اور عقیدہ بھی ہو اور دوسروں کو دینے میں اس کے اندر جرأت اور جسارت اور شہامت بھی ہونا چاہئے۔

رہی آپ کی یہ بات کہ ''کتاب میں پیش ہونے والے مطالب کو عملی صورت میں رونما ہوتے دیکھا ہے؟'' تو اس بارے میں یہی گزارش کروں گا کہ اس کا دارومدار ان نظاموں اور حکمانوں پر ہے جو معاشروں پر حکم فرما ہوتے ہیں اور ایک عمومی کیفیت ہوتی ہے جس کی طرف احکام اپنی رعایا کو لے کر چلتے ہیں۔ اسی کلیہ کی رو سے میں خود آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آیا آپ نے حاکم مصر مالک اشترنخعی کے نام حضرت امام علی علیہ السلام کے مکتوب کا مطالعہ کیا ہے؟ مثبت جواب کی صورت میں آپ خود اپنے ہی سے سوال کریں کہ دنیا کے اکثر سب سے زیادہ ترقی یافتہ آئین کو صادر ہوئے چودہ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس کا کتنا حصہ مشرقی ممالک میں نافذ العمل ہے؟ اور کس اسلامی ملک میں اس کا اجرا ہو رہا ہے۔

سوال: دنیائے عیسائیت میں حضرت امام علی علیہ السلام کو کیا مقام دیا جاتا ہے۔

جواب: پرون وسطی کے یورپی ادبیات خصوصاً اطالوی ادبیات جو دوسرے ادبیات سے زیادہ نمایاں ہے، کا مطالعہ کرنے سے اس دور کے عالم مسیحت کے افکار و اعتقادات کا بخوبی پتہ چلے گا کہ حضرت امام علیؑ کے بارے میں لوگوں کی غالب اکثریت انہیں ایک مقدس مسیحی شخصیت سمجھتی ہے کیونکہ ان کا کلام اور راہ و روش حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی تعلیمات سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

اس بارے میں اس نکتے کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ ایک قدیم اطالوی کلیسا میں حضرت علی کی تصویر موجود ہے۔ اور بیروت میں بھی ارتھوڈکی کے لاٹ پادری کے مدرسہ ''زھرۃ الاحسان'' کے وسیع و عریض پروٹوکول سیلون کے اوپر کے حصہ میں امام علی علیہ السلام کا ایک عظیم عکس نصب ہے۔ اگر ہم گزشتہ صدی کے فرانسیسی مورخ محقق اور دانشور ''باروں کارا ڈیوو'' کی حضرت امام علی علیہ اسلام کے بارے تحریروں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس صاحب قلم کے

نزدیک حضرت علی علیہ السلام کی قدر ومنزلت بہت عظیم ہے اور اپنے ان ہم مسلک افراد میں امام علی علیہ السلام کی معرفت کے لحاظ بلند مقام کا حامل ہے جو علیؑ کی معرفت رکھتے ہیں۔

رہ گئی بات عرب عیسائی ادیبوں اور دانشوروں کی تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے نزدیک امام علی علیہ السلام کی کیا قدر ومنزلت ہے؟ اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے کافی ہے کہ اپنے زمانے کی مشہور تاریخی شخصیت جرجی زیدان کی تحریروں کا مطالعہ فرمائیں اور ساتھ ہی ان افراد کی نظم ونثر کو خوب غور سے پڑھیں۔ جُبران خلیل جبران، میخائل نعیمہ، مارون عبود، بولس سلامہ، فواد جرداق، عبدالمسیح محفوظ وغیرہ اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ حضرت امام علی علیہ السلام کے بارے میں لکھی ہوئی میری کتابوں کو اپنے خصوصی فنڈ یا اپنی زیرِ نگرانی اپنے ادارے کے سرمایہ سے شائع کیا وہ لبنان کے ایک مسیحی راہب تھے جنہوں نے امام علیؑ کی ذات سے عشق اور محبت کی وجہ سے اتنا بڑا اقدم اٹھایا۔

اس طرح کے اتفاقات رونما ہونے پر تعجب نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے کہ ایک دن حضرت محمدؐ جو امام علیؑ کی طینت، ماہیت اور حقیقت کو دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں کافی دیر تک علیؑ کے چہرہ کو غور سے دیکھتے رہے، آخر میں فرمایا، "یا علیؑ! میں تمہارے اندر عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کی مشابہت دیکھتا ہوں۔"

جب انسان ادراک کے ایک اعلیٰ ترین مرتبے تک جا پہنچتا ہے تو جس بھی فلسفی معاشرتی یا دینی نظریئے میں ترقی کی آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے تو حقائق اور واقعات کو ہی دیکھتا ہے۔ اسی لئے صاحبان معرفت جس بھی سرزمین میں ہوں اور جس بھی مکتب فکر سے ان کا تعلق ہو وہ حقیقی اقدار حامی ہی نظر آئیں گے۔

سوال:☜ آپ کی نظر میں عالم انسانیت کے لئے حضرت امام علی علیہ السلام کی طرف

سے پیش کیئے گئے تمدنی اصول صرف ان کی اپنی ہی سوچ کا نتیجہ تھے یا آسمانی تعلیمات سے ان کا تعلق تھا؟

جواب:☜ بنیادی طور پر محض ''فکر ونظر'' نام کی کوئی چیز دنیا میں موجود نہیں ہے کیونکہ فکر ونظر بڑی حد تک واقعات کو کام میں لانا ہوتا ہے اور کائنات اور زندگی کے مستقل قواعد وقوانین کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ ایسے قوانین جو کسی اندیشہ مند انسان کی توانائی کے مطابق ہوتے ہیں۔ یا جس روش کو اپنایا جاتا ہے عملی طور پر لوگوں کے زندگی کے مقصد یا زندگی میں ان کے ہدف کے ساتھ مربوط ہوتی ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ امام علی علیہ السلام کی روش کائنات کے مستقبل کے قوانین وسنن کے بارے میں عمیق اور دقیق توجہ ہوا کرتی تھی۔ اور انسانی معاشرے کے بارے میں جو ان کا نقطہ نظر تھا اور یہ نقطہ نظر کائنات کے مستقل اور پائیدار قوانین سے ہم آہنگ تھا اسی طرح عوام کی سعادت اور نئ خوش بختی ان کا مقصد حیات تھا کہ فرد اور معاشرہ کی اصلاح کر کے انہیں سعادت اور خوش بختی کی معراج تک پہنچایا جائے۔ اور انسان سازی ایسے انداز میں ہو کہ جو معاشرتی بنیادی اصولوں اور ان کے لوازمات یعنی عدالت، ارتقائے امور کے زیر سایہ ہو، کہ جس کے ساتھ آسمانی ارادہ یعنی محبت، راحت اور صفائے باطن بطور ہدیہ کے ہو۔

سوال:☜ انسانی افکار ونظریات میں نہج البلاغہ کا کیا مقام ہے؟

جواب:☜ نہج البلاغہ انسانی افکار کی بلند چوٹیوں تک پہنچا ہوا ہے کیونکہ جن بلند اقدار اور اعلیٰ اصول کی تلاش میں دانشوروں اور معاشرہ کے ماہرین نے صدیوں پہلے اپنی توانائیاں صرف کی ہیں اور اس تلاش میں رہے ہیں کہ یہ اقدار اور اعلیٰ اصول عالم انسانیت میں نمایاں نظر آئیں ان کو یہ سب کچھ نہج البلاغہ میں مل گیا اور میں نے ''صوت العدالتہ الانسانیہ'' کی چھ جلدوں میں سے ہر ایک میں نہج البلاغہ کے متعلق تفصیل سے بحث کی ہے کہ جنہوں نے الفاظ میں بیان

نہیں کیا جا سکتا اگر آپ کو مفصل اور قانع کنندہ جواب کی ضرورت ہے تو آپ ان چھ جلدوں کا مطالعہ فرمائیں تسلی ہو جائے گی۔

سوال:☜ آپ کے نقطہ نظر سے "تشیع" کے کیا معنی ہیں؟

جواب:☜ میرے نزدیک اس کے چند ایک معانی ہو سکتے ہیں۔

1۔ ان تمام انجمنوں، اداروں، معاشرتی اور سیاسی قوانین سے بیزاری کا نام تشیع ہے جو کسی انسانی فرد یا معاشرے کی ذات و آواز کا موجب ہوتے ہیں۔

2۔ انسان کے انسان سے اور افراد کے افراد سے استحصال و استحصال کی نفی کا نام تشیع ہے۔

3۔ حکام وقت کے ان تمام ناروا اور ناشائستہ اقدامات کے خلاف قیام و جدوجہد کا نام تشیع ہے اپنے مفادات کے حصول کے لئے طاقت کا ناجائز استعمال کر کے ہر قسم کے تشدد کو روا سمجھتے ہیں چنانچہ مشرقی ملکوں میں تاریخی حوادث ہماری حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔

تاریخی طور پر ظالم حکام کے خلاف تشیع اور شعیوں کا اٹھ کھڑا ہونا (قیام و جہاد) دوسرے لفظوں میں لوگوں کے درمیان رحمت، محبت اور عدالت کی برقراری اور مستعفین کے ساتھ دل سوزی اور محبت و بھائی چارے کی علامت ہے اور ظلم کے سامنے ڈٹ جانے اور اس کے راستوں کو بند کرنا اور نتائج ظلم کا خاتمہ ہے۔

سوال:☜ آیا آپ کے نزدیک موجودہ دنیا کا نقشہ اور ساخت صحیح خطوط پر مبنی ہے؟ آیا آپ چاہتے ہیں کہ اس کے خطوط میں امام علی علیہ السلام کی راہ وروش کے مطابق تبدیلی ہونا چاہیئے؟۔

جواب:☜ انسان کی بدبختی اس بات میں ہے کہ تاریخ کے زیادہ تر مراحل میں اور اکثر و بیشتر سرزمینوں میں اس دینا کا ڈھانچہ اور خطوط ان لوگوں کے مفادات کے مطابق استوار ہیں

جو دو مصیبت ناک آفات یعنی سیاست اور تجارت سے بہرہ مند ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ سیاست وہی ہے جسے ہر ایک اچھی طرح جانتا ہے اور سمجھتا ہے روئے زمین کے اکثر و بیشتر نقاط میں آج تک ترقیاتی کام رکے ہوئے ہیں جبکہ تجارت ایک ایسا عامل ہے جو ماضی میں بھی تمام امتوں کی آفت الآفات رہی ہے اور آج بھی اس کا وہی کردار ہے تمام اور اقوام و ملل کی بد بختیوں کا مجموعہ ہے۔

دنیا اس وقت تک اپنی صحیح ڈگر پر نہیں چل سکتی جب تک کہ اس کے تمام امور تقدیریں اور اسے چلانے کا کام دو قسم کے لوگوں کے سپرد نہ کیا جائے، ایک عالم اور دوسرے ادیب عالم یعنی روشن خیالی، صحیح راستہ، معیار اور نہ میزان جبکہ ادیب کے معنی ہیں روشن سوچ، خیر خواہ دل اور ضمیر، رحمت، ہستی کا ادراک اور زندگی کا تقدس ہے۔ جبکہ امام علی علیہ السلام اپنی عملی سیرت اور اپنی راہ روش میں عالم بھی تھے اور ادیب بھی یہ دونوں صفات ایک ہستی میں بیک وقت موجود ہیں۔

(منقول از www.14masom.com)

"صدیق اکبر"

علی بن ابی طالب علیہ السلام

(عباسعلی کامرانیان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''صدیق اکبر'' علی بن ابی طالب علیہ السلام

''حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کیا فرماتے ہیں؟'' اس بارے میں ایک خصوصی مقالہ عباسعلی کامرانیان نے روزنامہ کیہان تہران کے شمارہ ۱۸۳۰۹ میں تحریر کیا ہے جس کا ترجمہ نذر قارئین ہے۔

سلیم بن قیس ہلالی کہتے ہیں کہ میں نے خلافت ثالثہ کے دور میں حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو مسجد نبوی میں تشریف فرما دیکھا اور آپ کے ساتھ تقریباً دوسو (۲۰۰) اصحاب پیغمبر بھی بیٹھے ہوئے تھے جن میں سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ بن عبداللہ، زبیر بن عوام، مقداد بن اسود، عبداللہ بن عباس، محمد بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر، حسنین شریفین ابن علی علیہم السلام اور عبداللہ بن جعفر جیسی چیدہ چیدہ شخصیات قابل ذکر ہیں شامل تھیں اور ہر ایک اپنے اپنے قابل فخر کارنامے بیان کر رہا تھا مثلاً یہ کہ حضور پیغمبر خداؐ نے قریش کے بارے میں جو کلمات تحسین ارشاد فرمائے ہیں انہیں دہرا رہے تھے، کوئی کہتا تھا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ: ''اَلائِمَّةُ مِنَ الْقُرَیْشِ'' (تمام ائمہ قریش میں سے ہوں گے) کوئی کہتا تھا کہ سرکار رسالتمآبؐ نے فرمایا ہے کہ: ''اَلنَّاسُ تَبعٌ لِقُرَیْش'' (تمام لوگ قریش کے تابع ہیں) کوئی کہتا تھا کہ آنحضورؐ کا فرمان ہے کہ: ''قُرَیْش اَئِمَّةُ الْعَرَب'' (قریش عربوں کے پیشوا ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

مگر علی علیہ السلام سب کچھ خاموشی کے ساتھ سن رہے تھے اور کچھ بول نہیں رہے تھے،

جب ہرایک اپنی باتیں کر چکا تو خاموش بیٹھے ہوئے علی علیہ السلام سے سب نے درخواست کی کہ آپ بھی کچھ فرمائیں، اس پر آپ نے ایک تفصیلی گفتگو فرمائی جس میں آپؑ نے اپنے فضائل بیان فرمائے، جس کا سب لوگوں نے اقرار کیا کہ واقعاً حضور اکرمؐ نے آپؑ کے یہ فضائل ارشاد فرمائے ہیں، پھر آپ نے ان کی توجہ اپنے بارے نازل ہونے والی آیات اور دوسرے بہت سے شواہد کی طرف دلائی کہ رسالتمآبؐ کے نزدیک ان کا کس قدر نزدیکی مقام ورتبہ ہے؟ آپؑ نے ان کے ضمیر کو بیدار کرتے ہوئے فرمایا: ''تمہیں خدا قسم بتاؤ کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی؟''یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ''یعنی اے ایماندارو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور اپنے میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو (نساء/٦)

اور یہ آیت ''وَلَمْ یَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَةً'' یعنی اللہ، اس کے اور ''مومنین'' کے سوا کسی کو دوست نہیں بناتے (توبہ/١٦) جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے حضور پاکؐ سے پوچھا کہ ''یارسول اللہ! آیت مذکورہ میں ''مومنین'' سے مراد مومنوں کا کوئی خاص گروہ ہے یا عام مومنین ہی ہیں؟'' تو اس موقعہ پر خداوند عالم نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ ''اولی الامر'' کا تعارف کرائیں، جس طرح نماز، زکوٰۃ اور حج کی تفسیر بیان فرمائی ہے اسی طرح ''ولایت'' کی بھی تفسیر کریں، لوگوں کو تفصیل کے ساتھ ولایت کا تعارف کرائیں اور ان (علی بن ابی طالب علیہ السلام) کو لوگوں کی ولایت کیلئے منصوب فرمائیں''۔

جب حضور کو یہ حکم خداوندی ملا تو آپؐ نے غدیر خم کے مقام پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: ''اے لوگو! خداوند عالم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں ایک پیغام پہنچاؤں، جس سے میرا سینہ اس لئے تنگ ہو چکا ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ لوگ اس بارے مجھے جھٹلائیں گے، جس پر اللہ تعالیٰ نے مجھے دھمکی دی ہے کہ یا تو میں وہ پیغام لوگوں تک پہنچاؤں یا پھر اس کی سزا کے لئے تیار

ہو جاؤں!'' پھر حضورؐ نے حکم دیا کہ سب لوگوں کو باآواز بلند ایک جگہ اکٹھا کرو پھر آپؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: ''اے لوگو! جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ میرا مولا اور میرے اوپر صاحب اختیار ہے اور میں مومنوں کا مولا اور ان پر صاحب اختیار ہوں اور میں مومنوں کی نسبت ان جانوں پر زیادہ تصرف کا حق رکھتا ہوں؟''۔

سب نے کہا: ''ہاں یارسول اللہؐ! آپ سچ فرماتے ہیں'' اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''یاعلیؑ کھڑے ہو جاؤ'' میں کھڑا ہو گیا جس پر حضور نے ارشاد فرمایا: '' مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ، اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ ''جس کا میں مولا اور صاحب اختیار ہوں، اسی کا یہ علیؑ مولا اور صاحب اختیار ہے، خداوندا! جو اس سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت فرما اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔

اس موقع پر سلمان فارسیؓ کھڑے ہو گئے اور پوچھا: ''یارسول اللہؐ! علیؑ کی کس قسم کی ولایت ہے؟'' تو حضورؐ نے جواب دیا: ''جس طرح لوگوں پر میری ولایت ہے اور میں ان کے نفسوں سے ان پر زیادہ حق تصرف رکھتا ہوں'' اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ''میں نے آج کے دن تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی تمام نعمتیں پوری کر دیں اور اس بات سے راضی ہوں کہ تمہارا دین اسلام ہے (مائدہ/۳) اس وقت حضرت پاکؐ نے تکبیر کا نعرہ بلند کر کے فرمایا: ''اللہ اکبر! میرے بعد میری نبوت اور دین اسلام کی تکمیل علی علیہ السلام کی ولایت کے ذریعہ ہو گئی''۔

یہ سن کر جناب شیخین کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے: ''یارسول اللہؐ! آیا یہ آیات علیؑ کے ساتھ مخصوص ہیں؟'' فرمایا: ''ہاں! علیؑ اور میرے بعد قیامت تک آنے والے میرے دوسرے

اولیاء کے ساتھ خاص ہیں'' انہوں پھر عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپؐ ہمیں اپنے ان اوصیاؑ کا
تعارف تو کرائیں''، حضورؐ نے فرمایا: ''وہ میرا بھائی، میرا وزیر، میرا وارث، میرا وصی اور میرے
بعد میرا خلیفہ علی بن ابی طالبؑ ہے، ان کے بعد ان کے دو بیٹے حسنؑ اور حسینؑ ہیں، ان کے بعد
حسینؑ کی اولاد سے ان کے نو فرزند ہیں جو یکے بعد دیگرے میرے وصی قرار پائیں گے، قرآن
ان کے ساتھ ہے اور وہ قرآن کے ساتھ ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے جب تک
کہ مجھ تک حوض کوثر پر نہ پہنچ جائیں''۔

مولا علی علیہ السلام کی اس گفتگو کے بعد تمام حاضرین نے بیک زبان کہا کہ: ''ہاں! ہم
نے یہ پیغمبرؐ سے سنا ہے''۔ (الغدیر جلد ا ص ۱۶۳)

حضرت حلیمہ سعدیہ کی ایک بیٹی تھی جس کا نام ''حرہ'' تھا، وہ علی علیہ السلام کی شیعہ تھی
ایک دن وہ اموی خونخوار خلیفہ ''حجاج بن یوسف ثقفی'' کے دربار میں بلائی گئی، حجاج نے اس سے
کہا: ''میں نے سنا ہے کہ تو علی بن ابی طالبؑ کو ثلاثہ سے برتر سمجھتی ہے؟'' اس نے کہا: ''جس
نے بھی تم سے یہ کہا ہے غلط کہا ہے، کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ علیؑ نہ صرف ان تینوں سے افضل ہیں
بلکہ حضرت رسول خداؐ کے علاوہ دیگر تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں''۔

حجاج نے اس کے یہ ''جسارت آمیز'' کلمات سننے کے بعد چیخ کر کہا: ''تیرا ستیاناس
آیا علیؑ کو اولوالعزم انبیاءؑ سے بھی افضل جانتی ہے؟'' اس نے کہا: ''صرف میں ہی نہیں افضل سمجھتی
بلکہ خداوند کریم نے ہی انہیں افضل قرار دیا ہے اور اس بارے میں قرآن کریم گواہی دے رہا ہے
حجاج نے کہا: ''اگر تم اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرو گی تو نجات پا جاؤ گی ورنہ میں
دوں گا ابھی تمہاری گردن اڑا دیں گے''۔

حرہ: قرآن مجید حضرت آدمؑ کے بارے میں کہتا ہے: ''آدمؑ ممنوعہ درخت کے نزدیک

ہوئے خدا نے ان کے اعمال کو قبول نہ کیا" لیکن خود قرآن ہی علیؑ سے خطاب کر کے فرماتا ہے:
"تم اہل بیتؑ عصمت و طہارت کے اعمال مقبول بارگاہ رب العزت ہیں" جبکہ ایک اور جگہ پر آدمؑ سے مخاطب ہو کر خدا فرماتا ہے: "اس درخت کے نزدیک نہ جانا" مگر آدمؑ نے ترک اولیٰ کیا جبکہ اللہ نے علیؑ کے لئے دنیا کی ہر چیز کو حلال کر دیا اور وہ دنیا کے نزدیک ہوتے ہوئے بھی اس سے کنارہ کش رہے"۔

حضرت نوحؑ کے بارے میں خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: "ان کی بیوی کافرہ تھی" جبکہ علیؑ کی بیوی وہ ہے جس کی رضا مندی کو خدا نے اپنی رضا قرار دیا ہے"

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ہے کہ انہوں نے خداوند عالم سے عرض کیا: "خدایا! مجھے دکھلا کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟" تو خدا نے ان سے فرمایا: "کیا تم ایمان نہیں رکھتے ہو؟" عرض کیا: "ایما تو رکھتا ہوں مگر اطمینان قلب چاہتا ہوں اور اپنے یقین میں اضافہ کا خواہاں ہوں" جبکہ علیؑ فرماتے ہیں: "اگر غیب کے تمام پردے ہٹا دیئے جائیں پھر بھی میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا، کیونکہ میں یقین کی آخری حد تک پہنچ چکا ہوں"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی روایات موجود ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام عبادت خانے میں موجود تھیں، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وضع حمل کا وقت آیا تو انہیں ایک آواز سنائی دی کہ "اے مریم! یہ عبادت خانہ ہے زچہ خانہ نہیں ہے" اسی لئے حضرت مریم علیہا السلام عبادت خانہ سے نکل کر بیابان میں چلی گئیں اور وہیں پر حضرت عیسیٰؑ کو جنم دیا، لیکن جب حضرت علی علیہ السلام کے وضع حمل کا وقت آیا تو مادر علیؑ نے خانہ کعبہ کے پردے کو پکڑ کر خداوند عالم کو ہونے والے نومولود کے حق کی قسم دی تو دیوار کعبہ شق ہوئی اور وہ اندر چلی گئیں اور وہیں پر اس مولود مسعود کو جنم دیا۔

خونخوار اور ستمگر ظالم حجاج نے جب یہ باتیں سنیں تو وہ اس قدر مبہوت اور درماندہ ہو گیا کہ نہ صرف اس نے حرہ کو آزاد کر دیا بلکہ اسے انعام واکرام سے بھی نوازا۔ (ولایت وامامت شہید دستغیب)

حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو فرماتے سنا کہ "علیؑ کو برا بھلا مت کہو، کیونکہ میں نے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی جو خصوصیات دیکھی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک خصوصیت خاندان خطاب میں پائی جاتی میرے نزدیک ان تمام چیزوں سے بہتر وبالاتر تھی جن پر سورج کی روشنی پڑتی ہے"۔

حضرت عمرؓ ہی کہتے ہیں میں، ابوبکر اور ابوعبیدہ چند اصحاب پیغمبر کے ساتھ جا رہے تھے کہ حضرت ام سلمہ کے دروازے پر علیؑ کو کھڑے دیکھا، میں نے کہا کہ: "ہم رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں!" حضرت علیؑ نے کہا کہ: "ابھی آپؐ باہر تشریف لا رہے ہیں" تھوڑی دیر کے بعد آنحضرتؐ باہر تشریف لے آئے، آنجنابؐ نے علیؑ کے کندھوں کا سہارا لیا اور اپنا ایک ہاتھ ان کے کندھے پر مار کر فرمایا: "یا علیؑ! تم اپنے دشمن سے دست وگریبان ہو گے اور تم اولین مومن ہو جو مجھ پر ایمان لائے ہو، دنیا جہان کے حوادثات کو سب سے بہتر جانتے ہو اور خدائی عہد و پیمان کو پورا کرنے میں سب سے زیادہ وفادار ہو، بیت المال کی تقسیم میں سے سے زیادہ عادل ہو، رعیت کے ساتھ رحم وکرم اور مہربانی برتنے میں سب سے زیادہ مہربان وحاکم ہو، تم ہی سب سے زیادہ مصیبتیں اٹھاؤ گے اور سب سے زیادہ مشکلات میں مبتلا ہو گے، تم ہی مجھے غسل دو گے اور تم ہی مجھے دفن کرو گے، اور میرے بعد کسی بھی صورت میں کفر کی طرف میلان پیدا نہیں کرو گے، قیامت کے دن میرے علم کو اٹھائے ہوئے سب مومنوں کے آگے ہو گے اور دشمنوں کو حوض کوثر سے دور بھگاؤ گے"۔ (کنز العمال جلد ۶ ص ۳۹۳)

اس طرح ابولیلیٰ غفاری کہتے ہیں کہ: میں نے جناب رسول خداؐ سے سنا ہے کہ حضور نے فرمایا: "میرے بعد فتنے برپا ہوں گے لہٰذا تمہیں چاہئے کہ تم علیؑ کے دامانِ عافیت میں پناہ لینا کیونکہ وہی سب سے پہلے مجھ پر ایمان لائے اور بروز قیامت بھی سب سے پہلے میری ملاقات کریں گے، وہی میری امت کے "صدیق اکبر" اور "فاروق اعظم" (بہت بڑے سچے اور حق کو باطل سے جدا کرنے والے) ہیں، وہ مومنوں کے "یعسوب" (سردار) ہیں جبکہ مال منافقوں کا سردار ہے"۔ (الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ جلد ۷ ص ۱۶۷)

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں: "قرآن سات حرفوں میں نازل ہوا ہے، جن میں سے ہر ایک حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور حضرت علی علیہ السلام ان تمام کے ظاہر اور باطن کو جانتے ہیں"۔

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب "صحیح بخاری" میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "علی سب سے بڑا قاضی (فیصلے کرنے والا) ہے" حضرت انس بن مالک بھی کہتے ہیں کہ سرکار رسالتمآب نے فرمایا: "میرے صحابہ میں سب سے بڑا قاضی علیؑ ہے"۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۴)

ابن طفیل عامر بن وائل سے منقول ہے کہ میں نے ایک دن دیکھا کہ علی خطبہ دے رہے تھے، اسی دوران آپؑ نے ارشاد فرمایا: "تم جو چاہو مجھ سے پوچھو، کیونکہ خدا کی قسم قیامت تک رونما ہونے والے تمام واقعات و حوادث کے بارے میں مجھ سے پوچھو گے تو میں تمہیں بتاؤں گا، کتاب اللہ (قرآن مجید) کے بارے میں مجھ سے پوچھو، کیونکہ خدا کی قسم کوئی ایسی آیت نہیں جسے میں نہ جانتا ہوں کہ کب نازل ہوئی؟ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، جنگل میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر"۔ (کنز العمال جلد ۱ ص ۲۲۸)

''صدیق اکبر'' علی علیہ السلام

۱۔ معاذ عدویہ کا کہنا ہے کہ بصرہ کے منبر پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

''وأنا الصّدّيقُ الأكبر، آمنتُ قبل أن يؤمِنَ أبوبكر، و أسلمتُ قبلَ أن يُسلِم''(۱)

''میں ہی صدیق اکبر ہوں، ابوبکر کے ایمان لانے سے پہلے میں ایمان لایا اور اس کے اسلام قبول کرنے سے پہلے میں نے اسلام قبول کیا ہے''۔

۲۔ امیر المؤمنین علیہ السلام نے حارث ہمدانی سے فرمایا:

''ألا انّي عبدُالله، و أخو رسوله، و صدّيقه الأوّل، صدّقتُه و آدمُ بينَ الرُّوحِ و الجسد، ثمّ انّي صدّيقُه الأوّل في أُمّتِكم حقّاً........''(۲)

''آگاہ ہو جاؤ! میں خدا کا بندہ، اس کے رسول کا بھائی اور سب سے پہلے آپؐ کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ میں نے اس وقت آپؐ کی تصدیق کی جب آدمؑ کے بدن میں روح بھی نہیں پھونکی گئی تھی پھر تمہاری اس امت میں بھی میں ہی سب سے پہلے ان کی تصدیق کرنے والا ہوں''۔

۳۔ اہل عراق کو سرزنش کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

''ولقد بلغني أنّكم تقولونَ: عليٌّ يكذِبُ، قاتَلَكُم اللّهُ تعالىٰ افعَلىٰ مَن أكذب؟ أعلى اللّهِ؟ فأنا أوّلُ مَن آمنَ بهِ، ام علىٰ نبيّه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ فأنا أوّلُ مَن صدّقهُ''

''مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تم کہتے ہو کہ علی علیہ السلام کذب بیانی کرتے ہیں، خدا تمہیں ہلاک کرے (بتاؤ) میں کس پر جھوٹ باندھ سکتا ہوں، کیا اللہ پر؟ اس پر تو میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں، یا اس کے نبیؐ پر، تو میں سب سے پہلے ان کی تصدیق کرنے والا ہوں۔(۱)

۴۔ جنگ نہروان کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

''أتراني أكذِبُ علىٰ رسول اللّه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ او اللّه لأنا أوّلُ مَن صدّقه، فلا أكونُ أوّلَ مَن كذّبَ عليه......''(۲)

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں رسول اللہؐ پر جھوٹ باندھتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں وہ ہوں جس نے سب سے پہلے آپؐ کی تصدیق کی، تو اب آپؐ پر کذب تراشی میں کس طرح پہل کر سکتا ہوں''۔

۱۔ تاریخ مدینہ دمشق، ج۱، ص۶۲، ح۸۸؛ المعارف، ص۷۳؛ انساب الاشراف، ج۲، ص۱۴۶، ح۱۴۶؛ مناقب آل ابی طالب، ج۱، ص۲۸۹؛ شرح نہج البلاغہ، ج۱۳، ص۲۴۰؛ کنز العمال، ج۱۳، ص۱۶۴، ح۳۶۴۹۷؛ بحار الانوار، ج۳۸، ص۲۲۶؛ سمط النجوم، ج۲، ص۴۷۶، ح۸؛ الغدیر، ج۲، ص۳۱۴۔

۲۔ الامالی، مفید، مجلس اول، ح۳؛ الامالی، طوسی، ص۶۲۶، ح۵؛ کشف الغمۃ، ج۱، ص۳۱۲؛ بحار الانوار، ج۳۹، ص۲۴۰۔

نہج البلاغہ خطبہ ۷، نہج البلاغہ خطبہ ۳۷